مولانا قاری محمد طیب صاحب

بحیثیت شاعر و ادیب

تحقیقی مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی

از

محمد خلیل احمد ایم۔اے

زیر نگرانی

پروفیسر کے۔بشیر احمد ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی

سابق چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز

سابق صدر شعبہ اُردو، عربی، فارسی ایس وی یونیورسٹی، تروپتی آندھرا پردیش

2010ء

[illegible]

(۷۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب محترم قاری عبدالرحمٰن صاحب سہارنپوری کی پیٹ خوری کی داستان منظوم
بموقعۂ سفر کشمیر مورخہ ۲۱ جون ۱۹۷۳ء بمعیت عالی جناب حاجی محمد
انوار الاسلام صاحب رئیس سہارنپور زید مجدہ ....

یہ دودھ اور چائے یہ مکھن یہ توس و جام — کس کے ہیں شوق دید میں بے تاب و بے قرار
یہ پستہ گری یہ کیک یہ نانی کی ٹکیاں — قورمہ نہاں اور آم و آڑو جیسے خوش گوار
یہ خشکہ و دہی یہ ثمائر کی چاشنی — کس تمنا میں ہیں مجسم یہ انتظار ہے
یہ مرغ کے کباب یہ گشتابہ کے قباب — آلو کی قورمیوں کی جمی تہہ بہ تہہ قطار
کھانوں کے بے پناہ یہ اک لشکر عظیم — آخر یہ کس کے حق میں سراپا ہیں انتظار
آخر یہ کیوں ہیں پردہ میں ہی قاب با نقاب — کیوں طرف تا بہ طرف ہیں مگر ہیں بے قرار
پوچھا گیا کہ کیوں ہیں تمہاری یہ گرد ڈھیل — بولے کہ ایک طرف ہے کلاں کا ہی انتظار
ہم جیسے مل کے سارے کے سارے سما سکیں — ہو جائے ختم جس سے یہ رنگوں کا انتشار
وہ پیٹ اور ظرف کلاں رنگ ہی کا ہے — ثانی نہیں ہے جس کا نہ کوئی شریک کار
ناگہاں وہ عبد قاری جدید شکم بزرگ — کھانوں کو خوب کرتے ہیں تدبیر انتشار
حیلہ ہر فن کا کہ سر پیلی گرام کا — موصوف ایک تیر سے کرتے ہیں دو شکار
لیکن کلاں کی دال تو ٹھی ہی گلی ہو گی — کشمیر کی ہوا نے اسے دیدیا بگھار۔
ہونے لگیں غذائیں یہ جا جا کے پھر تو گم — اور لگا یہ پیٹ ہی کھانوں کا اک مزار
جو آگیا پیٹ میں وہ سب ہوا ہضم — ہل من مزید پھر بھی رہی پیٹ کی پکار
انجام یہ کہ جو بھی تھا آنکھ کا شریک بزم — منہ خشک۔ پیٹ خالی رہا با دل نزار
تھا وہ حاضر اور تھی غائب یہ جمع سب — تھی بزم خالی اور پھرا اک شکم کا غار
کھانوں کی بزم کی ہی یہ تھوڑی سی سرگزشت — اس داستاں کا حاصل یہ ہے خلاصہ باختصار
یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا — یاں خالی پیٹ رہ گئے دل زار و شرمسار۔
یہ ہی ہمارے قاری جدید کی داستاں — جن سے بصد ادب ہیں معافی کے خواستگار

(کل اشعار - ۱۹)

محمد طیب - مہتمم دارالعلوم دیوبند (سری نگر کشمیر)
۳۰ جون ۱۹۷۳ء

☆

اجمالی فہرست

صفحہ نمبر	عناوین	سلسلہ نشان
☆	پیش لفظ	۱
۱۔۷۷	باب اول: خاندانی حالات	۲
۷۸۔۱۲۲	باب دوم: تعلیم وتربیت	۳
۱۲۳۔۱۸۸	باب سوم: تدریس واہتمام	۴
۱۸۹۔۲۵۱	باب چہارم: تصنیف وتالیف	۵
۲۵۲۔۳۰۹	باب پنجم: شعروادب	۶
۳۱۰۔۳۱۴	کتابیات	۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۸۵۷ءعیسوی کے بعد جو حالات پیش آئے' وہ تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں' ان نامساعد حالات نے مسلمانانِ ہند کو مستقبل سے مایوس کر دیا تھا' ایسے ماحول میں علماء دیوبند نے جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے اجرائے مدارس کی تحریک شروع کی۔ مستقبل کا مؤرخ جب بھی جدید ہندوستان کی تاریخ مرتب کرے گا' وہ علمائے دیوبند کے اس اقدام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ کی سب سے بڑی کڑی دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔

اس عظیم الشان علمی ادارے نے نابغۂ روزگار شخصیات دنیا کو دیں۔ جن کے کارناموں سے دیوارِ زنداں تک روشن ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی ایسی نمایاں خدمات انجام دیں جن کی نظیر ماضی قریب میں مشکل ہے۔ ان ہی آفتاب و مہتاب میں سے ایک عظیم شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کی ہے۔

میں نے قاری صاحب کو دیکھا تو نہیں کہ وہ کیسے تھے' ان کے خدوخال کیسے تھے' ان کا انداز خطابت و گفتگو کیسا تھا' ان کا رہن سہن کس معیار کا تھا؟ لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا' تو میرے ارگرد کے ماحول میں حضرت قاری صاحب کے تذکرے تھے' خواص و عوام کی زبان پر آپ کے علم خصوصاً اندازِ خطابت کے تذکرے تھے۔ غیر محسوس طریقے پر میرے دل میں بھی آپ کی محبت سما گئی۔ آخر کار قدرت نے میری تعلیم و تربیت کیلئے سبیل الرشاد بنگلور سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کا انتخاب فرمایا جو تقریباً ساٹھ سال حضرت قاری صاحب ہی کے زیر انتظام و انصرام ترقیات کی منازل طے کر چکا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ماحول نے حضرت قاری صاحب کی محبت کو استحکام بخشا' آپ کی

☆

عقیدت ومحبت نے اس موضوع کے انتخاب پر مجبور کر دیا' آج بے انتہا خوشی ہے کہ عقیدت ومحبت نے جو دھندلے خدوخال حضرت قاری صاحب کے لئے میرے ذہن میں چھوڑے تھے' وہ میری تحقیقی خدوخال سے حددرجہ مشابہت رکھتے ہیں۔

''مولانا قاری محمد طیب صاحب بحیثیت شاعروادیب'' نامی اس تحقیقی مقالے کو ہم نے پانچ ابواب پر بالترتیب تقسیم کیا ہے۔ (۱) خاندانی حالات ۔(۲) تعلیم وتربیت ۔(۳) تدریس و اہتمام ۔(۴) تصنیف وتالیف ۔(۵) شعروادب ۔

قاری صاحب کے ادیب وشاعر ہونے اور اس میدان میں ان کے مقام کو سمجھنے کے لئے خاندانی حالات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے' چونکہ خاندانی ماحول کے تناظر میں شخصیت کے مزاج اور خارجی اثرات وداخلی کیفیات اور داعیات قلبی ان سب کا سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ اس لئے قاری صاحب کی علمی وادبی زندگی سمجھنے کے لئے ان کے خاندان کے علمی ماحول کو سمجھنا ہوگا۔

پہلے باب ''خاندانی حالات'' میں اس خاندان کے ممتاز افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مستند حوالہ جات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ یہ خاندان ہندوستان کہاں سے آیا اور نانوتہ میں قیام کی وجہ کیا رہی؟ ہم نے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے کہ اس خاندان کی علمی' سیاسی وسماجی حیثیت کیا رہی ہے؟

دوسرے باب ''تعلیم وتربیت'' میں ہم نے حضرت قاری صاحب کی تعلیم اور ان کے اساتذہ کے حالات درج کئے ہیں تاکہ معلوم کیا جائے کہ جن شخصیات سے قاری صاحب نے تعلیم حاصل کی ہے وہ کس سطح کے مدرسین اور فضلاء تھے تاکہ ان کی شخصیت کی روشنی میں قاری صاحب کی شخصیت کو دیکھا جاسکے۔

اس تفصیلی باب کے دوران ہم نے نانوتہ کے علمی' ادبی' سیاسی اور تہذیبی حیثیت کو بھی متعین کیا ہے نیز اس تفصیلی جائزہ سے ہم نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اساتذہ کی تربیت اور نانوتہ کے علمی ماحول نے آپ کے اندر ادبی ذوق کو جنم دیا۔

☆

تیسرے باب ''تدریس واہتمام'' میں قاری صاحب کی تدریسی زندگی اور اہتمام کے انتظام وانصرام کا تفصیلی جائزہ ہے۔اس جائزہ میں ہم نے شخصیت کو اس پہلو سے بھی سمجھا ہے کہ تدریس میں آپ کو سب سے زیادہ کس فن سے مناسبت تھی اور آپ کے ادبی کلام پر اس فن کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

چوتھے باب ''تصنیف وتالیف'' میں آپ کی نثر نگاری اور نثری تصانیف کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ہم نے اس طویل جائزہ کے دوران آپ کی ادبی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے' نیز آپ کی تصانیف کا پس منظر بھی پیش کیا ہے۔

اس مقالہ کا آخری اور اہم باب ''شعروادب'' ہے اس تفصیلی باب میں ہم نے قاری صاحب کے ادب پر مکمل بحث کی ہے اور دلائل کے طور پر آپ کے اشعار پیش کئے ہیں۔نیز اس وقت کے نامور ادباء کی آراء کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

ہم نے اس جائزہ کو دارالعلوم دیوبند کے ادبی خدمات سے شروع کیا ہے' بحث کے دوران ادبی خصوصیات کو شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہم نے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ آپ کی طبیعت کو کس صنف سخن سے دلچسپی رہی ہے۔شاعری میں اسلامی اور فلسفی نظریات کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔آخر میں منظوم تصانیف کا جائزہ شامل ہے۔

اس تحقیقی مقالے کی تیاری کیلئے ہم نے ہندوستان کے معتبر کتب خانوں کا سفر کیا اور ان سے استفادہ کیا جن میں دارالعلوم دیوبند کا تاریخی کتب خانہ' کاندھلہ ضلع مظفر نگر' یو پی میں مولانا نورالحسن راشد صاحب کا اپنا ذاتی کتب خانہ' حیدرآباد دکن میں کتب خانہ آصفیہ' لائق ذکر ہیں ان کے علاوہ دیوبند کے مدارس کے کتب خانے اور اکابر علماء کے ذاتی کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا۔اللہ تعالیٰ ان کتب خانوں کے نگراں حضرات کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے استفادہ

کا پورا پورا موقع دیا اور تعاون بھی فرمایا۔

اس طویل محنت کا سہرا صرف اور صرف میرے محسن اور کرم فرما پروفیسر جناب کے بشیر احمد صاحب سابق صدر شعبہ اردو کے سر جاتا ہے، جن کی رہنمائی قدم قدم شامل رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کی رہنمائی ونگرانی نہ ہوتی تو شاید 'پی' ایچ' ڈی کا یہ طویل مقالہ اختتام تک نہ پہنچتا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

پروفیسر موصوف کے علاوہ برادر عزیز ڈاکٹر محمد عارف اللہ صاحب کے لئے میرا دل احسان مندی کے احساسات سے معمور ہے، جنہوں نے چھوٹے ہونے کے باوجود ایک بڑے بھائی جیسے فرائض انجام دیئے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ سے لے کر آخری لمحات تک ان کی رہنمائی نصیب ہوئی اور ان ہی کی معرفت سے ڈاکٹر محمد امین اللہ صاحب کی رہنمائی بھی ملی جو ہمارے شعبہ کے ایسوسیٹ پروفیسر ہیں۔ قدم بقدم موصوف کی حوصلہ افزائی کو بھی میں بھلا نہیں سکتا۔ نیز میرے کرم فرما بہنوئی جناب ڈاکٹر مکرم صاحب پرنسپل ڈگری کالج کاولی اور برادر عزیز سیف اللہ ایم۔ ایس کمپیوٹرس کے لئے بھی دل دعا گو ہوں جنہوں نے پروفیسر بشیر احمد صاحب کی عنایات کو میری طرف متوجہ کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا نعم البدل عطا فرمائے۔ مزید دعا یہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس تحقیقی مقالہ کو اردو زبان وادب میں اضافہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

محمد خلیل احمد

باب اول

خاندانی حالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول خاندانی حالات

حضرت قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کا نسبی تعلق صدیقی شیوخ سے ہے یہ خاندان قصبہ نانوتہ میں آباد ہے، قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں واقع ہے، سہارنپور سے اسکی مسافت جانب جنوب ۱۵ کوس دہلی جانب شمال ۶۰ کوس گنگوہ سے جانب مشرق ۹ کوس اور دیوبند سے مغربی جانب ۱۲ کوس ہے. (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص/۱۰۲ ج/۱ ۔ از محبوب رضوی مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند) اس مردم خیز قصبہ نانوتہ کے جغرافیہ وقوع، آب و ہوا اور یہاں کی علمی' ادبی، تمدنی اور سماجی حالات پر باب دوم میں انشاء اللہ روشنی ڈالیں گے' اس باب میں ہمارے پیش نظر حضرت قاری طیب صاحبؒ کے خاندانی حالات کو سامنے لانا ہے' چونکہ خاندانی ماحول کے تناظر میں شخصیت کے مزاج اور خارجی اثرات و داخلی کیفیات اور داعیاتِ قلبی ان سب کا سمجھنا آسان ہوتا ہے اس لئے کہ خاندان کا سیرت کی تشکیل میں اہم کردار ہوتا ہے، حضرت قاری صاحب کی علمی اور ادبی زندگی کو سمجھنے کے لئے ان کے خاندان کے علمی ماحول کو سمجھنا ہوگا' اور اس خاندان میں جو علمی چھل پہل تھی اسکو سمجھنے کے لئے اس خاندان کے ممتاز افراد کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جارہا ہے، یہ خاندان بڑا بابرکت ثابت ہوا جسکا فیضانِ کرم ہندوستان بھر میں عام ہوا اسکا اندازہ شجرہ کے مطالعہ سے ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے۔

مولوی محمد ہاشم

شیخ عبدالسمیع

شیخ محمد مغنی

شیخ ابوالفتح

شیخ محمد عاقل | شیخ علاء الدین | حکیم عبداللہ

شیخ علی محمد | شیخ محمد بخش | حکیم غلام اشرف

خادم حسین | تفضّل حسین | شیخ غلام بخش

حبیب حسین | ابوالحسن امام محمد حسن | شیخ اسعد علی

حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی

حافظ احمد صاحب

قاری محمد طیب صاحب

حکیم ولی محمد | مولوی احمد علی | حافظ محمد حسن

حکیم امانت علی | مولانا مملوک العلی | حافظ لطف علی

عبدالسمیع | مولانا محمد یعقوب

صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

(مولانا محمد قاسم حیات اور کارنامے ص ۳۳/۔ از اسیر ادروی...... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ کا سلسلہ حضرت ابوبکر تک :-

حضرت قاری صاحب کا سلسلۂ نسب سیدنا ابوبکرؓ سے جا ملتا ہے چنانچہ جناب مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں

''یہ مولوی محمد ہاشم حضرت قاسم بن محمد ابن ابی بکر الصدیقؓ کے دُودمان عالی سے تعلق رکھتے ہیں۔''

(مولانا محمد قاسم حیات اور کارنامے ص ۳۳۔ از اسیر ادروی مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک قلمی یادداشت کا تذکرہ کیا ہے جو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے سے حاصل ہوئی تھی، اس قلمی نسخہ میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے دست مبارک سے دیگر چیزوں کے علاوہ اپنا نسب نامہ بھی درج فرمایا ہے، اس نسب نامہ میں اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد ہاشم صاحب سے اوپر کے اسماء اس ترتیب کے ساتھ ہیں۔

''محمد ہاشم بن شیخ شاہ محمد بن قاضی طہ بن شیخ مفتی مبارک ابن امان اللہ بن جلال الدین بن قاضی شیخ میران بڑے بن قاضی مظہر الدین بن نجم الدین بن نورالدین بن حسام قاضی شیخ میران بڑے بن قاضی مظہر الدین بن نجم الدین بن نورالدین بن حسام الدین بن ضیاء الدین بن نورالدین بن نجم الدین بن نور الدین بن رکن الدین بن رفیع الدین بن ضیاء الدین بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف بن شیخ جلیل بن صدرالدین بن شیخ رکن الدین سمرقندی بن صدرالدین حاجی بن اسماعیل شہید بن نورالدین قتال بن شیخ محمود بن بہاء الدین بن عبداللہ بن

زکریا بن شیخ نور ابن سراج الدین ابن شیخ سادھن
صدیقی ابن وجیہ الدین ابن مسعود ابن عبدالرزاق
بن قاسم بن محمد بن ابی بکر بن ابی قحافہ الخ"

(سوانح قاسمی حاشیہ ر ص ۱۴۹ ج ر ۱ از مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

نانوتہ کب آباد ہوا؟

نانوتہ کب آباد ہوا؟ اس سلسلہ میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی مولانا مناظر احسن گیلانی نے "لالہ نند کشور" کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ "نانو" نام کے کسی گوجر یا جاٹ کے نام پر یہ بستی آباد ہوئی تھی۔

(حاشیہ ایضاص ر ۵۲ ج ر ۱ از مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اس سلسلہ کی مزید تفصیل نیز نانوتہ کے عروج وزوال سے متعلق گفتگو "باب دوم" میں آئے گی نانوتہ میں مسلمان کس دور میں آئے اور یہاں مسلمانوں کے آنے اور آباد ہونے کا کیا سبب ہوا؟ اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے. یہاں مقیم خاندانوں میں سے دو خاندان بہت مشہور ہیں ایک سادات کا، دوسرا صدیقی شیوخ کا۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی ص ر ۵۶۔ از: نور الحسن راشد کاندھلوی......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

یہ خاندان صدیوں تک معرفت وارشاد میں ممتاز اور علم وتربیت میں نامور رہا۔ مغلوں کے ابتدائی عہد میں خاندان سادات کے اصحابِ اوجِ کمال پر پہنچے اور مغلوں کے دورِ واپسیں میں صدیقی گھرانہ پر بہار آئی۔

شیخ مظہر الدین کی ہندوستان آمد:۔

یہاں یہ بحث قابل توجہ ہے کہ،، صدیقی خاندان،، یعنی قاری محمد طیب صاحب کے خاندان کے کونسے بزرگ سب سے پہلے کب اور کہاں سے ہندوستان تشریف لائے؟ اس خاندان کی قدیم

تفصیلات تو دستیاب نہیں ہیں. لیکن کچھ تاریخی اشارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاندان ہندوستان آنے سے پہلے بھی دینی، علمی کمالات کی وجہ سے قابل احترام رہا ہے. اہل نانوتہ کی تصریحات کے مطابق اس خاندان کے پہلے بزگ جو ہندوستان تشریف لائے شیخ مظہر الدین تھے۔

(ایضاص ۶۴۔از: مولانا نورالحسن کاندھلوی......مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

شیخ مظہر الدین ''بہلول لودھی،، کے دور اقتدار میں ہندوستان تشریف لائے. انکا بیٹا سکندر لودھی شہزادگی کے زمانے سے ہی علماء اور صلحاء کا معتقد تھا. اس کے حالات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے: کہ

''وزمانہ دولت سکندر زمان صلاح وتقویٰ دیانت وامانت وحلم وقار بود، اور باعلماء وصلحاء وما بر واشرف میلے عظیم شد. للہذا از کناف عالم از عرب وعجم بعضے بسالیقہ استدعا وطلب، وبعضے بے آں در عہد دولتِ او تشریفِ اوردہ ووطن ابن اختیار کردند. چنانچہ اکثر بزرگان کہ دربن طبقہ مذکور می شوند ازاں قلیل اند۔

ترجمہ: سکندر لودھی کا عہد نیکی، تقویٰ، دیانت وامانت اور حلم وبرداشت کا زمانہ تھا. اس (سکندر) کو علماء صلحاء اور بڑے اور شریف لوگوں سے خاص لگاؤ اور مناسبت تھی اسی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں، عرب سے عجم سے بعض حضرات انکی درخواست اور بلاوے پر اور بعض اسکے بغیر انکے زمانے میں ہندوستان تشریف لائے اور یہاں قیام اختیار کیا. بہت سے وہ

حضرات جو اس طبقہ میں ذکر کیے جاتے ہیں اس
جماعت کا معمولی سا حصہ ہیں''

(اخبار الاخیار ص ۲۶۱/نقل از: استاذ الکل مملوک العلی ص ۶۴/۶۵)

جہاں آباد کے منصب قضاء پر:-

ادھر شیخ مظہر الدین نے علم وکمال میں بڑا رتبہ پایا تھا.اور اندازہ یہی ہے کہ انکی شہرت ہندوستان پہنچی تو سکندر لودھی نے ہندوستان آنے کی دعوت دی. چنانچہ تشریف لائے اور جہاں آباد کے قاضی مقرر ہوئے.مولانا نورالحسن کاندھلوی نے تحریر کیا ہے کہ:-

''کہا جاتا ہے کہ سکندر لودھی نے جب شیخ مظہر الدین کے علم وکمالات کی شہرت سنی تو انکو ہندوستان آنیکی دعوت دی. شیخ مظہر الدین تقریباً تہتر سال کی عمر میں ۸۷۸ھ/۷۴-۱۴۷۳ء میں ہندوستان آئے سکندر لودھی نے قاضی صاحب کی پذیرائی کی اور انکو جہاں آباد کا قاضی مقرر کردیا قاضی مظہر کی جہاں باد میں وفات ہوئی، وہیں دفن ہوئے،،۔

(استاذ الکل مملوک العلی/ص:۶۵از:نورالحسن راشد کاندھلوی......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

خاندان صدیقی کی نانوتہ آمد:-

یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ قصبہ نانوتہ میں اس خاندان کے سب سے پہلے کس بزرگ نے سکونت اختیار کی اور انہوں نے اس غیر معروف بستی کا کیوں انتخاب کیا؟ مولانا احسن گیلانی کی رائے یہ ہے کہ حضرت قاری طیب صاحب کے بزرگوں میں سب سے پہلے ،،مولوی ہاشم ،، نے

نانوتہ میں قیام کیا مولانا گیلانی رقم طراز ہیں: کہ

''اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سادات کے بعد
شرفاء اسلام کا پہلا خانوادہ جس نے نانوتہ میں
قیام پذیر ہو کر اسکو ایک اسلامی قصبہ کی حیثیت
عطا کی۔اس کی بنیاد غالباً عہد شاہجہانی میں انہی
مولانا مولوی محمد ہاشم مرحوم کے وجود باوجود
سے قائم ہوئی''

(سوانح قاسمی ص:۵۵ ج:۱۔از: مناظر احسن گیلانی..........مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

قاضی میراں بڑے کی نانوتہ آمد:-

لیکن مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی اس سلسلہ میں رائے یہ ہے کہ،، نانوتہ،، میں سب سے پہلے قاضی مظہرالدین کے صاحبزادے۔قاضی میراں عرف بڑے نے قیام کیا جو مولوی محمد ہاشم مرحوم سے تقریباً چھ واسطے اوپر کے بُزرگ ہیں۔انہوں نے اس علاقہ کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کی تفصیل مولانا کاندھلوی کے الفاظ میں سنئے کہ:

''اس دور میں نانوتہ اور اس کے اطراف میں جو
برادریاں یا قبیلے تھے وہ نہایت سرکش اور حکومتِ
وقت کے باغی تھے۔ باربار حکومت کے خلاف سر
اٹھاتے رہتے تھے۔ایسے قبیلوں کی قوت توڑنے
اورانکی سرکشی ختم کرنے کے لئے بادشاہ وقت نے
قاضی مظہرالدین کے صاحبزادے۔ قاضی
میراں عرف قاضی بڑے کو نانوتہ کا علاقہ سپرد کیا تھا
قاضی میراں بڑے نے۔ یہاں پہنچ کر علاقہ کا
انتظام درست کیا اور سرکشوں کا مقابلہ کر کے ان کو

بے حیثیت اور کمزور بنایا اور سرکار کا قبضہ اور اقتدار
بحال کیا۔ قاضی میراں بڑے کی ۱۴ر چودہ رجب
۹۰۲ھ (مارچ ۱۴۹۷ء) کو نانوتہ میں وفات ہوئی.
نانوتہ کے قبرستان شیخ زادگان میں (جو بھکا والا
کے نام سے مشہور ہے) قاضی صاحب کی
قبر ہے،،

(استاذ الکل مملوک العلی رص:۶۶ از: نورالحسن راشد کاندھلوی......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

قاضی میراں بڑے کی اولاد:-

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی میراں بڑے کے پانچ بیٹے تھے .نظام الدین عرف عباداللہ اور عبدالغنی . یہ دونوں تعلیم حاصل کرنے کیلئے مشرقی یو پی چلے گئے تھے، اور وہیں سکونت اختیار کی قاضی صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے کمال الدین تھے جو بنگال چلے گئے، باقی دولڑکے قاضی حبیب اللہ اور جمال الدین نانوتہ میں رہے، اور انکی اولاد یہیں آباد ہے۔

خاندان صدیقی کا خاتمہ:-

ہم نے تاریخی حوالوں کی روشنی میں اس بات کو واضح کردیا ہے کہ یہ خاندان لودھی خاندان کے دور حکومت میں ہندوستان آیا نیز قاضی میراں بڑے نے لودھی حکومت کے مخالفین کی سرکشی کو ختم کردیا تھا.اس لئے یہ خاندان لودھی حکومت کا ہم نوا تھا، لودھی حکومت کے خاتمہ کے بعد مخالفین نے قاضی میراں بڑے کی اولاد سے سخت بدلہ لیا اور اس خاندان کے چھوٹے بچوں تک کو قتل کردیا۔ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی کے حوالے سے عروج وزوال کی یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:-

’’بعد زوال حکومتِ لودھیان قاضی میراں بڑے

کی اولاد پر مصائب جانکاہ پیش آئے لیکن
انہوں نے اپنی علو ہمتی اور اپنی قدیمی دلیری
وجوانمردی کے باعث نہایت صبر واستقلال کے
ساتھ ان تمام مصائب کو برداشت کیا من جملہ ان
کے ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ انہیں قوم ہنود
''کاٹھا'' نے جو بوجہ قدیمی تعصب مذہبی کے مسلما
نوں سے عموماً اور متوسلان حکومتِ لودھیان سے
خصوصاً خصومتِ شدید رکھتے تھے، اولاد قاضی
میراں بڑے کے استحصال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ
رکھ چھوڑا یہاں تک کے صغیر سن بچوں تک کو قتل
کردیا، اپنے نزدیک انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا کہ
کوئی متنفس بھی کسی وقت میں مدمقابل ہو سکے.
لیکن قدرت خداوندی اس امر کی مقتضی تھی کہ اولاد
قاضی میراں بڑے کا سلسلہ مٹنے نہ پائے کیوں کہ
اس کو ان سے مولانا یعقوب مرحوم وغیرہم جیسی
صورتیں جلوہ ظہور میں لانی مقصود تھیں،،

(تمہید بیاض یعقوبی از: حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی۔ نقل از: استاذ الکل مملوک العلی۔ ص: ۶۷۔۶۸)

صدیوں کے بعد عروج:۔

مذکورہ تفصیلی اقتباس سے اس خاندان کے خلاف کی گئی انتقامی کارروائی سامنے آتی ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ اس خاندان کی حیثیت کئی صدیوں کے لئے کمزور پڑ گئی اور اورنگزیب عالم گیر کے زمانہ میں (رمضان ۱۰۶۸ھ کے بعد) بحالی ہوئی، یہ بھی ایک دلچسپ داستاں ہے اس کو بھی حکیم امیر کے الفاظ میں سنئے:۔

"پس ایک عرصۂ دراز بعد انقلابِ زمانہ نے دوسرا دور پلٹا یعنی شدہ شدہ دورِ حکومت شاہ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ خلل آشیاں کا آپہنچا۔ اس وقت میں ایک صاحب نے اولاد قاضی میراں بڑے سے جو نہایت زبردست خوش الحان حافظ قرآن تھے فریادی بن کر لشکر عالم گیر میں پہنچے اور ایک سردار لشکر کے یہاں رہ کر متلاشئ وقت رہے اور کسی فرد بشر پر انکشاف نہ فرمایا کہ میں کون ہوں اور کس واسطے سے آیا ہوں حتیٰ کہ ۱۰۶۸ھ کا مہینہ رجب ہو کر شعبان شروع ہو گیا، اس وقت بادشاہ نے سردارانِ لشکر کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا، چونکہ رمضان المبارک قریب ہے اور صعوبت سفر شبانہ روز بدستور قائم ہے آئندہ سامان قیام بظاہر معلوم نہیں ہوتا، ہم کو نماز تراویح میں کلام مجید کا سننا ضروری امر ہے اسلئے مناسب ہے کہ بہت جلد ایسا حافظ تلاش کیا جائے جو ما بدولت کو صرف ایک شب میں کلام مجید سنا دیوے، چنانچہ بغور استماع ارشاد شاہی تلاش شروع ہو گئی، باوجودیکہ اسوقت ہزارہا حافظ قرآن موجود تھے لیکن کسی کو ہمت و جرأت نا ہوئی کہ شاہ عالم گیر کا پیش امام ہو کر ایک شب میں پورا قرآن شریف سنا دیوے، یہاں تک کہ شعبان قریب ختم و رمضان شروع

ہونے پر ہوا، اس وقت دوبارہ تاکید شاہی شدید
ہوئی جس سے لشکر میں سخت اضطراب و بے چینی
پیدا ہوئی ہر شخص خائف تھا کہ بوجہ نہ ملنے ایسے
حافظ کے دیکھئے کیا عتاب شاہی نازل ہوتا ہے،
اس حالت سراسیمگی میں جب کہ تاریخ
۲۸ر شعبان ۱۰۶۸ھ کو نواح گوالیار چنبل کے
کنارے لشکر عالم گیر پڑا ہوا تھا تو ان حافظ
صاحب نے اپنے سردار سے عرض کی کہ آپ
اسقدر کیوں پریشان ہیں میں ایک شب کی تراویح
میں بادشاہ کو کلام مجید سنا دوں گا، آپ اطلاع کر
دیجئے کہ حافظ آگیا ہے۔ چنانچہ یکم تاریخ کو آپ
نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ پورا کلام مجید بلا
عائد ہونے متشابہ کے بادشاہ کو سنا دیا، بادشاہ
نہایت خوش ہوئے، اب وہ موقعہ جس کی حافظ صا
حب کو دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے تلاش تھی ہا
تھ آیا، شاہ عالم گیر سے گذشتہ واقعات راجپوتان و
گوجران کاٹھا کے ظلم وستم کا بیان کر کے داد خواہ
ہوئے۔ چنانچہ فی الفور بحکم شاہی ایک دستہ فوج
ہمراہ حافظ صاحب آیا اور ان سب کا قلع قمع
کیا گیا،،

(ایضاً ص:۶۸-۶۹......مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مولوی محمد ہاشم صاحب

حضرت قاری صاحب کے اجداد میں سے ایک بزرگ ہیں، ان کے سلسہ میں تفصیلات مفقود ہیں، البتہ اتنا تاریخ سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ عالم وفاضل تھے چنانچہ مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ:

"خود تو وہ عالم وفاضل تھے":

(سوانح قاسمی ،ص:۱۷، ج:۱۔ از: مناظر حسن گیلانی)

اور مفتی محمود احمد نانوتوی نے لکھا ہے کہ:

"شیخ محمد ہاشم علم ومعرفت کے ایک جلیل القدر شیخ ہوئے ہیں"

(نسب نامہ صدیقیان نانوتہ ،ص:۷ بنقل از: قاسم العلوم مولانا محمد قاسم ،ص:۳۰ا۔ از: نور الحسن راشد کاندھلوی ۔ مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مولانا یعقوب صاحب کی روایت سے علم ہوتا ہے کہ شیخ محمد ہاشم شاہ جہاں کے مقرب تھے. جس کے صلہ میں ان کو جاگیر عطا کی گئی تھی،

(حالات طیب ،ص:۲۵۔ از: مولانا یعقوب صاحب نانوتوی..........

مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند)

مولانا گیلانی نے شیخ ہاشم کو اس خاندان کا پہلا فرد بتایا ہے جو نانوتہ آکر آباد ہوا، لیکن اس خاندان کے حالات کے تحت ہم اسپر بحث کر چکے ہیں، کہ نانوتہ میں شیخ مظہر الدین کے صاحبزادے قاضی میراں بڑے سب سے پہلے آباد ہوئے!

شیخ اسد علی

شیخ اسد علی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے والد تھے، شیخ اسد علی باضابطہ عالم نہیں تھے، البتہ تاریخ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب کے ساتھ دہلی میں تعلیم حاصل کرنے گئے تھے، اور فارسی درسیات مکمل کرلی تھی اور مولانا یعقوب صاحب نے صراحت فرمائی ہے کہ

''شاہ نامہ فردوسی،، بھی پڑھا تھا،

(سوانح قاسمی رص:۲۴ج:۱۔از: مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی:

''موجودہ رواج کے مطابق جو حیثیت انگریزی
ادب گریجویٹ کی ہوتی ہے، گویا فارسی ادب کے
لحاظ سے شیخ اسد علی تعلیم کے اس معیار کی تکمیل کر
چکے تھے،،

(سوانح قاسمی رص:۲۱ج:۱۔از: مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اس تاریخی وضاحت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شیخ اسد علی اپنے دور کے ایک ،،گریجویٹ،، تعلیم یافتہ آدمی تھے، یہی وجہ ہے کہ قصبہ نانوتہ کے ہی ایک وکیل صاحب شیخ وجیہ الدین صاحب نے اپنی دامادی کے لئے قبول فرمایا!

(سوانح قاسمی رص:۲۳ج:۱۔از: مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

شیخ اسد علی نے اس اعلیٰ تعلیم کے باوجود اپنے لئے اپنے موروثی زراعت کو پسند کیا، اور تمام عمر کھیتی میں گزاردی۔ اپنی سادگی اور محدود وسائل کے باوجود شیخ اسد علی کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے تھے، مولانا یعقوب صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مگر نہایت ہی صاحب مروت واخلاق پرور
مہمان نواز نمازی پرہیزگار تھے''

(حالات طیب رص:۴ از: مولانا یعقوب نانوتوی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

شیخ اسد علی کی متعدد اولا دیں ہوئیں. مگر ان میں سے مولانا محمد قاسم صاحب اور دو بیٹیاں زندہ رہیں، شیخ اسد علی نے طویل عمر پائی اور مولانا محمد قاسم صاحب کے علوے شان اور علمی مراتب کا خود مشاہدہ کیا. اور مولانا کی وفات سے صرف پانچ سال پہلے ۷/ربیع ۱۲۹۲ھ (۳۱/ مارچ ۱۸۷۵ء) کو دیو بند میں اسہال کی مرض میں وفات پائی،

یہی تاریخ وفات صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے بعض مکتوبات میں اس کا تذکرہ کیا ہے. اور نامور مورخ پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنے سفر نامہ ہند میں شیخ اسد علی کی قبر کے کتبہ کی عبارت نقل کی ہے جو درج ذیل ہے:۔

''مزار اقدس''

حضرت شیخ اسد علی رحمتہ اللہ علیہ المتوفی ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء''

(سفر نامۂ ہند رص:۳۰۰ از: پروفیسر محمد اسلم (لاہور ۱۹۹۵ء)............

مطبوعہ دار الکتاب لاہور)

اس کتبہ پر سن وفات کندہ کرنے میں سہو ہوا ہے. صحیح تاریخ وہی ہے جو اوپر گزری شیخ اسد علی کی تدفین کہاں عمل میں آئی. مولانا نور الحسن راشد نے لکھا ہے کہ:۔

''تکیہ دیوان لطف اللہ میں دفن کئے گئے یہ وہ جگہ
ہے جو دار العلوم کی نئی مسجد جامع رشید کے صدر
دروازے کے سامنے واقع ہے. اس صحن کے مائل
بہ جنوب مشرقی گوشہ میں شیخ اسد علی کا مدفن ہے چند
سال پہلے تک اس قبر پر کتبہ نصب تھا. جس کو راقم
سطور نے بھی بارہا دیکھا ہے،،

(حاشیہ قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب رص: ۱۷۱ از نور الحسن کاندھلوی......

مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

شیخ اسد علی حج کر نہیں سکے تھے، مولانا محمد قاسم نے اپنے والد کی جانب سے حج بدل کیا ہے

(انوارقاسمی ص:۱۵۴۱ از: مولانا انوارالحسن شیرکوٹی.......................مطبوعہ مکتبہ قاسمی دیوبند)

یہ مولانا نانوتوی کا آخری سفر حج تھا جو ۱۲۹۴ھ۔ ۱۲۹۵ء میں ہوا۔

(تذکرہ مولانا قاسم ص:۲۶ از: مولانا یعقوب صاحب نانوتوی......

مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا مملوک علیؒ

مولانا مملوک علیؒ کی پیدائش :-

۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء کو نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی حضرت مولانا مملوک العلی کی تحریروں میں ہم کو مملوک علی اور مملوک العلی دونوں نام ملتے ہیں ان میں صحیح نام کونسا ہے؟ تو اس سلسلہ میں نورالحسن راشد صاحب کاندھلوی نے اپنی زیر طبع کتاب ,, استاذالکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی'' میں تفصیل سے لکھا ہے، اس کتاب کے مسودہ کا یہ حصہ ہم کو مفتی سعید الظفر رامپوری معین مدرس دار العلوم دیوبند کے واسطے سے حاصل ہوا. چنانچہ مولانا کاندھلوی رقم طراز ہیں:-

''مولانا مملوک العلی کا نام عام طور سے مملوکِ علی لکھا جاتا ہے، لیکن صحیح مملوک العلی (الف لام کے ساتھ) ہے، مولانا زمانۂ طالب علمی میں اپنا نام مملوک علی بھی لکھا کرتے تھے. اگر ابتدا میں یہی نام تھا تو اسکی وجہ شیعیت کے بڑھتے ہوئے وہ اثرات تھے جس سے مولانا مملوک العلی کا وطن نانوتہ اور خاندان بھی خاص متأثر ہوا تھا''

آگے لکھتے ہیں:-

''مگر بعد میں مولانا اور ان کے اہل خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے اور تحریک سید احمد شہید کا غلغلہ بلند ہوا تو اس غلطی کا احساس ہوا اس وقت اس غلطی کی اصلاح کرلی گئی تھی، آخر میں مولانا مملوک العلی اپنا نام صرف مملوک العلی ہی لکھتے تھے، مولانا کے

چند دستخط اور تحریر ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں ان
میں سے اکثر میں مولانا نے اپنے دستخط مملوک العلی
ہی کئے ہیں، اور یہ نسبت (جیسا کہ بعض اصحاب
کو غلط فہمی ہوئی) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نہیں
بلکہ حق جل مجدہ سے ہے، وھو العلی الکبیر"!

(تذکرۂ استاذ الکل مملوک العلی رص:۷۳از:نور الحسن راشد کاندھلوی......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے حلقۂ درس میں:-

مولانا مملوک العلی کی حیثیت اپنے زمانہ میں استاذ الکل کی تھی اس دور کی اکثر مشہور شخصیتوں کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، تذکرہ کی کتابوں میں آپ کا تذکرہ بڑی اہمیت اور عظمت کے ساتھ کیا گیا ہے، مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کا جو تذکرہ ہمارے پاس موجود ہے اس میں ان کی زندگی کے تشفی بخش حالات اور پھر تعلیم کے مراحل کا ذکر نہیں ملتا ہے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی اور متعدد اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے ارواح ثلاثہ میں ہے کہ

"مولانا مملوک علی نانوتوی جب تحصیل علم کے
لئے دہلی تشریف لے گئے تو یہ صورت پیش آئی کہ
جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتے وہ علوم سے
قلت مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد
دوسرا سبق نہ پڑھاتا تھا اس صورت سے مولانا
سخت ملول اور غمگین تھے ایک روز اسی پریشانی میں
حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی خدمت میں
حاضر ہو کر عرض کیا کہ تحصیل علم کے شوق میں وطن

چھوڑ کر آیا ہوں اور کیفیت یہ ہے کہ جس
استاذ سے پڑھنا شروع کرتا ہوں وہ ایک سبق کے
بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا۔ شاہ صاحب نے
فرمایا "اچھا کل آنا" مولانا اگلے دن حاضر ہوئے،
شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور
فرمایا! جاؤ! اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ انکار
نہیں کریگا. چنانچہ پھر ایسی مناسبت ہوئی اور ایسے
چلے کہ بڑے بڑے علماء انکے شاگرد ہوئے"

(ارواح ثلثہ بحوالہ روایت طیب حکایت نمبر ۸۵ نقل از: حاشیہ تاریخ دارالعلوم رص: ۹۸ ج ۱/
.... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ کے دیگر اساتذہ:-

مذکورہ حوالہ سے اتنا علم تو ہوتا ہے کہ مولانا مملوک علیؒ نے ایک آدھ سبق ہی سہی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء) سے بھی پڑھا ہے۔

اسکے علاوہ آپنے بیشتر علوم وفنون کی کتابیں اور حدیث بھی مولانا رشید خاں دہلوی (متوفی ۱۲۴۹ھ ۱۸۳۳ء) سے پڑھیں. جو شاہ عبدالعزیز' حضرت شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء) اور شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء) کے خصوصی شاگرد اور انکے تربیت یافتہ تھے. البتہ معقول کی بعض کتابیں آپنے مولوی قلندر بخشؒ سے پڑھی تھیں۔

(مولانا محمد قاسم حیات اور کارنامے رص: ۱۳۵ از: اسیر ادروی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

علم معقول ومنقول میں آپ کو تبحر کامل حاصل تھا، کتب درسیہ کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ بقول سرسید (متوفی ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء)

"علم معقول ومنقول میں استعداد کامل اور کتب
درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان تمام

کتب سے گنجینۂ علم خالی ہو جائے تو ان کے لوح
حافظہ سے پھر اس کی نقل ممکن ہے، ان سب کمال و
فضیلت پر خلق و حلم احاطۂ تحریر سے فزوں تر ہے"

(آثار الصنادید ص:۱۱۵ ج:۲ از: سر سید احمد.........مطبوعہ علی گڑھ)

آپ کے شاگردوں کا حلقہ:۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی علوم کے احیاء کے لئے دہلی میں عربک کالج قائم کیا تھا آپ اسکے صدر الاساتذہ تھے، مولوی کریم الدین لکھتے ہیں:۔

"نیا مدرسہ عربی (یعنی غازی الدین خاں جس کو
انگریزوں نے اپنے انتظام میں لے لیا تھا) ان کی
ذات سے مستحکم ہے، فارسی اور اردو اور عربی تینوں
زبان میں کمال رکھتے تھے ہر ایک علم وفن سے جو
ان زبانوں میں ہیں، مہارت تامہ ان کو حاصل
ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں، انگریزی
زبان سے ترجمہ ہوئی ہیں انکے اصل اصول سے
بہت جلد ان کا ذہن چسپا ہو جاتا ہے گویا اس فن کو
اول سے ہی جانتے ہیں، اور جس کام پر مامور ہیں
اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور
نہیں ہوا، مدرسہ میں ان کی ذات بابرکت سے اتنا
فیض ہوا کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاذ سے ایسا
ہوا ہو"

(طبقات الشعر ہند ص:۴۶۳ از: مولوی کریم الدین پانی پتی.........مطبوعہ علی گڑھ)

وہ شب و روز تعلیم و تدریس غیر معمولی لگن کے ساتھ اپنے کو وقف کئے رہتے اور طالبان علوم

ان سے استفادہ کے لئے پروانہ واران پرٹوٹتے رہتے ''نزھۃ الخواطر'' کے مصنف نے ان کی تدریسی خدمات کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"اخذعنه خلق كثير لا يحصون بحد وعد"

(نزہۃ الخواطر ص:۵۳۴ ج:۷ از: مولانا عبدالحئی لکھنؤ............ مطبوعہ مصر)

ان سے شرف تلمذ حاصل کرنیوالوں کا کوئی حد وشمار نہیں

اور مولوی کریم الدین پانی پتی (متوفی ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء مولانا کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''گھر اس کا محط الرجال طلباء مدرسہ اسکا مجمع علماء وفضلاء صدہا شاگرد اس ذات بابرکت سے فیض اٹھا کر اطراف واقطار ہندوستان میں فاضل ہوکر گئے، سوا درس دہی طلباء کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہرایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف وجوار سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اوران کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کو خاطر رنجیدہ کریں''

(تذکرۂ فرائد الدہر ص:۴۰۳ از: مولوی کریم الدین پانی پتی...... مطبوعہ علی گڑھ)

انگریز دشمنی:-

اگرچہ آپ انگریزی حکومت کے قائم کردہ کالج میں استاد تھے مگر انگریزوں نے مسلمانوں پر جو ظالمانہ سلوک کیا تھا اور اسلام کو مٹانے کے لئے عیسائیت کے فروغ میں جو جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا اس وجہ سے مولانا انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے ان کی یہ نفرت اتنی تھی کہ ان کو جسمانی

طور پر نجس تصور کرتے تھے، چنانچہ مولانا اسیر ادروی نے ''دہلی کی آخری شمع'' کے مصنف کے حوالہ سے یہ حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے:۔

''ایک بار انتہائی مجبوری کی حالت میں ایک انگریز
عہدیدار سے ہاتھ ملانے کی نوبت آئی تو اس ہاتھ
کو علیحدہ کیئے ہوئے تھے اور جب وہ افسر چلا گیا تو
اسکو صابن سے خوب دھویا تب انکو اطمینان ہوا''

(مولانا محمد قاسم حیات اور کارنامے رص:۳۵۔۳۶ راز: اسیر ادروی..................
مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند)

تالیفات اور ترجمے:۔

مولانا مملوک العلی کا اہم ترین علمی دینی کارنامہ ترمذی کے عربی متن کی تصحیح اور اسکا ترجمہ ہے مولوی عبد الحق اور مالک رام نے بھی اسکا تذکرہ کیا ہے۔

(ہندوستانی نشأۃ ثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار رص:۲۰۱ ر
از: شمس الہدی دریابادی، مطبوعہ دریاباد بستی)

اقلیدس کے چند مقالات کا ترجمہ بھی کیا، مالک رام نے اپنی کتاب،، قدیم دہلی کالج،، میں بارہ مقالوں کے ترجمہ کی نشاندہی کی ہے جو کہ مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوا، لیکن سن اشاعت درج نہیں ہے، لیکن مولوی کریم الدین نے ان مقالوں کی مقدار چھ بتائی ہے،، تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں اور بارہویں کا کیا ہے، حق یہ کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہادیا۔

(قدیم دلی کالج رص:۱۹۴ راز: مولوی کریم الدین.................. مطبوعہ علی گڑھ)

تاریخ یمینی کی تصحیح اور حاشیہ نیز (مسعودی کی مشہور کتاب روح الذھب کی تلخیص) کتاب المختار فی الاخباری والآثار یادگار ہیں۔

(حاشیہ قاسم العلوم مولانا محمد قاسم رص:۱۶۷: نور الحسن کاندھلوی..........
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مولانا کے شاگرد:-

اللہ تعالیٰ نے زوال علم وعرفاں کے دورآخر میں، جسمیں اسلامی شان وشوکت کا چراغ سرزمین ہند پرغل ہورہا تھا، مولانا کے ہاتھوں علم وعمل کے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب پیدا کیے جنھو نے ہندوستان کو اسپین بن جانے سے بچانے کے لئے بروقت اورمقال کوشش کیں. اسلامی اقدار و ثقافت کے بجھتے ہوئے چراغ کی لوپھر سے تیز کردی چنانچہ آپ کے شاگردوں میں مشاہراہل علم شامل ہیں، مولانا قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۵ھ ۱۸۸۵ء) مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء) مولانا یعقوب نانوتوی (متوفی ۱۳۵۲ھ ۱۸۸۴ء) مولوی کریم الدین پانی پتی مؤلف طبقات الشعرائے ہند (متوفی ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۹ء) سرسید احمد خاں (متوفی ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء) مولوی سمیع اللہ دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ ع) وغیرہ۔

گیارہ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۹ رستمبر ۱۸۵۱ء یرقان کے مرض میں مبتلا ہوکر انتقال فرمایا جیسا کہ خود مولانا یعقوب صاحب نے صراحت کی ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ کے قبرستان میں مسجد کے سامنے آسودۂ خواب ہیں۔

☆☆☆

مولانا یعقوب صاحب نانوتوی

آپ استادالکل حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے نانوتوی کے صاحب زادہ ہیں،
حضرت مولانا ۱۳/صفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۲/جولائی ۱۸۳۳ء سہ شنبہ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے
(حاشیہ مولانا محمد قاسم صاحب/ص ۱۶۷/از: نورالحسن کاندھلوی' مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)
منظور احمد، غلام حسین، شمس الضحی ان کے تاریخی نام ہیں
(بیاض یعقوبی/ص: ۱۵۱/از: حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی............ مطبوعہ تھانہ بھون)

حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کا سلسہ نسب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا نسب ایک ہی ہے، چنانچہ حضرت مولانا یعقوب نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ

> "میرا نسب اور مولانا کا، شیخ غلام شاہ کے پرداده میں ملتاہے. اس طرح محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ، بن محمد بخش، بن علاء الدین، بن محمد فتح، بن محمد مفتی، بن عبدالسمیع، بن مولوی محمد ہاشم، اور محمد یعقوب بن مملوک العلی، بن احمد علی، بن غلام اشر ف، بن عبداللہ، بن محمد فتح، بن محمد مفتی، بن عبدالسمیع، بن مولوی محمد ہاشم"

(سوانح قاسمی/ص: ۲۵: ج: ۲/از: مناظر احسن گیلانی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اپنے آبائی وطن نانوتہ میں ہی گیارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا محرم ۱۲۶۰ھ میں ان کے والد محترم تعلیم کے لئے اپنے ساتھ دہلی لے گئے. میزان منشعب اور گلستاں سے مولانا کی تعلیم شروع ہوئی. تمام علوم متداولہ اپنے والد ماجد سے حاصل کئے البتہ علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبد الغنی مجددی سے کی

(تاریخ دارالعلوم دیوبند/ص: ۱۷۲: ج: ۲/از: محبوب رضوی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا قاسم صاحب سے تلمذ:-

مولانا موصوف صاحب نے کچھ کتابیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے بھی پڑھی ہیں، مولانا یعقوب صاحب نے تین موقعوں پراس کا ذکر کیا ہے:

''ا۔ایک مولانا محمد قاسم نے دہلی پہنچ کر کافیہ شروع کی تھی اور مولانا محمد یعقوب صاحب میزان اور گلستاں وغیرہ پڑھتے تھے، مولانا مملوک العلی نے جو دونوں کے مربی اور استاذ تھے، مولانا محمد یعقوب سے ابواب اور تعلیلات سننا مولانا محمد قاسم کے سپرد کیا تھا۔ ۲۔ جب حضرت مولانا منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں ملازم تھے اس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب نے مولانا محمد قاسم سے صحیح مسلم پڑھی تھی۔ ۳۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب حضرت مولانا دیوبند اور نانوتہ میں فروکش تھے اس وقت مولانا محمد یعقوب نے حضرت مولانا سے بخاری شریف کا کچھ حصہ پڑھا تھا''

(حالات طیب از: مولانا یعقوب نانوتوی نقل از: قاسم العلوم مولانا محمد قاسم از: نورالحسن راشد ص: ۱۷۱............مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

دارالعلوم کی صدارتِ تدریس:-

ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء میں والد محترم حضرت مولانا مملوک العلی کے انتقال کے بعد ایک سال اور دہلی میں قیام فرمایا اس کے بعد اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں تقرر ہوگیا، اسی زمانہ میں آپ کو ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ پیش کیا گیا مگر آپ نے اسکو قبول نہیں کیا اس کے بعد آپ کو ڈپٹی انسپکٹر کی حیثیت

سے سہارنپور بھیجدیا گیا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آپنے سرکاری ملازمت سے استعفی دیدیا ، ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم قائم ہوا تو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور اس کی صدارت تدریس پر فائز کئے گئے، بحیثیت شیخ الحدیث پوری زندگی درس حدیث دیتے رہے۔

بیعت:-

مولانا نے حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے سلوک ومعرفت کے منازل طے کئے مزاج میں جلال اور ،،جذب،، کا غلبہ تھا اکثر جذب وکیف کی حالت طاری رہتی تھی، آپ کے رعب کا عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے، اپنے بزرگوں کی طرح مزاج میں بڑا استغنا تھا مکتوبات یعقوبی کے دیباچہ نگار حکیم احمد عشرتی نے آپ کی شخصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: کہ

"آپ کے صدہا شاگرد مرید اور شاگردوں کے شاگرد بلاد ہندوستان، کابل بخارا وغیرہ میں موجود ہیں، آپ جامع علوم معقول ومنقول ہیں، فاضل اجل عالم ہونے کے علاوہ سالک ومجذوب بھی تھے اور جیسے کہ آپ روحانی طبیب بھی تھے، اسی طرح امراض ظاہری کا بھی علاج کرتے تھے آپ نہایت خوش وضع، خوش خلق، خوش خو، خوش لہجہ وخوش گفتگو تھے، بڑے صاحب کمال ومکاشفات تھے، آپسے بہت پیشین گوئیاں صادر ہوئیں جن میں بعض کا صدور ہوچکا ہے جو باقی ہیں ان کا انتظار ہے"

(نقل از: تاریخ دارالعلوم دیوبند ص:۱۷۵: ج:۲راز: محبوب رضوی...... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا یعقوب صاحب نانوتوی مولانا قاسم نانوتوی صاحب نانوتویؒ کے ہم زلف تھے، چنانچہ بیاض یعقوبی میں رقمطراز ہیں: کہ

”حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب
دونوں کا شیخ کرامت حسین دیوبندی کی بیٹیوں
سے نکاح ہوا تھا مولانا محمد یعقوب کا شعبان
۱۲۶۶ھ میں شیخ کرامت حسین کی چھوٹی دختر عمدہ
النساء سے نکاح ہوا تھا جن سے مولانا کی متعدد
اولادیں معین الدین، قطب الدین، علاؤلدین،
جلال الدین، فاطمہ اور خدیجہ وغیرہ تولد ہوئیں“۔

(بیاض یعقوبی/ص:۱۵۱/از: حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی۔......مطبوعہ تھانہ بھون)

آپ نے دو حج کئے، پہلا حج ۱۲۷۷ھ ۱۲۶۰ء میں اور دوسرا حج ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں دونوں موقعوں پر حضرت مولانا محمد قاسم بھی مولانا کے ساتھ تھے، مولانا یعقوب صاحب نے حالات قاسم کے علاوہ بیاض یعقوب میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے،

(تاریخ دارالعلوم دیوبند/ص:۱۷۶: ج:۲/از: محبوب رضوی............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

علمی یادگار:۔

تصانیف میں تین رسالے مولانا کی یادگار ہیں ایک سوانح عمری اگرچہ بہت مختصر سوانح حیات ہے مگر زبان و بیان اور حالات وواقعات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

ان کا دوسرا مجموعہ مکتوبات یعقوب ہے جو ۲۴ خطوط پر مشتمل ہے یہ خطوط استفسارات کے جو ابات میں لکھے گئے ہیں، انمیں راہ سلوک کی دشواریوں کا حل مسائل شرعیہ کا ذکر اور طریقت وسلوک کا دستور العمل بیان کیا گیا ہے، تیسرا مجموعہ بیاض یعقوبی ہے یہ سفر حج کے حالات۔ کتب احادیث کی اسانید، منظومات اور عملیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ آخر میں طبی نسخے بھی درج ہیں حضرت تھانوی نے ”دونوں مجموعہ پر حسب ضرورت حواشی تحریر کئے ہیں،

آپ کے شاگرد:-

مولانا کی تربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کئے جو آسمان علم وفضل کے آفتاب ومہتاب بن کر چمکے ۱۹/سال کی مدت میں ۷۷/طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی جن میں شیخ الہند، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عزیز الرحمان دیوبندی مولانا خلیل احمد صاحب وغیرہ جیسے مشاہیر اور یگانہ عصر علماء شامل ہیں۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند/ص:۱۷۳: ج:۲/از: محبوب رضوی............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا شعروشاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور گم نام تخلص فرماتے تھے. وفات سے چند دن پہلے وطن مالوف تشریف لے گئے وہیں بمرض ہیضہ ۳/ربیع الاول ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء داعی اجل کو لبیک کہا اور سڑک کے کنارے باغ میں مدفون ہے۔

(مکتوبات یعقوبی/ص:۱۵۳: نقل از: تاریخ دارالعلوم دیوبند/ص:۱۷۷: ج:۲۔ محبوب رضوی' مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

☆☆☆

مولانا مظہر نانوتوی

حضرت قاری طیب صاحب کے خاندان کے ایک ممتاز عالم تھے، آپ حافظ شیخ لطف علی کے صاحبزادے اور مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی کے بڑے بھائی ہیں۔

(تذکرہ مولانا مظہر نانوتوی رص:۳ راز: نورالحسن راشد کاندھلوی..........
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

تعلیم وتربیت:۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں اطلاعات مفقود ہیں۔ اپنے والد سے قران شریف پڑھا اور اندازہ یہی ہے کہ ابتدائی تعلیم گھریا اطراف ہی میں حاصل کی۔ دہلی کالج کو قائم ہوئے دس یا گیارہ سال ہوئے تھے کہ آپ تقریباً بارہ سال کی عمر میں بغرض تعلیم دہلی گئے۔ آپ کا قیام کالج کے صدر مدرس حضرت مولانا مملوک العلی کے پاس ہوا، جو آپ کے خاندان کے اعلی فرد تھے۔ مولانا مظہر نانوتوی نے مولانا مملوک العلی سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں

(ایضا رص:۵ راز: نورالحسن راشد کاندھلوی..........مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مظہر نے مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی علم حاصل کیا۔

(مقدمہ اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک رص:۱۴۷: ج راز: شیخ الحدیث زکریا کاندھلوی)

آپ نے شاہ عبدالغنی سے علم حدیث حاصل کیا، اسی طرح بخاری شریف کی اجازت حضرت شاہ اسحاق سے ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی بذل المجہود کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "

"وقد روی حضرت مولانا مظهر صحيح
البخاری عن الشهير فی الافاق مولا
نامحمد اسحاق"

(تمہید بذل المجہود رص:۲ ج:ا رنقل از: تذکرہ مظہر نانوتوی رص:۷۔ مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مولانا مظہر نانوتوی پر جن حضرات نے بھی لکھا ہے ان سب کا کہنا کہ مولانا کو رشید الدین خان دہلوی سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ لیکن مولانا نور الحسن کاندھلوی نے اسکا انکار کیا ہے مزید تفصیل تذکرہ مولانا مظہر نانوتوی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم کا آپ کی طرف انتساب:۔

مولانا مظہر نانوتوی نے کئی ملازمتیں کی۔ انکے ساتھ ساتھ درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے لیکن جب رجب ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) میں حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپور نے سہارنپور میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی ابھی تین ماہ ہی گذرے تھے کہ مزید اساتذۂ کرام کی ضرورت پیش آئی، ارباب انتظام کی نظریں مولانا مظہر صاحب پر پڑیں لہذا آپ لکھنؤ کی بڑی تنخواہ والی ملازمت چھوڑ کر تیس روپے ماہانہ تنخواہ پر تشریف لے آئے اور اس مدرسہ کی ترقی کی فکر میں لگ گئے. ارباب انتظام نے آپ کی جلیل القدر خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں کی ذات کی طرف منسوب کر کے اسکا نام مظاہر علوم رکھدیا۔

وفات:۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند کے انتقال کے بعد آپ کو دار العلوم آنے کی دعوت دی گئی، لیکن آپ نے انکار فرمادیا، مولانا مظہر ۹۲-۱۲۹۱ء میں بیمار رہوئے اور ۲۴؍ذالحجہ ۱۳۰۲ھ (۳؍اکتوبر ۱۸۸۵) کو سہارنپو میں انتقال فرمایا سرسید نے آپ کی وفات پر لکھا تھا کہ:

> ''افسوس ہے کہ مولوی محمد مظہر صاحب نے جو عربی
> مدرسہ سہارنپور میں مدرس تھے، اور انکی ذات
> بابرکت سے اس مدرسہ کو عزت اور رونق تھی، بروز
> شنبہ تیسرے اکتوبر ۱۸۸۵ کو انتقال فرمایا. انا للہ
> وانا الیہ راجعون''

آگے لکھتے ہیں.

''زیادہ سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جو شخص
دنیا سے سفر کرتا ہے اس کا کوئی جانشیں نہیں ہوتا.
جناب مولوی محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے
انتقال کیا، مولوی محمد یعقوب نے انتقال کیا. در
حقیقت کوئی انکا جانشیں نہیں ہوا. اب مولوی محمد
مظہر نے انتقال کیا ہے. ہم کو تو کوئی انکا بھی کوئی
جانشیں دکھائی نہیں دیا''

(سر سید کی تعزیتی تحریریں رص۲۲: از: اصغر عباس............مطبوعہ علی گڑھ)

علمی کارنامے:-

مولانا مظہر نانوتوی کو زمانۂ طالب علمی سے ہی لکھنے پڑھنے کا خاص ذوق تھا. حضرت شاہ اسحاق اور حضرت مولانا مملوک العلی جیسے علماء کرام کی صحبتوں اور خاندان کے علمی ماحول نے اس ذوق کو مزاج بنا دیا، لیکن زمانہ کا ستم کہیں یا کچھ اور مولانا کی اکثر تحریریں مفقود ہیں سوائے چند علمی یادگاروں کے، جو مولانا کے علم و فضل کی آئینہ دار اور بلند نگاہی کی دلیل ہیں:-

حاشیہ مؤطا امام مالکؒ:-

مولانا کا پہلا تصنیفی کارنامہ جو ہم تک پہونچا ہے، وہ حاشیہ مؤطا امام مالک ہے. مولانا فراغت کے بعد ۱۸۴۳ء میں بنارس کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے. اسی زمانہ میں مولانا نے مؤطا امام مالک کے تصحیح متن اور حاشیہ لکھنے پر توجہ فرمائی اور تقریباً وسط ۱۲۶۶ھ (مئی جون ۱۸۵۰ء) میں اسکی اشاعت کے لئے فکر فرمائی اور سب سے پہلے مولانا احمد علی سہارنپوری کے مطبع، مطبع احمدی سے اسکی اشاعت ہوئی. اس نسخہ کے سرورق پر سنہ طباعت ان الفاظ میں درج ہے:-

"قد طبع باهتمام احقر الا نام ظفر علي، في

المطبع الاحمدی ۔ الواقع فی الدھلی

۱۲۶۶ھ"

(تذکرہ مولانا مظہر نانوتوی رص:۷۷۔۷۸راز: نورالحسن کاندھلوی.............

مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

قصیدہ ہمزیہ کی تصحیح:۔

مولانا کا دوسرا کام قصیدہ ہمزہ کی تصحیح اور اسکا حاشیہ ہے حضرت امام بوصیری (شرف الدین، ابوعبداللہ محمد ابن سعید الدلاصی البوصیری وفات ۶۹۴ھ ۱۲۹۶ء) کی متعدد تالیفات کے علاوہ ایک تالیف امام القریٰ فی مدح خیرالوریٰ ﷺ ہے جو قصیدہ ہمزیہ کے نام سے مشہور ہے یہ قصیدہ بھی اپنی لطافت ومعنویت فنی ادبی امتیازات اور بلاغت وادب کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ہر دور میں علماء نے اس کی شرح اور حواشی لکھی ہیں مولانا نے اس پر کیا کام کیا؟ مولانا نورالحسن راشد کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں کہ:۔

"حضرت مولانا محمد مظہر نے سب سے پہلے اس
قصیدے کے متن کی متعدد نسخوں کی مدد سے تصحیح کی،
حضرت مولانا کے پیش نظر قلمی نسخوں میں شیخ ابن حجر
مکی کی اس قصیدہ کی شرح المنح المکیہ فی شرح الہمزیۃ
نیز سیرت حلبیہ میں شامل متنوں میں جو اختلاف
تھے انکی نشاندہی کی اور تصحیح کی اپنے مرتب کئے ہوئے
متن کی صحت وترجمہ کی وجہ لکھی اور مکمل قصیدہ پر حا
شیہ چڑھایا، جو اس قصیدہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی
اور حل مشکلات کے لئے کافی ہے"

(تذکرہ مولانا مظہر نانوتوی رص:۸۳راز: نورالحسن کاندھلوی.............

مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

حضرت مولانا نے حواشی میں اشعار کے مطالب واضح کیے ہیں، مولانا کی یہ خدمت اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس مبارک قصیدہ کی دنیا بھر میں سب سے پہلی اشاعت ہے اس نسخہ کی پہلی اشاعت ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔

احیاء العلوم کی تصحیح اور حاشیہ:-

امام غزالی کی جلیل القدر تصنیف ،،احیاء العلوم،، کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے. مولانا مظہر صاحب نے اس عظیم الشان کتاب کی تصحیح و تحقیق کی اہم ذمہ داری مطبع منشی نول کشور کی ملازمت کے دوران نبھائی، مولانا نے آٹھ قلمی نسخوں اور مطبوعہ نسخوں کے ایک ایک لفظ کو پڑھکر اغلاط کی تصحیح کی، اور مختصر حاشیہ تحریر فرمایا، اس کتاب کا سن طباعت تم الخیر سے ۱۲۸۰ھ نکالا گیا ہے۔

مجمع البحار کی تصحیح و تعلیق:-

مجمع البحار رعلامہ محمد طاہر پٹنی کی تصحیح و تعلیق کا کام بھی مطبع منشی نول کشور کی ملازمت کے دوران انجام دیا. مولانا نے چھ قلمی نسخوں کی مدد سے اغلاط کو دور کیا ۱۲۸۳ھ میں سب سے پہلے اسکی طباعت ہوئی۔

(تذکرہ مولانا مظہر نانوتوی رص:۹۵ راز نورالحسن راشد کاندھلوی...... مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

☆☆☆

مولانا احسن نانوتوی

مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، آپ کی تاریخ ولادت مفقود ہے. اندازہ ہے کہ ۱۲۴۱ھ ۲۶-۱۸۲۵ء میں ولادت ہوئی. ابتدائی تعلیم کی اطلاعات دستیاب نہیں ہے، البتہ آپ ابتدائی تعلیم کے بعد قدیم دہلی کالج تشریف لے گئے. مولانا کے تذکرہ نگار ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے کہ متوسط سے اعلیٰ درجوں تک مولانا مملوک العلی سے پڑھا۔

(مولانا محمد احسن نانوتوی/ص:۲۲-۲۳/از:ایوب قادری............مطبوعہ لاہور)

آپ کو حدیث کی اجازت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے حاصل ہے. نیز حصن حصین کی اجازت مولانا سبحان بخش شکارپوری سے بھی ہے۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی/ص۴۸۲:از نورالحسن کاندھلوی......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

ملازمت:-

مولانا مظہر نانوتوی بنارس کالج میں عربی کے مدرس اول تھے. جب مظہر نانوتوی ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں حج کے لئے جانے لگے تو اپنے چھوٹے بھائی مولانا احسن صاحب کو عارضی طور سے اپنی جگہ رکھوادیا. لیکن مولانا مظہر وقت مقررہ تک واپس نہ آسکے تو ضابطہ کے مطابق مولانا احسن نانوتوی مستقل ملازم ہوگئے۔

(تذکرہ مظہر نانوتوی/ص:۱۱-۱۲-۱۳/از:نورالحسن کاندھلوی............
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

لیکن یہ ملازمت شوال. ذی قعدہ ۱۲۶۸ھ اگست ۱۸۵۶ء تک رہی اس کے بعد بریلی کالج میں آگئے یہ ملازمت آپ کے لئے بڑا اہم سنگ میل ثابت ہوئی، اورآپ کے علمی کاموں میں تیزی آگئی. آپ کے علمی جوہر کھلنے لگے. نورالحسن راشد لکھتے ہیں کہ:

"بریلی کا دور ملازمت مولانا کی خدمت ،

ترقیات، علمی تصنیفی کارناموں اور عملی جد و جہد کے شباب کا دور تھا"

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی رص:۴۸۳راز: نور الحسن راشد کاندھلوی......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

تصنیفی خدمات:-

مولانا محمد احسن نانوتوی زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا ذوق رکھتے تھے. چنانچہ دہلی میں پڑھتے وقت ہی نیچرل فلاسفی پر اردو میں ایک کتاب لکھی تھی.

دوسری کتاب تحفۃ المحصنین جسمیں ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح منع ہے. یا ان میں سے دو کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، یہ کتاب ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں لکھی تھی ان کے علاوہ۔ (۳) نافع خریدراں (۴) رسالہ عروض (۵) قواعد اردو حضرت نانوتوی کی مشہور کتاب (۶) تحذیر الناس بھی مولانا احسن کی ہی مرتب کی ہوئی ہے عربی میں مولانا کی تالیف (۷) مفید الطالبین بہت مشہور ہے. (۸) نفحۃ الیمن پر مفصل حاشیہ (۹) اور کنز الدقائق پر حاشیہ مولانا کی علمی تصنیفی یادگار ہیں۔

اردو ترجمے:-

مولانا نے تقریباً دس کتابوں کا عربی یا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا. ان میں امام غزالی کی احیاء العلوم کامل ہے. اس کا ترجمہ مذاق العارفین کے نام سے چار جلدوں میں چھپا، علامہ ابن قیم کی تبعید الشیطان بہ تقریب اغثۃ اللہفان ۔کا ترجمہ تہذیب الایمان کے نام سے شائع کیا۔

حصن حصین کا خیر متین کے نام سے سلیس اردو ترجمہ کیا. حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات عقد الجید فی الاجتہاد و التقلید اور الانصاف کے سلک مروارید اور کشاف کے نام سے عمدہ ترجمہ کئے حضرت مجدد الف ثانی کی تالیف اسرار الصلوۃ کا نکاتِ نماز کے نام سے ترجمہ کیا. انگریزی کی ایک کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا. جسکا نام حمایت الاسلام ہے۔

مولانا خرم علی بلہوری نے درمختار کا اردو ترجمہ کیا تھا. جو نا مکمل تھا. اور ناقص ہونے کی وجہ

سے اسکے چھپنے کی بھی امید نہیں تھی. مولانا محمد احسن کو اسکا پتہ چلا تو انہوں نے مولانا خرم علی کے وارثوں سے حق تصنیف ادا کر کے یہ ترجمہ خریدا. پھر اسکے نا تمام حصہ کو اسی نہج پر مکمل کیا مختصر حاشیہ لکھا اور اسکو غایت الاوطار ترجمہ اردو در مختار کے نام سے چار بڑی جلدوں میں شائع کر دیا۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی رص:۸۴۔۴۸۵/از: نور الحسن راشد کاندھلوی ....مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اس کے علاوہ مولانا نے چند کتابوں کی تصحیح بھی کی ہے. ان میں قاضی عیاض کی شہرۂ آفاق تصنیف شفاء کو مرتب کیا. اس کے متن کی تصحیح کی اور مختصر حاشیہ لکھا. کنز الدقائق پر بھی بہت مبسوط اور جامع حاشیہ لکھا۔

(مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے رص:۳۸/از: اسیر ادروی.......... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں میں سے حجۃ اللہ البالغہ . ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین تصحیح و تحقیق کے بعد شائع کیں، اس طرح آپ نے مطبع مجتبائی کی فرمائش پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے مجموعہ فتاویٰ کی قلمی نسخوں سے تصحیح کی، یہ نسخہ پہلی مر تبہ ۱۵۔۱۳۱۴ھ میں شائع ہوا.

مولانا کی علمی خدمات:-

ان سب کے علاوہ مولانا محمد احسن نے بریلی سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا تھا جس کا نام مولانا کے نام پر احسن الاخبار تھا. یہ اخبار ۲۲/ربیع الاول ۱۲۷۹ھ ۱۷/ستمبر ۱۸۶۲ء سے چھپنا شروع ہوا تھا۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی رص:۴۸۷۔۴۸۸/از: نور الحسن راشد کاندھلوی ....مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مولانا محمد احسن نانوتوی نے بریلی میں ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء میں مصباح التہذیب کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا بعد میں بعض وجوہات کی بناء پر اسکا نام بدل کر مصباح العلوم کر دیا جو آج تک

موجود ہے، نانوتہ واپس آکر احسن المدارس کے نام سے بھی آپ نے ایک مدرسہ قائم کیا. آپ کی وفات شعبان ۱۳۰۱ھ مئی ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔

(مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے رص:۳۸/از: اسیر ادروی............

مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

☆☆☆

حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحب

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب صدیقی خاندان کے سب سے نمایاں گل سرسبد اور فخر خاندان تھے۔آپ شیخ اسد علی صدیقی کے فرزند ہیں۔

تاریخ ولادت:-

آپ کی ولادت نانوتہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرس دارالعلوم کی ایک اطلاع کے مطابق شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ میں ہوئی۔

(سوانح قاسمی ج:۱ص:۲۴ مولانا مناظر احسن گیلانی.................مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا یعقوب صاحب نے یہ تاریخ حضرت نانوتوی کی سوانح عمری میں ذکر کی ہے، مگر اپنی بیاض، بیاض یعقوبی میں ص:۱۵۲(طبع اول تھانہ بھون ۱۹۲۹ء) میں شوال ۱۲۴۸ھ (مارچ ۱۸۳۳ء) درج فرمائی ہے۔اور یہی تاریخ صحیح ہے چونکہ بیاض یعقوبی کی اطلاع بعد کی ہے، ملاحظہ فرمایئے مولانا نورالحسن راشد صاحب کی رائے:

> ''مولانا یعقوب نے یہاں حضرت مولانا کی تا
> ریخ ولادت شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ (جنوری،
> فروری ۱۸۳۳ء) لکھی ہے مگر مولانا یعقوب کی
> بیاض میں حضرت مولانا کی ولادت شوال ۱۲۴۸ھ
> (۱۸۳۳ء) لکھی ہوئی ہے۔ بیاض یعقوبی
> ص۱۵۲(طبع اول تھانہ بھون ۱۹۲۹ھ) اگرچہ
> بیان کا یہ اندراج مولانا محمد یعقوب صاحب کے
> قلم سے نہیں ہے، بخط دیگر ہے مگر بیاض میں اس
> اندراج سے پہلے اور بعد کی اطلاعات خود مولانا
> کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اور ظاہر ہے یہ اطلاع

بھی مولانا کی ہدایت وصراحت بلکہ املا کے مطابق
لکھی گئی ہوگی اور اصولاً بعد کی تحقیق واطلاع زیادہ
معتبر اور صحیح ہونی چاہیئے، نیز مولانا کی بیاض کا یہ
اندراج مولانا یعقوب صاحب کی زندگی کے
آخری دنوں (تقریباً ۱۳۰۰ھ) کا ہے، اسلئے
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی تاریخ ولادت
کی یہی متاخر اطلاع زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے''

(قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی احول وآثار ص: ۱۷۰۔
از: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی.........مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

تاریخی نام:۔

اپنے زمانہ کی اتنی بڑی شخصیت جس نے ناموافق حالت کو نیا رخ دیا، افسوس ہے کہ اس کی ولادت کا ماہ محفوظ نہیں ہے۔ البتہ آپ کا سال ولادت ۱۲۴۸ھ محفوظ رہا، کیونکہ آپ کا تاریخی نام،، خورشید حسین'' رکھا گیا، اس نام کے حروف کی ابجد کے حساب سے ۱۲۴۸ھ میزان بنتی ہے۔ آپ نے بھی خود بعض تحریروں میں اس نام کا استعمال کیا ہے۔

(سوانح قاسمی ج:۱ص: ۱۴۷ مولانا مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

ابتدائی تعلیم:۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی کی اطلاع کے مطابق حضرت نانوتوی نے مروجہ طریقہ کے مطابق نانوتہ ہی کے ایک مکتب میں بسم اللہ کی ۔ یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ حضرت نانوتوی کے ہر تذکرہ نگار نے آپکے تمام اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن بسم اللہ کرانے والے بزرگ استاد کا نام کسی نے بھی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی باوجود تلاش وجستجو کے معلوم ہوسکا، مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

،،تعلیم کی ابتدا نانوتہ ہی کے قصبائی مکتب میں

ہوئی اس کا پتہ تو نہ چل سکا کہ نانوتہ کے اس مکتب
میں جس استاد کے آگے آپ کی تعلیم کی بسم اللہ
ہوئی، ان کا نام کیا تھا۔اور آپ کے استادوں میں
شاید یہی ایک استاد ہیں جن کے اسم مبارک کا پتہ
نہ چل سکا"۔

(سوانح قاسمی ج:ا ص:۱۶۲ مولانا مناظر احسن گیلانی ....مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

نانوتہ سے دیوبند کا سفر:-

آپ کی یہ تعلیم جاری تھی کہ ایک واقعہ کی وجہ سے نانوتہ چھوڑنا پڑا، وجہ یہ بنی کہ نانوتہ میں سنی حضرات کے ساتھ شیعہ مسلک کے لوگ بھی آباد تھے، چوں کہ مغل حکومت کے آخری حکمرانی کے دور میں شیعت نے بہت زیادہ پیر پھیلائے، اس کا اثر نانوتہ کے باشندوں پر بھی پڑا اور حضرت نانوتوی کے خاندان صدیقی کے ہی "شیخ تفضّل حسین نے شیعہ مسلک اختیار کرلیا یہ شیخ تفضّل حسین کون تھے؟ خاندان میں ان کی حیثیت کیا تھی؟ تمام ہی تذکرہ نگاران کی تفصیلات سے خاموش ہیں، البتہ مولانا یعقوب صاحب کی تحریر اور ہمارے شروع میں پیش کئے گئے خاندانی نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت نانوتوی کے خاندان کے فرد تھے اور جائداد میں شریک تھے۔

بہر حال ان کی تبدیلی مذہب کے بعد حضرت نانوتوی کے جد امجد شیخ غلام بخش کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی اور اس نے فساد کی شکل اختیار کر لی، انجام کار مولانا کے ماموں فصیح الدین کے ہاتھوں تفضّل حسین زخمی ہو کر مر گئے۔اس مقدمہ میں کسی کو سزا تو نہیں ہوئی، البتہ عداوت کی بنیاد پڑ گئی اور انتقامی کاروائی کا خوف رہنے لگا اسلئے حضرت نانوتوی کو دیوبند بھیج دیا گیا۔

(سوانح قاسمی ج:ا ص:۷۲-۱۷ مولانا مناظر احسن گیلانی ....
مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

حضرت نانوتوی نے نانوتہ کے مکتب میں کہاں تک تعلیم حاصل کی؟ اس کی معلومات بھی مفقود ہیں، البتہ آپ نے دیوبند آکر میزان وغیرہ شروع کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے

مکتب میں فارسی سے شد بد پیدا ہوگئی تھی، دیوبند میں آپ نے شیخ کرامت حسین (شیخ کرامت حسین دیوبند کے رؤسا میں سے تھے، ان کے مورث اعلی شیخ لطف اللہ سلطان اورنگ عالمگیر کے دیوان تھے، آپ کا شاہانہ محل اس وقت محلّہ دیوان کے نام سےمشہور تھا، دارالعلوم کی عمارت سے متصل تھا، حضرت نانوتوی کے خاندان کے نواسے تھے، یہی شیخ کرامت حسین بعد میں حضرت نانوتوی کے خسر ہوئے) کی حویلی میں قیام فرمایا اسی حویلی میں مولوی مہتاب علی صاحب (مولوی مہتاب علی صاحب. حضرت شیخ الہند کے بڑے ابا اور مولانا ذوالفقار علی صاحب. کے حقیقی بڑے بھائی تھے اور جب قیام دارالعلوم کی تحریک چلی تو اس تحریک میں یہ بھی پیش پیش تھے اور مشوروں میں شریک کیے جاتے تھے، دارالعلوم کی طرف سے مسلمانوں کے نام جو سب سے پہلی اپیل شائع کی گئی اس میں سات سرپرستانِ مدرسہ کا نام دیا گیا تھا، انہی میں ایک مولانا مہتاب علی صاحب کا بھی نام تھا) کا مکتب تھا مولانا نے وہی تعلیم شروع کی، اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند (شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی: دارالعلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں. ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، شیخ الہند نے ہندوستان سے برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ایک خفیہ تحریک ریشمی رومال کے نام سے چلائی، لیکن کچھ لوگوں کی غداری کی وجہ سے راز افشا ہوگیا اور آپ مقید ہوگئے، آپکو مالٹا میں نظر بند کیا گیا وہاں سے ۱۸؍جون ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ کو دہلی میں وفات پائی اور دیوبند میں دفن کیے گئے) کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب (مولانا ذوالفقار علی: خلف فتح علی عثمانی دیوبندی تقریبا ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں ولادت ہوئی متوسطات سے اعلی درجہ تک تعلیم علماء دہلی وغیرہ مولانا صدرالدین آزردہ اور مولانا مملوک العلی نانوتوی سے اور دہلی کالج میں حاصل کی، اور کمالات کے علاوہ شعروادب میں خصوصیت وامتیاز حاصل تھا، مغربی علوم اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ بریلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن آگئے تھے آخری عمر یہیں گذری) اور شیخ کرامت حسین کے صاحبزادے شیخ نہال احمد (شیخ نہال احمد:۔ شیخ کرامت حسین رئیس دیوبند کے صاحبزادے تھے، جتنے بڑے رئیس تھے ویسی ہی فیاض تھے۔ درالعلوم کے سات سرپرستوں میں ایک نام آپ کا بھی ہے۔ حضرت نانوتوی کے برادر نسبتی بعد میں ہوئے) بھی یہیں

پڑھتے تھے۔ اور مولانا یعقوب صاحب کی اطلاع کے مطابق مولوی نہال صاحب سے حضرت نانوتوی نے عربی شروع کی تھی۔

(مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے، ص ۴۶ مولانا اسیر ادروی ....

مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

دیوبند سے سہارنپور:۔

دیوبند میں آپ کی تعلیم میزان وغیرہ اور ضروری فارسی سے آگے نہ بڑھ سکی تھی کہ آپ کی والدہ نے آپ کو سہارن پور اپنے والد مولوی وجیہ الدین صاحب (جو پیشے سے وکیل تھے) کے پاس بھیج دیا، وہاں آپ نے مولوی نواز سہارنپوری سے ہدایۃ النحو کے علاوہ فارسی کی تکمیل کی۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی ص: ۴۵۲ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی)

تعلیمی سلسلہ رک گیا:۔

آپ کا قیام سہارنپور میں ایک سال رہا اسی سال اواخر ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں آپکے نانا صاحب کی وفات ہوگئی، اسوقت آپ کی عمر بارہ سال تھی نانا کے انتقال کے بعد آپ کا تعلیمی سلسلہ متاثر ہوا اور نانوتہ واپس تشریف لے آئے اور چونکہ اس وقت نانوتہ میں کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جہاں ہدایۃ النحو کے بعد تعلیم دیجاتی ہو، اسلئے پورا سال تعلیم سے بے تعلقی میں گذرا۔

(مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے ص: ۴۹ مولانا اسیر ادروی ....

مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

تعلیم کے لئے مولانا مملوک العلی کے ساتھ پہلا سفر:۔

مولانا مملوک العلی صاحب رجب ۱۲۵۹ھ (اگست ۱۸۴۳) میں حج کے لئے تشریف لے گئے اس سفر میں پورا ایک سال صرف ہوا، اور رجب ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہونچے۔

(قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی احول و آثار ص: ۱/۷۷..................

از: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اور جب آپکے دہلی کالج میں تعطیل کلاں ہوئی (جہاں آپ استاد تھے) تب آپ نانوتہ تشریف لائے اور آپ کی نظر انتخاب اس بچہ پر پڑی تو آپ نے فرمایا میں تمہیں اپنے ساتھ دہلی لے چلوں گا چنانچہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ (دسمبر، جنوری ۴۵۔۱۸۴۴ء) کو واپسی میں جب حضرت مولانا مملوک العلی نانوتہ سے دہلی واپس گئے تو مولانا بھی ساتھ تھے۔ ۲ محرم الرام ۱۲۶۱ھ (۲۹ جنوری ۱۸۴۵ء) کو دہلی پہنچے۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی ص: ۴۵۳۔ مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

دہلی کالج میں داخلہ:-

آپ نے دہلی پہونچ کر دو دن آرام کیا اور ۴ محرم الحرام کو دہلی کالج میں داخلہ لیا (دہلی کالج: یہ مدرسہ پہلے غازی الدین خاں کا مدرسہ کہا جاتا تھا۔ جو اجمیری گیٹ کے باہر واقع تھا، اس کا سارا خرچ نواب غازی الدین پورا کرتے تھے۔ انگریزوں نے اقتدار کے بعد اس کو مدرسہ دہلی کا نام دیکر اپنی تحویل میں لے لیا، اس کے پہلے پرنسپل مسٹر جے، ایچ ٹیلر بنائے گئے۔ ۱۸۲۸ میں دہلی کالج میں انگریزی کلاس کھولی گئی اور جدید علوم کو شامل کیا گیا) اور کافیہ سے تعلیم کا آغاز کیا، مولانا مملوک العلی صاحب کی پوری زندگی تعلیم وتدریس میں گذری تھی وہ اپنے عہد کے انتہائی تجربہ کار اور طلبہ کے مزاج شناس استاذ تھے، ذہین سے ذہین طلبہ ان کے حلقۂ درس میں آتے رہے اور جوہر قابل بن کر جاتے رہے، جب آپ نے حضرت نانوتوی کی کافیہ شروع کرائی تو چند دنوں میں ہی ان کی صلاحیت واستعداد کا آپ کو پتہ چل گیا اور حضرت نانوتوی کا بھی یہ حال تھا کہ بقول نور الحسن راشد:

> ''معقولات کی اعلیٰ درجہ کی منتہیانہ کتابیں زواہد
> ثلاثہ، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ اسطرح پڑھتے تھے
> جیسے حافظ قرآن کی منزل سناتا ہے ترجمہ بھی نہیں
> کرتے تھے،،۔

(استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی ص ر۴۵۳ نور الحسن راشد کاندھلوی مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

آپ کے اس تیز رفتاری پر بعض طلبہ نے اعتراض بھی کیا کہ یہ سمجھ کر نہیں پڑھتے ہیں تو مولانا مملوک العلی صاحب نے فرمایا کہ:

''میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل
سکتا''۔

(سوانح قاسمی ج ا رص:۲۸ مناظر احسن گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

ذہانت وذکاوت:۔

مولانا نانوتوی کو اللہ تعالیٰ نے بلا کی ذہانت عطا فرمائی تھی، زمانۂ طالب علمی میں اقلیدس کے مشکل اور پیچیدہ مسائل اور مباحث کو آسانی سے حل فرمادیتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ مشق اور مطالعہ میں گذرا ہے۔ بحث کسی بھی فن کی ہو آپ ہمیشہ ممتاز طلبہ پر غالب ہی رہتے تھے، نوعمری ہی سے آپ تک بندی بھی کرنے لگے تھے یہ علمی سلسلہ جس قدر آگے بڑھتا رہا ذہنی صلاحیتوں میں جلا آتی گئی۔

تعلیم کے علاوہ دیگر میدانوں میں بھی حضرت نانوتوی کا کوئی مقابل نہ تھا، کوئی بھی کھیل خواہ ذہانت کا ہو یا شجاعت کا، بڑے اچھے اچھے مولانا کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے تھے۔ مولانا یعقوب صاحب ''سوانح عمری'' میں تحریر فرماتے ہیں: کہ

''خوب یاد رہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل ''جوڑ
توڑ'' کے نام سے ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے
مشاق لوگ اسکو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے
والے مات کھا جاتے تھے مولوی صاحب نے جب
اس کا قاعدہ معلوم کرلیا، پھر یاد نہیں کسی سے مات
کھائی ہو، بہت ہوا تو برابر رہے، بلکہ ہر کھیل
میں جو رتبۂ کمال ہوتا تھا وہاں تک اس کو پہونچا کر
چھوڑتے تھے۔ دروازہ مکان کا ایک دراز کوچہ تھا
اور وحشت ناک جگہ تھی اور وہاں آسیب بھی مشہور تھا
مگر راتوں کو بہت بہت دیر سے گھر جاتے اور بے

تکلف اور کچھ خوف نہ کرتے''۔

(سوانح عمری از مولانا یعقوب نانوتوی مشمولہ سوانح قاسمی ج!ا رص:۲۷۔مناظر گیلانی

..................مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

بحث ومباحثہ:-

طالب علم جب ذہین اور محنتی ہوتو خاموشی سے گھبراتا ہے،اسکا دلچسپ مشغلہ بحث ومباحثہ ہی ہوتا ہے،مولانا نانوتوی کے مباحثہ کا حال مولانا یعقوب صاحب کی زبانی۔

''اس زمانہ میں ہمارے مکان سے قریب مولوی نوازش (مولانا نوازش علی: دہلی کے ایک بڑے عالم اور مدرس تھے۔علماء دہلی سے تعلیم حاصل کی، حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حدیث پڑھی اور پوری زندگی درس، تعلیم اور واعظ میں گذاری۔ مولانا کی درس گاہ مدرسہ مولوی نوازش علی دہلی کے علمی حلقوں میں مشہور تھا، مولانا مملوک العلی کا گھر اس کے قریب ہی تھا. اس مدرسہ میں طلبہ بھرے رہتے تھے۔ سرسید احمد اور مولانا الطاف حسین حالی نے مولانا نوازش علی سے تعلیم حاصل کی)علی صاحب کی مسجد میں مجمع طالب علموں کا تھا ان سے پوچھ اور بحث شروع ہوئی ، مولوی صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے ، اور جب گفتگو ہوئی اسمیں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا، بلکہ ہم میں سے جو مغلوب معلوم ہوتا، مولوی صاحب سے مدد چاہتا، مولوی صاحب خود اس کو

مدد دیتے"۔

(سوانح عمری از مولانا یعقوب صاحب مشمولہ قاسم العلوم مولانا قاسم صاحب، ص ۱۷۹؍
از: نور الحسن راشد ۔ مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

فنون کی تکمیل:۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت نانوتوی نے دہلی میں "کافیہ" نامی عربی کی ابتدائی کتاب سے تعلیم شروع کی ہے۔ دہلی کالج میں مولانا نے حدیث کے علاوہ کس استاذ سے کون سی کتاب پڑھی اس کی واضح تفصیلات مفقود ہیں، سوانح قاسمی کے مصنف حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی رائے یہ ہے کہ کافیہ سے لیکر جملہ علوم وفنون کی کتابیں صرف مولانا مملوک العلی صاحب سے پڑھی ہیں، آپ کے علاوہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا ہے، لیکن "تذکرۃ الرشید" کے مصنف نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے جس سے سراغ ملتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے علاوہ مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی بعض کتابیں پڑھی ہیں۔ لکھتے ہیں: کہ

> "حضرت گنگوہی فراغت کے کئی سال بعد اپنے اساتذہ سے ملاقات کے لئے دہلی تشریف لے گئے ، اسی سلسلہ میں حضرت مفتی صدر الدین صاحب صدالصدور کی خدمت میں بھی حاضری دی کیونکہ آپ نے ان سے بھی بعض کتابیں پڑھی تھیں اور وہ آپ کے اساتذہ میں تھے ، دوران ملاقات مفتی صاحب نے حضرت گنگوہی سے دریافت فرمایا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے بتایا کہ مطبع میں تصحیح کا کام کرتے ہیں، دس بارہ روپۓ تنخواہ ہے تو مفتی صاحب نے ران پر ہاتھ مار کر فرمایا قاسم اتنا سستا؟ اتنا سستا"۔

(سوانح عمری از مولانا یعقوب صاحب مشمولہ قاسم العلوم مولانا قاسم صاحب، ص ۱۷۹؍
نور الحسن راشد .... مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مفتی صدالدین آرزہ سے تلمذ:۔

مذکورہ واقعہ میں مفتی صاحب نے جس انداز کے ساتھ اظہار افسوس کیا ہے، اس کی بنیاد پر بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حضرت نانوتوی نے یقیناً مفتی صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ جس سال حضرت نانوتوی نے دہلی پہونچکر کافیہ شروع کی، اس سال حضرت گنگوہی ہدایۃ النحو کے طالب علم تھے، لیکن آپنے کچھ دنوں قاضی احمد الدین جہمنی سے پڑھا اور چند دنوں میں نحو وصرف کی اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ حضرت نانوتوی کے ہم سبق ہوسکیں۔

اس کے بعد دونوں ''یکجان دو قالب'' بن گئے تھے۔ اور آخر تک یہ تعلق باقی رہا اور چونکہ حضرت گنگوہی کا تلمذ مفتی صدرالدین سے ثابت ہے، تو اس تعلق کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت گنگوہی کے ساتھ حضرت نانوتوی نے بھی مفتی صاحب سے کچھ کتابیں پڑھی ہوں گی، ہمارے اس خیال کی تائید مولانا سید محمد میاں صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔

لکھتے ہیں:۔

> ''حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی اور امام ربانی حضرت گنگوہی کے دوسرے استاذ مولانا صدر الدین صاحب تھے جو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے مشہور ومعروف تلمیذ اور اس خاندان کے خاص عقیدت مندوں میں تھے''۔

(علماء ہند کا شاندار ماضی۔ ج/۵ص/۶۲ مولانا سید محمد میاں صاحب)

اس طرح ڈاکٹر ثریا ڈار نے بھی وقائع عبدالقادر خانی کے حوالے سے حضرت نانوتوی کو مفتی صدرالدین صاحب کا شاگرد لکھا ہے۔،،

(وقائع عبدالقادر خانی علم وعمل۔ج:اص:۲۷۵ بحوالہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات ۱۹۲۔ ڈاکٹر ثریا ڈار............مطبوعہ مکتبۃ العزیز دیوبند)

حدیث کی تکمیل پر ایک نظر:۔

تذکرہ نگاروں کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نونا توی نے صرف دو ہی اساتذہ سے حدیث شریف کی تکمیل کی۔

سوانح قاسمی کے مصنف مناظر احسن گیلانی صاحب کی رائے یہ ہے کہ مولانا نوتوی شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی (شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی: مہاجر مکی ابن سعید مجددی، مجدد الف ثانی سرہندی کا خاندان سے ہیں.ان کے دادا سفی القدر اپنے جد امجد مجدد الف ثانی کے سرہند سے جو ریاست پٹیالہ میں واقع ہے، ہجرت کر کے رام پور آ گئے تھے .یہی شاہ عبدالغنی ۲۵ ر شعبان ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے علم ظاہر اور باطن کی تعلیم کا آغاز رام پور سے ہوا، اور دہلی میں اس کی تکمیل ہوئی۔ ۶ر محرم ۱۲۹۵ھ (جنوری ۱۸۷۸ء) میں مکہ میں انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں دفن کئے گئے) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحاح ستہ میں بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابن ماجہ، اور نسائی، پڑھی البتہ ابوداؤد مولانا احمد علی (مولانا احمد محدث سہارنپوری اپنے دور کے ممتاز محدث تھے، آپ نے تعلیم تاخیر سے حاصل کرنی شروع کی تھی جب آپ حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تھے آپ کی عمر ۱۸ر سال ہو چکی تھی اس کے بعد آپ نے عربی شروع کی سہارنپور میں مولانا سعادت علی بانی مدرسہ مظاہر العلوم سے عربی تعلیم کا آغاز کیا اور پھر دہلی چلے گئے اور وہاں مملوک العلی نانوتوی، مولانا ولی الدین سہارن پوری وغیرہ سے عربی کی تکمیل کی۔ حدیث آپ نے محدث ہند حضرت شاہ اسحاق دہلوی مہاجر مکی سے اسوقت پڑھی جب آپ بنیت ہجرت مکہ میں قیام کر چکے تھے۔ مولانا موصوف کا اسلامی ہند پر احسان ہے کہ انہوں نے حدیث کی کتابوں کی تصحیح اور تحشیہ کے بعد طباعت اور اشاعت فرمائی اور گھر گھر پہونچائی سہارنپور میں ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں وفات پائی) محدث سہارنپوری سے پڑھی۔

(سوانح قاسمی ج ۱ص: ۲۵۳ مولانا مناظر احسن گیلانی............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اس کی مزید وضاحت حضرت نانوتوی کے شاگرد مولانا منصور علی خاں مرادآبادی ثم حیدر آبادی کی ایک تحریر سے ہوتی ہے، لکھتے ہیں کہ:

''مولانا مرحوم (مولانا قاسم) کے استاذ حدیث

تھے سوائے ابو داؤد کے صحیحین (بخاری و مسلم)
و سنن ثلاثہ (ترمذی نسائی ابن ماجہ) ان ہی سے
پڑھے تھے"۔

(مذہب منصور ص:۱۸۱ مولانا منصور علی خاں مراد آبادی ثم حیدر آبادی ...... مطبوعہ حیدر آباد)

لیکن نورالحسن راشد صاحب کی رائے اس کے خلاف ہے اس کو انہی کے الفاظ میں دیکھے:۔

"مولانا نے صحیح و مسلم اور جامع ترمذی کا اکثر حصہ
شاہ عبدالغنی کی مجلس درس میں پڑھا اور دونوں کا
کسی قدر حصہ دوسروں کی قرأت سے سنا صحیح
بخاری کے آخری ایک تہائی حصہ کی قرأت
وسماعت میں شریک رہے، مؤطا امام مالک کا کچھ
حصہ مولانا مظہر نانوتوی کی قرأت میں سنا اور
تفسیر جلالین پڑھی"۔

(تذکرہ مملوک علی ص:۴۵۶ نورالحسن راشد .... مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

شاہ عبدالغنی کی دی ہوئی سند:۔

مذکورہ خیال درست ہے کیونکہ شاہ صاحب نے حضرت نانوتوی کو جو سند عطا کی تھی یہ اسی کا ترجمہ ہے، اس سند کو مولانا محمد یعقوب صاحب نے بیاض یعقوبی میں ص ۱۶۳ (طبع اول تھانہ بھون ۱۳۲۹ھ) میں نقل کیا ہے، اور اسی کا عکس سوانح قاسمی جلد اول ص ۲۶۰ (طبع اول دیو بند میں بھی چھپا ہے) ہم اس سند کا صرف اتنا ہی حصہ نقل کرتے ہیں جو ہمارے خیال سے تعلق رکھتا ہے:

"اما بعد: فاقول و بعون اللہ اصول و
احول و انا اضعف عباد اللہ قوی عبد الغنی بن
ابی سعید المجددی الدھلوی، ان الاخ
الصالح الکاظم محمد قاسم اصلح اللہ شانہ

واکمل ایمانه ، قد قرا علی الصحیح لا بی
الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیسابو
ری وجامع ابی عیسی الترمذی الا القلیل من
کتابین ، فانه بسماع غیره۔ والثلث الآخرمن
صحیح البخاری بالقراۃ و السماع وموطا
مالک بن انس سمع بعضه بقراء ۃ ابن اخی
المولوی مظھر وتفسیر جلالین قرأعلی"۔

منصورعلی خاں کی شہادت:۔

یہ تو تفصیل تھی شاہ صاحب سے حدیث کی تکمیل کی ، باقی رہے حدیث کے دوسرے استاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ،تو مناظر احسن گیلانی کی رائے ہے کہ ان سے صرف ابوداؤد انہی کے مطبع میں ملازمت کے دوران پڑھی،حضرت نانوتوی کے شاگرد منصورعلی خاں کی بھی یہی رائے ہے وہ لکھتے ہیں:

''اور ابوداؤد جو باقی تھی،اسکو اپنی شہرت کے زمانہ میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کی خدمت میں جا کر پڑھ لیا''۔

(مذہب منصور ص:۱۸۲ مولانا منصورعلی مرادآبادی ثم حیدرآبادی ...... مطبوعہ حیدرآباد۔)

لیکن حضرت نانوتوی کے دیگر شاگردوں کے اسناد ہمارے سامنے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی محدث سہارنپوری سے ابوداؤد کے اکثر حصہ کے علاوہ نسائی مکمل، کسی قدر ابن ماجہ اور مئوطا امام مالک بھی پڑھی۔اول الذکرتین کتابوں کا ذکر اسناد کے علاوہ بقول نورالحسن صاحب مولانا نانوتوی کی تحریرات ومکتوبات میں مختلف موقعوں پر ملتا ہے۔

حضرت نانوتوی کے شاگرد خاص مولانا عبدالعلی میرٹھی شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی نے اپنی سند کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی:۔

"وقال لی استاذی، قرأت النسائی کاملا
واکثر سنن ابی داؤد و اول ابن ماجه عن
المحدث العلامه احمد علی سهارنفوری"۔

(مجموعۃ الاسانید العالیہ والشہادات السامیہ ص:۱۴۶ از زید ابوالحسن فاروقی ،نقل از: استاذ الکل مملوک العلی، نانوتوی ص: ۴۵۵! نورالحسن راشد .... مطبوعہ مفتی الہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

سند کا یہ حصہ دلیل ہے کہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے ابوداؤد کے علاوہ کامل نسائی اور کسی قدر ابن ماجہ بھی پڑھی ہے۔

مؤطا کی سند:۔

اسی طرح حضرت مولانا نانوتوی کی حضرت مولانا احمد علی صاحب کے حوالہ سے مؤطا امام مالک کی اجازت وسند ۱۳۵۰ھ تک دار العلوم دیوبند میں معروف تھی، مولانا عبدالباسط بلیاوی نے اپنے مجموعہ اجازات میں لکھا ہے:۔

"اخبرنا المتقن الفقيه المفتی مولانا عزيز
الرحمٰن عن العلامه مولانا محمد يعقوب
عن الشيخ العلامة الجليل مولانا محمد
قاسم عن الشيخ الفقيه المتقن المحدث الو
لی مولانا احمدعلی۔"

(مجموعۃ الاسانید الحدیث۔: مولانا محمد ناصر بن عبدالباسط صدیقی فتح پوری بلیاوی (۱۲۴۳ھ مکتوبہ بخط مؤلف ۱۳۵۰ھ) نقل از استاذ الکل مملوک العلی ص:۴۵۶۔ نورالحسن راشد...... مطبوعہ مفتی الہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

سند حدیث:۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت نانوتوی نے دو شیوخ سے حدیث پڑھی ہے، اس لئے آپ کی سند

حدیث تین واسطوں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پہنچتی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۹ھ

شاہ ابوسعید مجددی دہلوی	شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی ۱۲۶۲ھ
شاہ عبدالغنی مجدد	مولانا احمد علی محدث سہارنپوری
مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب	مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی صحبت:۔

مولانا نانوتوی کو حضرت مظفر حسین صاحب کاندھلوی (مولانا مظفر حسین: خلف مولانا محمود بخش صدیقی کاندھلوی ۱۲۲۰ھ۔ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ متوسطات تک گھر ہی پر اپنے والد اور چچا حضرت نقی الٰہی بخش سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب سے حدیث کی تکمیل کی، اور شاہ محمد یعقوب نے اجازت وخلافت سے نوازا۔ ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء کو جمعہ کے دن اسہال کے مرض میں مدینہ میں وفات ہوئی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قدموں میں مدفون ہوئے) سے خاص تعلق تھا، یہ تعلق کیسے ہوا؟ حالات پر نظر ڈال نے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نانوتوی اپنے استاذ مولانا مملوک العلی کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور مولانا مملوک العلی کا مولانا مظفر حسین سے خاص تعلق تھا اور استاذ الکل کا مولانا مظفر حسین صاحب سے وعدہ تھا کہ میں جب بھی دہلی آتے جاتے کاندھلہ سے گزروں گا، آپ سے ضرور ملاقات کروں گا، ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلق کتنا بے تکلف اور سادہ تھا، حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

> ”دہلی سے نانوتہ جاتے ہوئے راستہ میں کاندھلہ
> پڑتا تھا، مولانا مظفر حسین صاحب نے ان سے کہہ
> رکھا تھا کہ کاندھلہ میں مل کر جایا کرو، مولانا مملوک
> العلی صاحب نے یہ کہدیا تھا کہ تکلف نہ کرنا، صرف
> ملنے کیلئے کچھ دیر ٹھہر جایا کروں گا، چنانچہ گاڑی راستہ

میں ہی چھوڑ کر ملنے آتے۔ مولانا اول یہ پوچھتے کہ
کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے؟ اگر کہا کہ کھا چکا تو پھر کچھ
نہیں، اگر نہ کھائے ہوئے ہوتے تو کہ دیتے کہ
میں کھاؤں گا، تو پوچھتے کے رکھا ہوا لا دوں، یا تازہ
پکوادوں؟ چنانچہ ایک بار یہ فرمایا کے رکھا ہوا لا دو،
اس وقت صرف کھچڑی کی کھرچن تھی، اس کو لے
آئے اور کہا کہ رکھی ہوئی تو یہی تھی ،انہوں نے کہا
بس یہی رکھ دو۔ پھر جب رخصت ہوتے تو مولانا
مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک پہونچانے
جاتے یہ ہمیشہ کا معمول تھا"

(حسن العزیز ج:ا ص:۴۹۰ ملفوظات حضرت تھانوی............مطبوعہ تھانہ بھون)

حضرت مولانا مملوک العلی نے اس وعدہ کو ہمیشہ نبھایا۔ چونکہ مولانا نانوتوی بھی نانوتہ سے دہلی آتے جاتے وقت اپنے استاذ کے ساتھ رہتے تھے، تو ان کی بھی ملاقات ہوتی تھی، بعد میں یہ ملاقاتیں تعلق میں تبدیل ہوگئیں۔

مولانا قاسم صاحب کے سیرت وکردار پر گہرے اثرات:-

اور اس تعلق نے یہ گل کھلائے کہ مولنا مظفر حسین کی سادگی، تواضع ،بے نفسی اخلاق عالیہ، تعلق مع اللہ، رغبت سنت استقامت، تورع، زہد، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے فکر وغیرہ مولانا نانوتوی پر اثر انداز ہوئی۔ خصوصا احیاء سنت کے اثر کو آپ نے بہت زیادہ قبول فرمایا:۔

"سر سید احمد نے لکھا ہے ان کو جناب مولانا مظفر
حسین کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت
راغب کر دیا تھا"

(سر سید کی تعزیتی تحریریں ص:۱۶۔ اصغر حسین (علی گڑھ ۱۹۸۹))

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی سے تعلق:۔

(حاجی امداد اللہ مہاجر مکی: خلف محمد امین بن شیخ بدھا نانوتہ میں صفر ۱۲۳۳ھ دسمبر ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے ،قرآن کے حفظ کے علاوہ مولانا رحمت اللہ سے تکمیل الایمان، مولانا عبد الرحیم نانوتوی سے حصن حصین اور فقہ اکبر، مولانا سید محمد قلندر جلالہ آبادی سے مشکوۃ شریف، مولانا ابوالحسن کاندھلوی اور مولانا عبد الرزاق جھنجھانوی سے مثنوی مولانا روم پڑھی۔ شاہ نصیر الدین سے مجاز بیعت ہوئے، ان کی وفات کے بعد میاں جی نور محمد جھنجھانوی سے بیعت ہو کر خلافت حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لیا، کئی تصانیف چھوڑی ۱۲ر جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ میں چہارشنبہ ۱۸ر اکتوبر ۱۸۹۹ء مکہ میں وفات پائی اور جنت المعلی میں دفن کیے گئے)

مولانا نانوتوی کی حاجی صاحب سے خاندانی قرابت تھی اور حاجی صاحب کی ایک بہن نانوتہ میں تھی اسلئے اکثر حاجی صاحب کا نانوتہ آنا جانا رہتا تھا اور مولانا نانوتوی حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، اور جب آپ کی تعلیم دہلی شروع ہوئی تو دہلی آمد و رفت کے وقت تھانہ بھون ضرور حاضری دیتے تھے۔ اور حاجی صاحب دہلی تشریف لیجاتے تو قیام مولانا مملوک العلی صاحب کے گھر ہی رہتا تھا، حضرت نانوتوی بھی وہیں قیام پذیر تھے، اس طرح زیارت وملاقات کا سلسلہ برابر جاری تھا، بلا آخر دل حاجی صاحب کی بے پناہ عقیدت سے معمور ہوتا چلا گیا اور آپ کی ارادت ومحبت سے اسقدر سرشار رہتے تھے کہ اپنے ساتھیوں کی مجلسوں میں اور اپنے انتہائی مخلص حضرت گنگوہی کے سامنے حضرت حاجی صاحب کے فضائل ومناقب، ان کے کمالات وامتیازات ان کے علوم ومعرفت وسلوک کو پرجوش الفاظ میں بیان کرتے تھے۔

بیعت واجازت:۔

حضرت نانوتوی حضرت حاجی صاحب سے کب بیعت ہوئے؟ اس سلسلہ میں کوحتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ اتنا طے ہے کہ یہ بیعت تعلیم سے فراغت کے بعد ہی ہوئی، جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کی تاریخ بیعت ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ء) بتائی ہے۔

انوار قاسمی ج:۱ص:۱۳۲ر مولانا انوار الحسن شیرکوٹی............مکتبہ قاسمی دیوبند)

لیکن مولانا نورالحسن راشد نے اسکا انکار کیا ہے، انکی رائے انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی ونانوتوی سن ۱۲۶۹ھ (۵۲۔۱۸۵۱ء) کے قریب تک حضرت شاہ عبدالغنی کے حلقۂ درس میں سے تھے اور حضرت گنگوہی کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس وقت تک دونوں کا شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا، مگر اس پر عمل نہیں ہوا تھا، اس لئے شیرکوٹی صاحب کی اطلاع درست نہیں حضرت گنگوہی کے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کا واقعہ تقریبا ۱۲۷۱ھ (۵۵۔۱۸۵۴ء) میں پیش آیا ہوگا ،اس کے بعد بظاہر چند ہفتوں یا ایک ڈیڑھ مہینے میں حضرت مولانا محمد قاسم بھی اس خانقاہ کے حلقۂ بگوش ہوئے تھے''۔

(استاذالکل مولانا مملوک العلی نانوتوی ص:۴۶۲ نورالحسن راشد............ مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اجازت نامہ:-

مولانا نانوتوی کو اجازت بیعت بھی حاجی صاحب سے ملی تھی، یہ اجازت ان کو کب ملی؟، اس سلسلہ میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ حضرت حاجی صاحب نے جو اجازت نامہ تحریر فرمایا تھا وہ درج ذیل ہے:

''بخدمت مولوی خورشید حسین صاحب واضح باد

اگر چہ ایں رو سیاہ گمراہ ہم سزا وار ایں امر عظیم
نیست مگر امتثال او بزرگاں نمودہ اخذ بیعت تبرکاً
میکند، لہذا آں برگزیدۂ کونین را نیز بطوریکہ ایں
مدرا از بزرگاں خود اجازت اخذ بیعت است
اجازت دادہ می آید، مناسب کہ ہر کدام کس
طالب کے رجوع نماید اخذ بیعت نمودہ تعلیم نام
خدا نمایند، ہرگز انکار نکنند۔ ہدایت کنند ہادی
مطلق است آنرا کہ فرستاد ہدایت ہم خواہد کرد"۔

ترجمہ:۔

"بخدمت مولوی خورشید حسین صاحب واضح ہو کہ
اگر چہ یہ گمراہ سیاہ رو اس بڑی خدمت کا اہل نہیں
ہے مگر بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لوگوں
کو بیعت کر لیتا ہے، اسلئے آں برگزیدہ کونین کو بھی
اسی طریقہ کے مطابق جس طرح کے اس نااہل کو
اپنے بزگوں سے بیعت لینے کی اجازت ہے،
اجازت (بیعت) دی جارہی ہے۔مناسب یہ کہ جو
شخص آپ سے رجوع کرے اس کو بیعت کر کے
اللہ کے نام کی تعلیم دیں، ہرگز انکار نہ کریں۔
ہدایت دینے والا ہادی مطلق ہے. جس کو چاہتا ہے
کہ بھیجے اس کو ہدایت بھی خود ہی کرتا ہے"۔

(رقومات امدادیہ مع مقدمہ ڈاکٹر نثار فاروقی ص:۹ نقل از: استاذ الکل مملوک العلی ص:۴۶۳
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ حضرت نانوتوی کا تاریخی نام خورشید حسین تھا، اور اسی نام سے اس اجازت نامہ میں آپ کو مخاطب کیا گیا ہے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مولانا نے روپوشی کی زندگی گزاری، حاجی صاحب نے اس دور کے تمام خطوط میں آپ کو تاریخی نام سے خطاب کیا ہے۔ اس تاریخی واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ حضرات نے اشارہ کیا ہے کہ مولانا کو اجازت ۱۸۵۷ء کے بعد روپوشی کے زمانہ میں ہی ملی۔

(استاذ الکل مملوک العلی نانوتوی ص:۶۴۳ نور الحسن راشد...... مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ

تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت:۔

حضرت نانوتوی کی کسی سوانح میں اس کی صراحت موجود نہیں ہے کہ انہوں نے کب فراغت حاصل کی؟ لیکن اندازہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کی فراغت کا سن ۱۲۶۵ھ ہے کیونکہ مولانا گنگوہی بالیقین چار سال دہلی میں مقیم رہے اور ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں فارغ ہو کر گنگوہ واپس آگئے۔

(تذکرۃ الرشید ج:۱ رص: ۳۵ مولانا عاشق الٰہی........... مکتبہ دار الکتاب دیوبند)

چونکہ حضرت نانوتوی درسی ساتھی ہیں اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت کی افرغت کا سن بھی یہی ہے اس وقت آپ کی عمر ۱۷ رسال تھی۔

(تاریخ دار العلوم ج:ا ص:۱۱ اسید محبوب رضوی .... مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند)

آپ نے اپنی مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد مطبع دہلی میں تصحیح کا کام شروع کر دیا حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہندوستان میں طباعت اور اشاعت کام شروع نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی پریس کا سراغ ملتا ہے، البتہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے آخری دور میں کلکتہ کے مطابع قائم ہو گئے تھے، اور وہاں سے حضرت نے الفوز الکبیر وغیرہ کی طباعت بھی کرائی تھی۔

(تذکرہ مظہر نانوتوی ص:۵۷ نور الحسن راشد ۔مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

غالباً اس مطبع کو حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری نے حجاز سے واپس آکر ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں قائم کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہ مطبع میرٹھ منتقل ہو گیا۔ اس مطبع نے کتب

حدیث کی طباعت اور اشاعت میں اہم رول ادا کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی اور ۱۲۷۱ھ میں مشکوۃ المصابیح نہایت اہتمام سے شائع کی۔

(تاریخ دارالعلوم حاشیہ ج:۱ ص:۱۰۸ سید محبوب رضوی...... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اس دور کے مطابع:-

اس دور کے مطابع کو اس زمانہ کے مطابع پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ان کی نوعیت موجودہ مطابع سے یکسر مختلف تھی، نور الحسن راشد ان مطابع کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں عمدہ پریس قائم تھے، جو اسلامی علوم
اور فنی موضوعات پر اہم فاضلانہ کتابیں مقابلہ
وتحقیق، حواشی اور ضروری لوازم کے ساتھ شائع کیا
کرتے تھے''

آگے لکھتے ہیں:

''یہاں سے جو کتابیں چھپ کر آتی تھیں، وہ صحت
متن، جامع حواشی اور فہم مطالب کے لحاظ سے
بے نظیر ہوتی تھیں''۔

(استاذ الکل مملوک العلی ص:۲۶۶ نور الحسن راشد .... مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

ملازمت کے ساتھ تدریس:-

مطابع کی اس نوعیت کو سمجھنے کے بعد تصحیح کے کام کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اگر کہا جائے تو ہم حق بجانب ہوں گے کہ بسا اوقات تصحیح متون وحواشی کا کام درس وتدریس سے زیادہ محنت ومشقت کا ہے، اس کے باوجود حضرت نانوتوی درس وتدریس بھی انجام دیتے رہے، بلکہ چند طلباء سفر وحضر میں آپ کے ساتھ ہی رہتے تھے، اور انکا خرچ بھی آپ ہی برداشت کرتے تھے، شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی، مولانا احمد حسن امروہوی وغیرہ نے اسی زمانہ میں حدیث کی تکمیل کی ہے، درس وتدریس کے ساتھ آپ کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا حتی کے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد

روپوشی کی حالت میں بھی اسباق کا سلسلہ جاری رہا اسی زمانہ میں مولانا یعقوب صاحب نے حضرت نانوتوی سے بخاری وغیرہ پڑھی۔

(استاذ الکل مملوک العلی ص:۴۶۹ نور الحسن راشد......مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مطابع میں ملازمت کی تفصیل:۔

حضرت نانوتوی کی مطابع سے وابستگی تقریباً تیئیس یا چوبیس سال رہی (استاذ الکل مملوک العلی ص:۴۶۷ نور الحسن راشد ۔مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ) لیکن اس کی تفصیلات مفقود ہیں، البتہ اتنا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت نانوتوی اپنے آخری سفر حج ۱۲۹۵ھ تک تین مطابع سے وابستہ رہے،

۱۔ مطبع احمدی دہلی مملوکہ مولانا احمد علی سہارنپوری

۲۔ مطبع مجتبائی میرٹھ ودہلی ۔مملوکہ منشی ممتاز علی

۳۔ مطبع ہاشمی میرٹھ

ان کے علاوہ مطبع ضیائی میرٹھ سے بھی بعض لوگ آپ کے تعلق کو بتاتے ہیں (قاسم العلوم مولانا قاسم نانوتوی احوال وآثار ص:۶۲ نور الحسن راشد مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ) آپ نے اس مدت میں کس کس کتابوں کی صحت ودرستگی فرمائی اور کس کس کتابوں کا حاشیہ لکھا؟ صرف قرآن شریف کی چند اشاعتوں اور بخاری شریف کے چند پاروں کے حاشیہ کے علاوہ کیا کیا خدمات انجام دیں؟ یہ تفصیلات ہماری دسترس میں نہیں ہے۔

چند شاگرد:۔

ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ مطابع کی ملازمت کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا ابتدائی دور میں زیادہ وقت تصحیح کتب میں گذرتا تھا، لیکن دوسرے سفر حج ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء کے بعد آپ کا زیادہ وقت درس حدیث میں ہی گذرتا تھا، اس مدت میں کتنے طلباء نے آپ سے استفادہ کیا یہ بتانا مشکل ہے، معلوم شگردوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی

۲۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی

۳۔ مولانا عبد العلی میرٹھی

۴۔ مولانا فاضل پھلتی

۵۔ مولانا عبد الحق پورقاضوی

۶۔ مولانا محی الدین مرادآبادی

۷۔ مولانا حکیم بجنوریؒ

۸۔ مولانا عبد العدل پھلتی

۹۔ مولانا احمد حسن امروہوی

۱۰۔ مولانا یعقوب صاحب نانوتوی

بخاری شریف کا حاشیہ:۔

حضرت نانوتوی کی زندگی کا قابل فخر کارنامہ ہے، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے مکہ میں حدیث شریف کی تکمیل کر کے ۱۲۶۱ھ میں تشریف لائے تو ان کو کتب احادیث کی طباعت اور اشاعت کی سوجھی، چونکہ مکہ میں انہوں نے کتابیں اپنے قلم سے نقل کر کے پڑھی تھی، تو انہی کی اشاعت کے لئے مطبع قائم کیا اور حواشی کا کام شروع کیا، اولاً آپ نے بخاری پر حاشیہ کا کام شروع کیا اور آخر کے چند پاروں کے علاوہ پوری کتاب کا حاشیہ لکھا۔

آخر کے چند پاروں کا حاشیہ حضرت نانوتوی سے لکھایا، حضرت نانوتوی کا حاشیہ کتنے پاروں پر ہے؟ اس سلسلہ میں رائیں مختلف ہے، ایک فریق کا کہنا ہے کہ ان پاروں کی تعداد پانچ یا چھ ہے دلیل ان کے پاس مولانا یعقوب صاحب کی تحریر ہے، (سہ ماہی احوال وآثار جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۷ھ ص:۲ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ) دوسرا فریق کہتا ہے کہ ان پاروں کی تعداد تین ہے اور دلیل شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ مظاہر العلوم سہارنپور کا اپنا عربی اسلوب نگارش کے سلسلہ میں وجدان ہے، ان کا کہنا ہے کہ ”کتاب المحاربین“ سے حاشیہ نگاری کا طرز اور اسلوب

بالکل جدا ہے اس سے دو الگ الگ اسلوب سامنے آتے ہیں۔

(قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی احوال و آثار ص: ۷۵......

از: نور الحسن راشد، مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مفتی محمود حسن صاحب کا واقعہ :-

یہ عجیب نوعیت کا مسئلہ ہے کہ اسمیں مزید بحث کی گنجائش بھی ہے اور مذکورہ باتوں کے علاوہ کوئی تاریخی دلیل بھی کسی فریق کے پاس نہیں ہے، البتہ فریق ثانی حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کا واقعہ اپنی رائے کی توثیق کے لئے پیش کرتے ہیں:۔

''میں نے ایک مرتبہ حضرت یونس صاحب سے اس حاشہ کے متعلق عرض کیا تو فرمایا، ہاں، مفتی (محمود حسن) صاحب جب دار العلوم میں بخاری شریف جلد ثانی پڑھاتے تھے اسی زمانہ میں مفتی صاحب نے کئی سال کے تعلیمی تجربہ کے بعد فرمایا کہ بخاری شریف کے آخری چند پاروں میں حضرت نانوتوی کے حواشی کی جوبات کی جاتی ہے ،پانچ پاروں کی بات دل قبول نہیں کرتا تمہاری (یعنی حضرت مولانا محمد یونس مدظلہ) کی کیا رائے ہے؟ حضرت مولانا نے فرمایا کہ میرے خیال میں حضرت نانوتوی کا لکھا ہوا حاشیہ تین پاروں کا ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا کیوں! حضرت مولانا نے اس کی وجوہات بیان فرمائیں، مفتی صاحب یہ سن کر خاموش رہے، کچھ نہیں کہا! اسکے بعد بہت عرصے تک اس کا تذکرہ

نہیں کیا، تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال بعد جب
(حضرت مفتی صاحب بخاری شریف کے آخری
پاروں کا دو مرتبہ اور درس دے چکے تھے) مفتی
صاحب نے مولانا سے فرمایا، تمہاری بات صحیح
معلوم ہوتی ہے، اب میری بھی یہی رائے ہے،،۔

(سہ ماہی احوال وآثار جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۷ء ص: ۳۹ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ
............مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

حاشیہ کا زمانۂ تحریر:-

مولانا نانوتوی نے حاشیہ کب تحریر فرمایا؟ اس سلسلہ میں بھی رائیں مختلف ہیں تاریخ دارالعلوم کے مصنف محبوب رضوی کی رائے ہے کہ یہ حاشیہ ۱۲۶۹ء میں شروع ہوا اور ۱۲۷۰ھ میں اس کی طباعت ہوئی (تاریخ دارالعلوم ج:۱ ص:۱۱۰ رسید محبوب رضوی۔ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)
البتہ حیات شبلی میں ہے کہ صحیح بخاری پہلی مرتبہ ۱۸۵۰ء کے ۱۲۶ھ میں چھپی تھی لکھا ہے:

''مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا اہم کارنامہ یہ
ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح
کرکے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۸۴۸۔۱۲۶۵ھ
میں جامع ترمذی اور ۱۸۵۰ء کے ۱۲۶ھ میں صحیح
بخاری شائع کی، مولانا شبلی فرماتے تھے کہ استاد
مرحوم (یعنی محدث سہارنپوری) نے بیس برس
کامل بخاری شریف کی تصحیح وتحشیہ میں بسر کئے''۔

(حیات شبلی ص:۸۵ نقل از: تاریخ دارالعلوم ج:۱ ص:۱۱۰ ......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

سفرحج:-

حضرت نانوتوی نے تین حج کئے پہلا حج ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کو اس وقت کیا جب آپ روپوشی کی زندگی بسر کررہے تھے، دوسرے حج کے لئے ۸/شوال ۱۲۸۶ھ جنوری ۱۸۷۰ء کو روانگی فرمائی، اور تیسرے اور آخری حج کیلئے ۱۰/شوال ۱۲۹۴ھ/۱۸۔اکتوبر ۱۸۷۷ء کو روانہ ہوئے۔

(استاذ الکل مملوک العلی ص:۴۷۹ نورالحسن راشد............
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

تصانیف:-

حضرت نانوتوی کی تصنیفی زندگی کا آغاز بخاری شریف کے حاشیہ سے ہوتا ہے، اس کے بعد آپ نے انتباہ المومنین اور ۱۲۹۱ھ میں ہدیۃ الشیعہ لکھی، اسی کی ضمنی بحث کو آب حیات کے نام سے شائع کیا۔ یہ آپکی مستقل تصانیف کی تعداد ہے، انکے علاوہ آپ کے معلوم مکتوبات کی تعداد ۱۱۵ ہے، جو پچاس مضامین پر مشتمل ہے، ان ہی مکتوبات میں سے کسی ایک موضوع سے متعلق مواد کو یکجا کرکے لوگوں نے چھاپے ہیں، اور ان میں سے بھی اکثر کتابوں کے نام خود ناشرین نے طے کئے ہیں اور اب یہ مطبوعہ مکتوبات آپ کی تصانیف میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(استاذ الکل مملوک العلی ص:۴۷۸ نورالحسن راشد ....مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اجرائے مدارس:-

ہندوستان میں انگریزوں نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ عیسائیت کو بھی فروغ دیا۔ اور ہر ممکن کوشش سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی، حکومت کی مدد سے ملک کے کونے کونے میں مبلغین سرگرم ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد تو صورت حال اور بھی بدتر ہو گئی، چوراہوں اور عام مجمعوں میں اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا جانے لگا، اس وقت حضرت نانوتوی نے اجرائے مدارس کا پروگرام بنایا اور اس کو عملی جامعہ پہنایا۔

حضرت نانوتوی نے ہندوستان میں علوم دینیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے تعلیمی تحریک کا احیاء

مدارس اسلامیہ کا اجراء اور مدارس کے لئے جو اصول، خطوط اور قواعد وضع کئے ہیں، ان کو قیامت تک خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہیگا۔

مناظرے:۔

ہم یہ بات بیان کر آئے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ عیسائی نظریات اور مذہب کی بھی اشاعت کی گئی، انگریز حکومت کے نشے میں اتنے چور تھے کہ پورے ملک کو عیسائیت کے دریا میں ڈبو دینا چاہتے تھے۔

عیسائیوں کا ایک سیل رواں تھا جو ہر گلی کوچے میں بہہ رہا تھا، عیسائی مبلغین بر سر راہ اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور مسیحیت کا اعلان کرتے تھے اور مسلمان ہو یا ہندو، اپنے مذاہب کی توہین ظلم کے خوف سے سننے پر مجبور تھے، اس دور میں عیسائی مبلغین نے نہ صرف یہ کہ عیسائیت کی تبلیغ کی بلکہ مناظرانہ دعوے بھی کئے۔ اسی زمانہ میں حضرت نانوتوی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے۔

''تم لوگ بھی کھڑے ہو کر کچھ بیان کرو''۔

(سوانح عمری مشمولہ سوانح قاسمی ج:۱ص:۴۰ مناظر گیلانی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ خو بھی ان مبلغین کے سامنے آئے اور کے اعتراضات کے جوابات کے ساتھ ساتھ اسلام کی برتری کو ثابت کیا۔ میلہ خداشناسی ہو یا رڑکی میں ''سوامی دیانند'' سے خط و کتابت غرض ہر جگہ اسلام کی حقانیت کو واضح کیا۔

۱۸۵۷ء:۔

۱۸۵۷ء کا واقعہ کیا تھا؟ اس سلسلہ میں مؤرخین کا سخت اختلاف ہے، کچھ لوگ اس کو غدر یعنی فوجی بغاوت پر محمول کرتے ہیں، اور کچھ لوگ کا کہنا ہے کہ یہ ایک منظم جنگ آزادی کی پہلی جدوجہد تھی کچھ حضرات کا رجحان یہ ہے کہ ابتداء میں یہ ایک فوجی بغاوت تھی، لیکن بعد میں چل کر آزادی کے حصول کے لئے ایک جدجہد بن گئی۔

مال سن، ٹروبلین، لارنس، اور ہومز جیسے انگریز مؤرخین نے اس کو صرف فوجی بغاوت کہا ہے

جو صرف فوج تک محدود تھی، عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی۔

(ہندوستانی نشأۃ ثانیہ میں دہلی کالج کا کردار ص:۱۲۳ ر شمس الہدیٰ دریا آبادی......

مطبوعہ دریاباد بستی)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک طاقت ور تحریک تھی جو ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے خلاف شروع ہوئی تھی، مگر انگریز نے اس کو عیاری اور مکاری سے غدر کا نام دیدیا، اور طاقت کے زور پر اس کا اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ ۱۹۲۰ء تک تمام اہل قلم اس کو غدر ہی لکھتے رہے اگر کوئی جنگ آزادی لکھتا تو یقیناً غداروں کی فہرست میں گن لیا جاتا۔

(قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم صاحب احوال وآثار حاشیہ:۲۰۴ ر نورالحسن راشد ......

مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اسیر ادروی نے اس تحریک کے ابتدائی احوال یوں لکھے ہیں کہ اولا بغاوت میرٹھ فوجی چھاؤنی میں ہوئی مسئلہ چربی کارتوس کا تھا، حکومت اسلحہ پر سور اور گائے چربی لگا کر دیتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہندو مسلم دو مذہب کے فوجیوں کے جذبات مجروح ہوتے تھے، اور ان کے دلوں میں یہ بات گھر کرگئی تھی کہ حکومت ان کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ کچھ فوجیوں نے اپنے افسران کا حکم ماننے سے انکار کردیا، ان فوجیوں کو سزا دی گئی، اپنے فوجی کے ساتھ یہ ذلت دیکھ کر دوسرے بھی میدان میں آگئے اور انہوں نے گھوم گھوم کر افسران کو بھون ڈالا، اور سب نے نعرہ دیا کہ دہلی چلو اور بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں۔

(مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے ص:۷۷ر اسیر ادروی ......

مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

فوجیوں کی بغاوت کی یہ خبر آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی اور ہر جگہ حکومت کے خلاف بغاوت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے علماء اور مشائخ بھی سامنے آئے اور اس کو جہاد قرار دیکر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی، حضرت حافظ ضامن شہید صدر مجلس جنگ، حضرت نانوتوی چیف کمانڈر، مولانا منیر نانوتوی معاون کمانڈر ان چیف اور فوجی سکریٹری

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی منتخب کئے گئے۔ حضرت نانوتوی کی عمر اسوقت ۲۵ یا ۲۶ سال تھی، حضرت نے جوانمردی کے جوہر دکھائے حضرت حافظ ضامن اور دیگر حضرات شہید ہوئے، قدرت کا کرشمہ چند وجوہات کی بناء پر ناکامی ہوئی اور ان حضرات کو روپوشی کی زندگی گذارنی پڑی، حضرت حاجی صاحب چھپتے چھپاتے مکہ روانہ ہوگئے، حضرت گنگوہی گرفتار ہوگئے اور مظفر نگر جیل میں چھ ماہ گزارے، بالآخر ڈیڑھ سال کے بعد نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا تو روپوشی اور عسرت والی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

(سر سید احمد خاں. خلف میر متقی ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے دادا جواد الدولہ سید ہادی شاہ عالم کے زمانہ میں صوبہ شاہ جہاں آباد کے محتسب اور قاضی لشکر تھے، انہوں نے ہی علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی)

حضرت نانوتوی اور سر سید:۔

۱۸۵۷ء کے بعد اسلامی ہند کی ساری بساط ہی الٹ گئی، سارا چمن ہی برباد ہوگیا، اب نئے سرے سے چمن بندی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دو رہنما مسلمانوں کے سامنے آئے سر سید احمد خاں اور حضرت نانوتوی۔

اس واقعہ کے بعد سر سید کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اگر ہندوستان میں مسلمان باقی ہے، اس کی معاشی اور اقتصادی حالت اچھی ہے تو اسلام بھی باقی رہیگا، چنانچہ انہوں نے اپنے اس نظریہ کی حفاظت کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اس نظریہ کو انتہاء تک پہونچا سکتا تھا، اسی نظریہ کے پیش نظر غدر کے فوراً بعد انہوں نے ''اسباب بغاوت'' لکھی۔

(مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے ص:۱۱۸؍اسیر ادروی ...... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اور لندن ممبران پارلیمنٹ کے پاس بھیجی اس کی وجہ سے حکومت کی نظر میں سر سید کا احترام بہت بڑھ گیا' غرض انہوں نے حکومت کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے سب کچھ کیا پھر اس کے بعد علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالی تا کہ مسلمان اعلی تعلیم حاصل کریں اور حکومت کے اعلی عہدوں تک پہونچیں۔

دوسری طرف حضرت نانوتوی کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام باقی ہے تو مسلمان باقی رہیں گے، اور اگر اسلام ہی مٹ گیا تو نسل اور خون کے اعتبار سے کوئی قوم اپنے کو مسلمان کہے تو اس سے ہمارا کوئی سروکار نہیں. چنانچہ اسی نقطۂ نگاہ کے پیش نظر مدارس کا قیام عمل میں آیا جہاں صرف دین ہی کی تعلیم تھی۔

تقابل ٹھیک نہیں ہے:-

دونوں حضرات کے تذکرہ نگار نیز ہندوستان کی معاشی اور تعلیمی حالات پر گفتگو کرنے والے حضرات کا عموماً یہی معاملہ رہا ہے کہ انہوں نے دونوں رہنماؤں کو ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑا کیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ایکدوسرے کے نظریات مختلف تھے. لیکن ہم اس تقابل کو ٹھیک نہیں سمجھتے ہیں بات وہی صحیح ہے جو نورالحسن راشد نے لکھی ہے:-

> واقعہ یہ کہ دونوں حضرات کی خدمات بلکہ کارنامہ
> اپنی اپنی جگہ ملت کا سرمایا ہیں، دونوں سے دینی
> علمی تعلیمی دنیا کو غیر معمولی ترقی اور رہنمائی نصیب
> ہوئی خصوصاً برصغیر ہند کے تمام مسلمانوں کو ان
> سے ایسا وسیع فائدہ ہوا جس کی نظیر نہیں. اگرچہ
> سرسید احمد کے بعض مذہبی خیالات وتفردات سے
> اتفاق ممکن نہیں لیکن سرسید احمد کو حضرت مولانا
> نانوتوی یا مدارس اسلامیہ کا مدمقابل سمجھنا اور سرسید
> احمد کی تنقیص کی مہم چلانا اس وقت کے حالات،
> ملک کی تاریخ، علی گڑھ کالج اور تحریک کے مقاصد
> اور فوائد وثمرات سے بے خبری کی علامت ہے ۔

(سہ ماہی احوال وآثار جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۷ء ص:۱۶ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

یہ حقیقت ہے کہ حضرت نانوتوی نے کبھی بھی سرسید احمد کی تعلیمی تحریک کی مخالفت نہیں کی،

بلکہ ایک جگہ سر سید احمد کی تعریف میں لکھا ہیں:

''سید صاحب کی اولوالعزمی اور درمندئ اسلام کا
معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار
محبت کروں تو بجا ہے''

(رسالہ تصفیۃ العقائد ص:۵ مولانا محمد قاسم نانوتوی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

دوسری طرف سر سید احمد خاں بھی دارالعلوم کے قیام کو بنظر استحسان دیکھتے تھے اور اس کے قیام کو ضروری سمجھتے تھے. چنانچہ جب مولانا رفیع الدین مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مدرسہ کی سالانہ رپوٹ سید صاحب کی خدمت میں بھیجی تو خان صاحب نے تہذیب الاخلاق میں درد کے ساتھ لکھا:۔

''مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسہ
میں جیسا کہ دیوبند کا عربی مدرسہ ہے جس میں
مولانا محمد قاسم سا فرشتہ سیرت شخص نگراں ہے اور
مولوی یعقوب صاحب سا شخص مدرس ہے کچھ مدد
نہ کریں''۔

آگے لکھتے ہیں:۔

''قوم کا مسلمانی مدرسہ اور ایسی خراب اور محتاج
حالت میں ہے کہاں ہیں بڑے بڑے دینداری کا
دعوی کرنیوالے اور کیوں مذہب اسلام کو ایسی
حالت میں ڈال رکھا ہے''

مزید آگے لکھتے ہیں:۔

''ہماری غرض اس تحریر سے مسلمانوں کو اس بات
کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں کام دین و
دنیا سب خراب اور ان کو چاہئیے کہ اس مدرسہ کی

ایسی مدد کریں اور ایسی اعلیٰ ترقی پر پہنچائیں جو
اسلام کی رونق وشان کا نمونہ ہو“۔

(تاریخ دارالعلوم ج: سید محبوب رضوی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

حضرت نانوتوی کے انتقال پر سرسید احمد نے جو تعزیتی تحریر لکھی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ سرسید احمد کو حضرت نانوتوی سے کس قدر تعلق تھا۔

”افسوس ہے کہ جناب ممدوح (مولانا قاسم
صاحب) نے ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس
کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا زمانہ
بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئیگا۔
لیکن ایسی شخص کیلئے جس کے بعد اسکا کوئی جانشین
نظر نہ آئے تو نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث
ہوتا ہے“۔

آپ کی دینداری، تقویٰ اور ورع کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین
داری اور تقوی اور ورع اور مسکینی سے ثابت کردیا
کہ اس دل کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد
اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا
کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ“۔

اس تعزیتی تحریر میں دارالعلوم کے لئے پرزور اپیل کی ہے:۔

”دیوبند کا مدرسہ ان کی نہایت عمدہ یادگار رہے اور
سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ
مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ

سے تمام قوم کے دل پر انکی یادگاری کا نقش جما

رہے "۔

(موج کوثر ص: ۳۶۷۔۳۶۸ شیخ اکرام علی ....دارالکتاب دیوبند)

وفات:۔

آخری حج کے سفر سے واپس آرہے تھے کہ راستہ میں بیمار ہو گئے. مرض میں شدت پیدا ہو گئی اور اسی بیماری میں ۴؍ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵؍ اپریل ۱۸۸۰ء پنجشنبہ کی صبح کو وفات پائی .جنازے میں اتنی بھیڑ تھی کہ بقول مولانا یعقوب صاحب:

"اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا"

(سوانح عمری مشمولہ سوانح قاسمی ج ا رص:۴۶ مناظر احسن گیلانی......مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا کے ایک نیاز مند حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے ایک زمین مولانا کے دفن اور قبرستان کے لئے وقف کردی، وہی جگہ آج مزار قاسمی کے نام سے مشہور ہے. بعد نماز مغرب دفن ہوئے۔

حضرت نانوتوی کی شادی دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، ان سے دس اولاد ہوئیں تین لڑکے حافظ محمد احمد، محمد ہاشم اور محمد میاں. محمد میاں بچپن ہی میں انتقال کر گئے، محمد ہاشم نے عنفوان شباب میں مکہ میں وفات پائی. پانچ لڑکیاں تھیں رفیعہ، خدیجہ، مریم، عائشہ، اکرام النساء ان کے دو بچوں کے نام معلوم نہ ہوسکے۔

(مولانا محمد قاسم حیات اور کارنامے رص:۲۲۶: اسیر ادروی ....

مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

☆☆☆

حافظ محمد احمد صاحب

آپ حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی کے بڑے صاحبزادے اور حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب کے والد محترم ہیں، آپ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء کو نانوتہ میں پیدا ہوئے

(تاریخ دارالعلوم ج:۲ ص: ۲۲۸ سید محبوب رضوی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

جب آپ مکتب جانے کے لائق ہو گئے تو قصبہ رام پور منہاران میں حافظ نور محمد صاحب کے پاس قرآن کی ابتدائی تعلیم کے لئے بھیج دیا، نو سال کی قلیل مدت میں آپ نے قرآن شریف حفظ کرلیا۔

(ذکر طیب ص: ۳۸ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری........... مطبوعہ دارالکتاب دیوبند)

حفظ قرآن کے بعد مروّجہ تعلیم کے لئے آپ کو گلاؤٹھی ضلع بلند شہر بھیجدیا، جہاں حضرت نانوتوی نے ہی ایک ادارہ ''منبع العلوم'' کے نام سے قائم کیا تھا۔

(تاریخ دارالعلوم ج:۲ ص: ۲۲۸ سید محبوب رضوی........... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

گلاؤٹھی میں آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی اور کس کس استاذ سے استفادہ کیا یہ سب اطلاعات مفقود ہیں، اس کے بعد اونچی تعلیم کیلئے مرادآباد شاہی تشریف لئے گئے، اس مدرسہ کو بھی آپ کے والد حضرت مولانا نانوتوی نے ہی قائم فرمایا، اور اس وقت وہاں حضرت نانوتوی کے مائیہ ناز شاگرد مولانا احمد احسن امروہوی صدر مدرس تھے، یہاں بھی آپ نے کس فن کی کتاب کس استاذ سے پڑھی اس سلسلہ میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی، البتہ اتنا طے ہے کہ صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب آپ نے شاہی میں نہیں پڑھی۔

حضرت نانوتوی چاہتے تھے کہ صاحب زادے کو دیوبند بلا کر خود تعلیم دیں، چنانچہ اسی مقصد کیلئے آپنے انکو دیوبند بلالیا، لیکن قسمت کا کیا کریں! حضرت نانوتوی کا آخری وقت قریب آ گیا تھا۔ آخری سفر حج کی تیاریاں تھیں، اسی سفر سے واپسی پر آپ کی وفات ہوگئی اور حضرت نانوتوی جو خصوصی

تعلیم دینا چاہتے تھے وہ نہ ہوسکی۔

(ذکر طیب ص:۳۹ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری...........مطبوعہ دارالکتاب دیوبند)

دیوبند اور گنگوہ میں تعلیم :-

دیوبند میں حضرت شیخ الہند سے متعدد کتابیں بالخصوص معقولات کی اونچی کتابیں پڑھیں، حضرت مولانا یعقوب صاحب سے ترمذی کے چند اسباق پڑھے، اور سب سے آخری میں دورۂ حدیث شریف کیے لئے گنگوہ حضرت گنگوہی کے یہاں حاضر ہوئے اور وہیں سے سند حاصل کی۔

تدریس :-

آپ نے تعلیم سے فراغت کب حاصل کی ہے؟ اس سلسلہ میں بھی کوئی واضح روایت موجود نہیں ہے، البتہ آپ نے فراغت کے بعد تھانہ بھون میں حضرت نانوتوی کے قائم کردہ ادارہ سے تدریس کا آغاز کیا ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں بحثیت مدرس دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا، آپ نے تقریباً ہر فن کی کتابیں پڑھائیں لیکن خصوصیت سے مشکوۃ شریف، مختصر المعانی، جلالین شریف، اور میر زاہد وغیرہ کتابیں زیر درس رہیں۔

اہتمام :-

آپ نے تقریباً دس سال بحثیت مدرس درس دیا، لیکن جب ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں حاجی عابد صاحب نے استعفٰی دیدیا تو ان کے بعد کیے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے، ایک حاجی فضل حق دیوبندی، دوسرے مولانا منیر نانوتوی۔ لیکن یہ حضرات ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ چلا سکے، ان تغیرات کی وجہ سے نظام میں خلل اور بدامنی پیدا ہوگئی تو حضرت گنگوہی نے جو اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے حضرت حافظ احمد صاحب کے اہتمام سپرد کردیا محبوب رضوی لکھتے ہیں:-

> ''ہر سال کے تغیرات کی وجہ سے دارالعلوم کے
> نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا تو ۱۳۱۳ھ مطابق
> ۱۸۹۵ء میں حضرت گنگوہی نے اہتمام کیلئے

حضرت حافظ صاحب کا انتخاب فرمایا''۔

(تاریخ دارالعلوم ج:۲ص:۲۲۹ سید محبوب رضوی ....مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیو بند)

آپ نے اپنے اثر و وجاہت اور انتظامی صلاحیت کی بناء پر دارالعلوم کے نظام پر قابو پالیا۔ محبوب رضوی رقمطراز ہیں:

''حافظ صاحب نہایت منتظم اور صاحب
اثر و وجاہت تھے، چانچہ وہ بہت جلد دارالعلوم کے
انتظام پر قابو یافتہ ہوگئے اور تقرر کے وقت ان سے
جو توقعات قائم کی گئی تھیں بدرجہ اتم ان کے اہل
ثابت ہوئے''

(تاریخ دارالعلوم ج:۲ص:۲۲۹ سید محبوب رضوی ....مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیو بند)

حافظ صاحب کے زمانہ کی ترقی:-

آپ کے دارالعلوم سے تعلق کی مدت کل ۴۵ سال ہے دس سال مدرس کی حیثیت سے اور ۳۵ سال منتظم اور مہتمم کی حیثیت سے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حافظ صاحب کا دور ترقی کا دور ہے، آپ کے زمانہ میں یافت (آمدنی) کے علاوہ طلبہ اور شعبہ جات میں بھی اضافہ ہوا، دارالعلوم کی تاریخی عمارتیں آپ ہی کے دور کی ہیں۔ محبوب رضوی نے اجمالی تفصیل یوں لکھی ہے:-

''حافظ صاحب کے زمانہ کے اہتمام میں دارالعلوم
نے غیر معمولی ترقی کی جب عنان اہتمام اپنے
ہاتھ میں لی تھی تو دارالعلوم کی آمدنی کا اوسط پانچ
چھ ہزار روپے سالانہ تھا آپ کے عہد میں یہ اوسط
۹۰؍ ہزار تک ترقی کر گیا اسی طرح طلبہ کا اوسط دو
ڈھائی سو سے ترقی کر کے تقریباً نو سو تک پہنچ گیا
اس وقت کتب خانہ میں پانچ ہزار کتابیں تھی آپ

کے زمانہ میں کتابوں کی تعداد ۴۰؍ہزار تک پہونچ
گئی ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء تک عمارات دارالعلوم کی
مالیت ۳۶؍ہزار روپے تھی، آپ کے عہد میں یہ
مالیت میں ۴؍لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔

(تاریخ دارالعلوم ج:۲ص:۲۲۹ سید محبوب رضوی .... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ کی وجاہت کا اثر طلبہ اور اساتذہ سب پر برابر تھا، حضرت شیخ الہند باوجودیکہ آپ کے استاذ تھے، آپ سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

حافظ محمد اکبر شاہ بخاری نے لکھا ہے کہ۔
لیکن جب کبھی حضرت حافظ صاحب اپنی
صاحبزادگی اور مخدوم زادگی کے رنگ میں ہوتے اور
حضرت شیخ الہند آجاتے تو پھر ناز اور ادھر سے
نیاز قابل دید ہوتا، اور شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ
حافظ احمد صاحب کا میرے دل میں اتنا احترام ہے
کہ اگر وہ پاخانہ کی کوئی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے
کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا،،۔

(ذکر طیب ص:۴۰ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری .... مطبوعہ دارالکتاب دیوبند)

طلبہ کے ساتھ معاملہ:۔

آپ طلباء پر نہایت شفیق تھے، ان کی معمولی معمولی ضرورتوں پر مربیانہ نظر رہتی تھی، اور ان کو کوتاہیوں پر روک ٹوک کرتے تھے۔ مولانا انظر شاہ صاحب نے شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کے حوالہ سے ایک عجیب نوعیت کا واقعہ نقل کیا ہے لکھتے ہیں:۔

”حافظ صاحب نے دارالعلوم کی مسجد میں مغرب کی
نماز ادا فرمائی نوافل سے فراغت پر گھر تشریف لے

چلے تو ایک طالب علم کو مسجد میں لیٹے ہوئے دیکھا
جس کے پاؤ بجانب قبلہ تھے حافظ صاحب نے
وہیں دستی تنبیہ فرمائی اور معاً امداد طعام بھی مدرسہ
سے بند کردی گئی دو روز کے بعد کسی ضرورت سے
حافظ صاحب گشت کے لئے نکلے تو یہ طالب علم اپنے
کمرہ میں چھپا ہوا تھا درخت کے پتے کھا رہا تھا
'دریافت کرنے پر بتایا کہ حضرت نے امداد بند فرمائی
دی مرحوم پر گریہ طاری ہوگیا اور بہت دیر تک خود
اور طالب علم مصروف بکا رہے طالب علم کی خوش قسمی
کہ اسوقت آستانہ عالی سے کھانا جاری ہوا''۔

(لاؤ گل ص: ۳۵ مولانا انظر شاہ مسعودی............مکتبہ سنابل' دیوبند)

نظام دکن نے حافظ صاحب کو ریاست حیدرآباد میں مفتی اعظم کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا حکومت آصفیہ کے اس سب سے بڑے دینی منصب پر آپ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء سے ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء تک فائز رہے۔

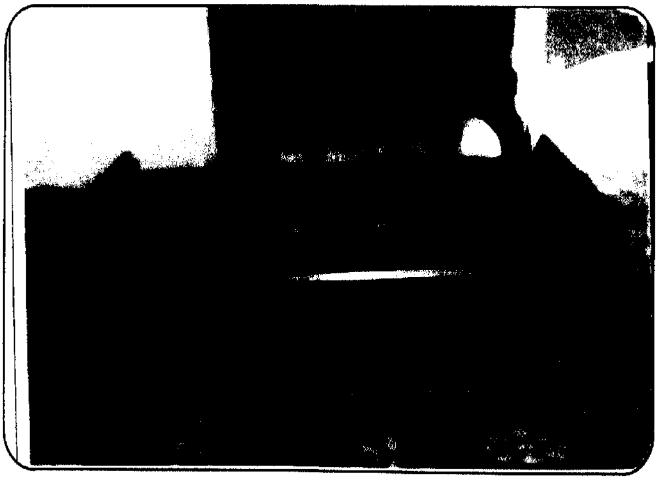
(تاریخ دارالعلوم ج:۲ ص:۲۳۱ سید محبوب رضوی.................مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

وفات :-

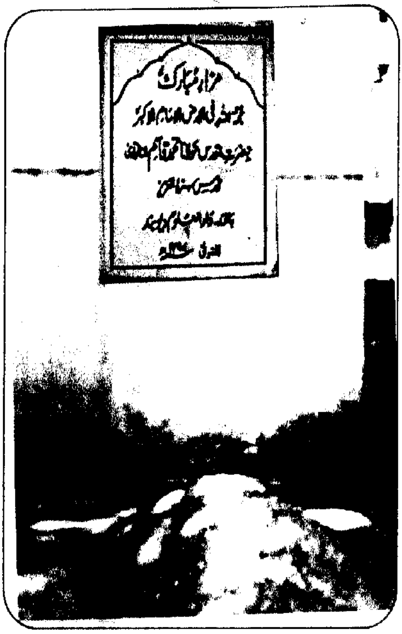
حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں آپ نے نظام حیدرآباد کو دارالعلوم دیوبند آنے کی دعوت دی تھی، انہوں نے منظور فرمالی کہ دہلی آئیں گے تو دیوبند بھی آئیں گے ۱۳۴۷ھ میں نظام کے دہلی آنے کی توقع تھی، آپ وعدے کی یاددہانی کے لئے کمزوری کے باوجود حیدرآباد تشریف لے گئے، لیکن حالت مسلسل بگڑتی گئی حتی کہ نظام سے ملے بغیر ہی دیوبند واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستہ میں ٹرین ہی میں ۳/ جمادی الاولی ۱۳۴۷ مطابق ۱۹۲۸ء کو انتقال فرمایا، اسٹیشن پر جنازہ تیار کیا گیا اور نظام کی خواہش پر جنازہ حیدرآباد لایا گیا اور وہی دفن کئے گئے۔



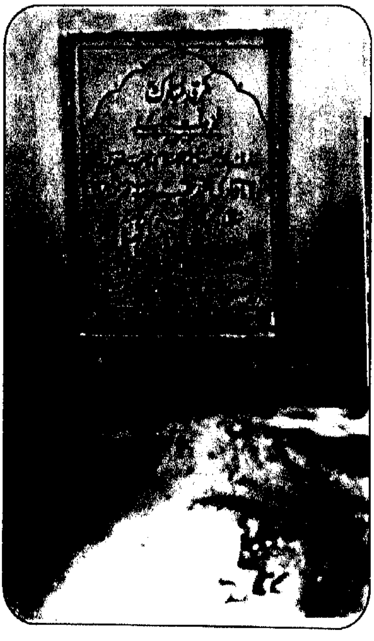
حضرت قاری صاحب کے مکان کے اندرونی و بیرونی مناظر



حضرت قاری صاحب کا وہ ڈیکس جس پر آپؒ نے 138 سے زائد تحریریں لکھیں۔



مزارِ مبارک مولانا قاسم نانوتویؒ



مزارِ مبارک مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

باب دوم

تعلیم و تربیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب دوم تعلیم وتربیت

اس طویل مقالہ کے پہلے باب میں ہم نے حضرت قاری محمد طیب صاحب کے خاندانی حالات کوتفصیل سے لکھا ہے، چونکہ خاندانی ماحول کے تناظر میں شخصیت کے مزاج اور خارجی اثرات وداخلی کیفیات اور داعیات قلبی ان سب کا سمجھنا آسان ہوتا ہے،اس لئے خاندان کا سیرت کی تشکیل میں اہم کردار ہوتا ہے نیز ان سب تفصیلات سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ قاری صاحب نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ ماحول علمی اور ایک لحاظ سے سر برآوردہ تھا،اس لئے کہ قاری صاحب کے دادامرحوم قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی،جن کے علوم کا دنیالوہامان چکی ہے،اورقاری صاحب کے والدمولانا محمداحمد صاحب کوشمس العلماء کا خطاب ملاتھااوروہ حیدرآباد میں محکمۂ قضاء کے قاضی اور مفتی تھے،اس لئے خاندان علمی ہونیکے ساتھ ساتھ سر برآوردہ بھی تھا۔

اب ہم دوسراباب شروع کرتے ہیں جس میں تعلیم وتربیت کا جائزہ لیاجائے گا،حضرت قاری صاحب کی تعلیم وتربیت کا جائزہ اس لئے ضروری ہے،تاکہ معلوم کیا جائے کہ جن شخصیات سے تعلیم حاصل کی گئی ہے وہ کس سطح کے مدرسین اورفضلاء تھے تاکہ ان کی شخصیت کی روشنی میں،قاری صاحب کی شخصیت کودیکھاجاسکے،اس کے ساتھ تربیت کا بھی جائزہ پیش کیاجائے گا،کیونکہ جس ماحول میں تربیت دیجاتی ہے،شخصیت پراس ماحول کے نمایاں اثرات ہوتے ہیں اس لئے کے تربیت کا اثرشخصیت کی پوری زندگی میں دائروسائر رہتاہے اورتربیت کا اثر بالخصوص شعروادب پر پڑتا ہے.

نانوتہ کا جغرافیائی مقام:۔

قصبہ نانوتہ کا کچھ اجمالی تذکرہ باب اول میں بھی آچکاہے،یہ مغربی یوپی کے ضلع سہارنپور کاایک چھوٹاساقصبہ ہے۔

(مولانا قاسم صاحب حیات اورکارنامے،ص:۳۲۔از:اسیرادروی،مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

یہ قصبہ اپنے محل وقوع آبادی اور تاریخی عمارات اور آثار کی وجہ سے قطعاً لائق توجہ نہیں ہے لیکن اس چھوٹی سی بستی نے انقلاب آفریں شخصیات دنیا کو دیں، اور ایسے مشاہیر اہل علم پیدا کیے جن کا فیضان کرم ہندوستان بھر میں عام ہوا۔

نانوتہ کی وجہ تسمیہ:-

نانوتہ کب آباد ہوا، اور اس کا نام نانوتہ کیوں پڑا؟ اس سلسلہ میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ لالہ نند کشور پرساد نے ۱۸۶۸ء میں سہارن پور کی ایک تاریخ لکھی ہے، اس تاریخ میں یہ وجہ تسمیہ لکھی ہے کہ کسی زمانہ میں اس جگہ ''نانو،، نام کا کوئی گوجر یا راجپوت آباد تھا اسی کی طرف منسوب ہوکر اس جگہ کا نام نانوتہ پڑا اور یہی بات جغرافیہ ضلع سہارنپور میں لکھی ہے۔

(جغرافیہ سہارنپور ص ۲۲۔ مرتبہ: ذاکر بیگ نانوتوی...... مطبوعہ سہارنپور)

لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی اس وجہ تسمیہ کو پسند نہیں فرماتے وہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک یہ وجہ تسمیہ افواہی روایات
چنداں دلآویز نہیں معلوم ہوتی،،

(سوانح قاسمی حاشیہ: ج ۱ ص ۵۲ از: مناظر احسن گیلانی...... مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

گیلانی صاحب کی رائے زیادہ اچھی نہیں ہے، کسی جگہ کے نام میں تہذیب اور سلیقہ مندی کو مدنظر نہیں رکھا جاسکتا، عموماً بستیوں کے نام کے سلسلہ میں یہی قدیم رواج ہے کہ کسی شخص کی زبان پر کوئی نام آگیا خواہ وہ نام کسی قوم کے وہاں آباد ہونے کی بنا پر ہو، یا وہ نام کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ عوام میں اسی نام کا چلن ہو جاتا ہے، اس کا مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے چنانچہ نورالحسن راشد لکھتے ہیں:-

''مگر مولانا کا یہ ارشاد بے محل ہے، کیونکہ اس دور کی
آبادیوں اور مقامات کے نام عموماً اس طرح کے
ہوتے تھے، اس میں دل آویزی اور پسندیدگی عوام
کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس طرح کی

اکثر آبادیوں اور بستیوں کے نام باقاعدہ رکھے اور
طئے نہیں کئے گئے' بلکہ کسی جگہ چھوٹی موٹی آبادی
ہوگئی اور عوام کی زبان پر اس کا ایک نام آگیا، وہی
چل گیا اسی کو عام شہرت اور عام مقبولیت ہوگئی۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی: ۵۲/از نور الحسن راشد...... مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

پھوٹا شہر:-

کسی زمانہ میں ''نانوتہ'' کے علاوہ اس کو ''پھوٹا شہر'' بھی کہا جاتا تھا۔ اس نام کے پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ علاقہ دسویں' گیارہویں صدی میں بہت پر رونق اور آباد تھا اور اورنگ زیب عالم گیر کے دور حکومت تک شاداب رہا، اورنگ زیب کے بعد مغل اقتدار میں ابتری آئی اس وقت یہاں کے حالات بھی خراب ہوگئے۔ کئی مرتبہ ظالم حملہ آوروں کے حملوں کی وجہ سے یہ قصبہ اجڑا ہے خصوصاً نواب جلال خاں (بانی جلال آباد ضلع مظفر نگر یوپی) اور سکھوں کے مذہبی پیشوا گرو گوبند سنگھ کے درمیان ایک شدید جنگ میں تباہ و برباد ہوگیا۔

(تذکرہ مظہر نانوتوی: ص/۱/از نور الحسن راشد............ مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اسکے بعد تقریباً پچاس سال ویران رہا ان حملوں کی تاب نالاکر سرمایہ دار لوگ دوسری جگہ منتقل ہوگئے اور اپنی شاندار حویلیاں اور مکانات یونہی ویران چھوڑ گئے، اگر رہے تو وہ لوگ جو غریب تھے، منتقل ہونے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ ہر وقت ویرانی اور سناٹا رہنے لگا، اسلئے لوگ اس کو ''پھوٹا شہر'' کہنے لگے۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی: ۵۴/از نور الحسن راشد...... مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

جغرافیہ ضلع سہارنپور کے مؤلف ماسٹر ذاکر بیگ نانوتوی نے بھی یہی وجہ لکھی ہے:

''بہت سے کہنہ مکان منہدمہ غیر آباد پڑے ہوئے
ہیں، اسی وجہ سے اس کو پھوٹا شہر کہتے ہیں''

(جغرافیہ ضلع سہارنپور: ص/۲۲: ذاکر بیگ نانوتوی............ مطبوعہ سہارنپور)

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بھی اپنی ایک تحریر میں نانوتہ کو پھوٹا شہر لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بعض جگہ بعض چیزوں میں مشہور ہیں، جیسے میری
بستی کیرانہ اورنانوتہ جس کے رہنے والے مولوی
قاسم اورمولوی یعقوب وغیرہم تھے،نحوست
میں مشہور ہے، کہ عوام صبح کوان کانام بھی نہیں لیتے
ہیں۔کیرانہ کو بیریوں والا شہر اورنانوتہ
کوپھوٹاشہر کہتے ہیں''۔

(تحریر برتقدیس الوکیل بحوالہ تذکرہ مظہرنانوتوی:ص۲/مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈیمی کاندھلہ)

حقارت اورذلت کی نظر:۔

لوگ اس قصبہ کوحقارت اورذلت کی نظر سے دیکھنے لگے،اس کومنحوس سمجھنے لگے،حتی کے صبح کوکوئی ''نانوتہ'' کالفظ اپنے منہ سے بول دیتاتوخیال کیاجاتاتھاکہ اب دن بھراس کوروٹی نصیب نہیں ہوگی۔مولاناگیلانی نے لکھاہے:

''خیال یہ پھیلاہواتھاکہ صبح سویرے باسی
منہ''نانوتہ'' کالفظ جس کے منہ سے نکل جاتاہے
دن بھرروٹی سے پھراس کی ملاقات ناممکن
ہوجاتی ہے،گویاہمزلف آبادیوں میں وہ منحوس
ٹھہرایاگیاتھا''۔

(سوانح قاسمی:ج/۱:ص۵۳/از:مناظراحسن گیلانی..........مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

عجیب نکتہ:۔

ظاہرہے جب لوگوں نے اس قصبہ کومنحوس ہی سمجھ لیا،اورعام وخاص مجلسوں میں اس کاتذکرہ اسی لحاظ سے کیاجانے لگاتوکچھ باشندوں کوبرالگا،اوروہ لوگ ''پھوٹاشہر'' کہنے والوں پربرہم ہونے

لگے تو حضرت نانوتوی نے ایک مرتبہ فرمایا کہ بھائی یہ بگڑنے کی کیا بات ہے، بلکہ اس نام سے تو خوش ہونا چاہئے، ہندوستان میں گنتی ہی کے تو چند مقامات ایسے ہیں جن کے آخر میں ''شہر'' لفظ جزبنا ہوا ہے۔ ''مثلاً بلند شہر مچھلی شہر۔ ان ہی میں آپ کا یہ چھوٹا شہر بھی ہے، یہی فخر کیا کم ہے کہ ''شہرت'' کو لوگوں نے اس کے قوام حقیقت میں داخل کر دیا ہے۔

(سوانح قاسمی حاشیہ۔ ج:۱ص/۵۳/از: مناظر احسن گیلانی......مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

نانوتہ کا قیام:-

یہ بستی کب اور کیوں وجود میں آئی؟ اس بارے میں کسی مؤرخ نے کوئی حتمی بات نہیں کہی ہے، صرف مولانا گیلانی نے لالہ نند کشور کے حوالے سے اتنی بات کہی ہے: کہا جاتا ہے کہ تقریباً آٹھ نو سو سال پہلے نانو نام کے کسی گوجر یا جاٹ کے نام پر یہ بستی آباد ہوئی۔

(سوانح قاسمی حاشیہ۔ ج:۱/ص۵۲/از: مناظر احسن گیلانی......مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اگر یہ اطلاع درست ہے تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ بستی ایبک یا التمش کے عہد کی یادگار ہے، نورالحسن راشد صاحب لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ بستی دہلی میں مسلم حکمرانی
> کے ابتدائی دور (ایبک یا التمش کے عہد) کی یادگار
> ہے مگر اس وقت اس کی کیا حیثیت تھی، کس قدر آباد
> تھی اور اس کی آبادی کی کیا وجہ تھی کچھ معلوم نہیں''۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی: ص/۵۲/از نورالحسن راشد۔ مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اس بستی کے قیام کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی دور کے کسی بھی مؤرخ نے اس بستی کو لائق ذکر نہیں سمجھا، اس بستی کا ذکر سب سے پہلے ابوالفضل نے اپنی مشہور کتاب آئین اکبری میں کیا ہے۔

اکبر بادشاہ کے دور میں علاقہ کی معاشی اور انتظامی تربیت وتقسیم میں، سرکار سہارنپور کے تحت ۳۶/ پرگنوں میں سے ایک پرگنہ نانوتہ تھا ابوالفضل نے لکھا ہے؛

''سرکار سہارنپوری وشش محل، چہار دستور، دیوبند
وغیرہ بست وشش یک دستور''

(آئین اکبری فارسی: ۲۹ دفتر اول سرسید اڈیشن نقل از استاذ الکل: ص ۵۳/......
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

ابوالفضل کی مزید تفصیل سے پتہ چلتاہے کہ اس پرگنہ کا آبادرقبہ جس میں کاشتکاری ہوتی تھی (۲۹۲۲۴) بیگھے پر مشتمل تھا، اور سائرات وغیرہ کی زمین آبادرقبہ سے بہت زیادہ تھی دستور کے مطابق اس پرگنہ میں حکومت کی طرف سے چالیس سوار اور تین سو پیادے مقرر تھے جو عموماً افغانی تھے۔

(آئین اکبری فارسی: ۲۹ دفتر اول سرسید اڈیشن نقل از استاذ الکل: ص ۵۳/............
مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اکبر بادشاہ کے دور میں اس بستی کی شہرت کسی نہ کسی درجہ میں ہونے لگی تھی، اس دور میں اس بستی کے چند شہرت یافتہ افراد کا تذکرہ ملتاہے ظاہر ہے ان کی وجہ سے اس بستی کو بھی شہرت حاصل ہوئی لالہ نندکشور نے اپنی تاریخ سہارنپور میں اکبر ہی کے زمانہ کے ایک بزرگ سید احمد نامی کا ذکر کیاہے۔ جو نانوتہ میں کافی مشہور معزز ہستی شمار ہوتے تھے۔ ان ہی سید صاحب کے صاحبزادے سید مصطفیٰ جہانگیر کے زمانہ میں اچھے ممتاز درویشوں میں گنے جاتے تھے اس علاقہ کا صوبہ داران کی بڑی عزت کرتا تھا۔

(سوانح قاسمی حاشیہ: ج ۱/ص: ۵۵/از: مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

نانوتہ پر حکومت کرنے والے سربراہ:-

نانوتہ کب کس بادشاہ، نواب راجہ یا صوبہ دار کے زیر انتظام رہا اس بارے میں کوئی واضح اطلاعات نہیں ہیں، دستیاب اطلاعات یہ ہیں کہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں تیمور نے اس علاقہ کا خونی سفر کیا اور قتل وغارت گری کرتا ہوا یہاں سے گزرا۔ ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں سلطانی خضر خان نے سہارنپور کا علاقہ سید سالم کے تصرف میں دیدیا۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی: ص ۵۲/از نور الحسن راشد............
مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ

اور چونکہ ایک زمانہ تک نانوتہ کا انتظام وانصرام سہارنپور کے تحت ہی رہا ہے تو امید ہے کہ یہ علاقہ بھی سید سالم کے تصرف میں ہی آ گیا ہوگا۔

اکبر بادشاہ کے زمانہ میں یہ علاقہ صوبہ دہلی کے ماتحت آیا، جس کے چھتیس پر گنے تھے۔ان پرگنوں میں سے پندرہ پرگنے موجودہ ضلع مظفرنگر کے تھے۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی:ص۵۳/از:نورالحسن راشد، مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

مغلوں کے دور شباب تک اس کی یہی حیثیت رہی، ہمارا خیال ہے کہ جب اورنگ زیب کے بعد اقتدار میں ابتری آئی، تو اس علاقہ پر متعدد بار مختلف حکمرانوں نے حملہ کئے ہیں ہم اس کو بالتفصیل لکھ چکے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغلوں کے سکراتی دور کے آغاز کے بعد نانوتہ مختلف فرمانرواؤں کے تحت رہا ہے۔

اسی طرح نواب جلال خاں (بانی قصبہ جلال آباد ضلع مظفرنگر یوپی) اور سکھوں کے مذہبی پیشوا گرو گوبند سنگھ کے درمیان ایک شدید جنگ میں نانوتہ تباہ ہوگیا۔

(تذکرہ مظہر نانوتوی:ص/از:نورالحسن راشد............مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اس تاریخی واقعہ سے اشارہ ملتا ہے کہ نواب جلال خاں کے بھی یہ علاقہ زیر اثر رہا ہے۔ہم نے باب اول میں خاندان حضرت نانوتوی کے نانوتہ آمد کے تحت تفصیل سے لکھا ہے کہ نویں صدی ہجری میں حضرت نانوتوی کے جدامجد شیخ مظہر الدین کی شہرت ہندوستان پہونچی، اس وقت یہاں بہلول لودھی تخت نشین تھا، اس کا بیٹا سکندر لودھی علماء اور صلحاء سے محبت رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ منتخب علماء ہندوستان میں جمع ہوں، چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اطلاع کے مطابق ان کو ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی اور تقریباً ۸۷۸ھ میں تشریف لائے اور جہاں آباد کے قاضی مقرر کئے گئے اور وہی وفات پائی۔

اس وقت نانوتہ کے اطراف میں کچھ سرکش قبیلے آباد تھے، ان کی سرکشی ختم کرنے کیلئے سکندر لودھی نے شیخ مظہر الدین کے صاحبزادے قاضی میراں بڑے کو یہاں کا انتظام سپرد کیا تھا، اس تاریخی اقتباس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں سکندر لودھی کا بھی تسلط رہا ہے۔

۱۸۰۳ء(۱۲۱۸ھ) کو دہلی جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آ گیا تو یہ علاقہ بھی ایسٹ

انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آ گیا،اس وقت تک سہارنپور کو اس علاقہ کی انتظامی تقسیم میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔۱۸۲۴ء میں مظفر نگر مکمل ضلع کی حیثیت دی گئی تو اس وقت سہارنپور کے نانوتہ پرگنہ کے بہت سے گاؤں ضلع مظفر نگر میں شامل کر دیئے گئے۔اور ۱۸۴۲ء میں تقسیم کی وجہ سے نانوتہ کی پرگنہ کی حیثیت ختم ہو گئی۔

نانوتہ میں ۱۹۰۵ء میں میونسپل نظام قائم ہوا اور ۱۹۱۱ء میں پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا تھا۔۱۹۱۴ء میں نانوتہ کو ٹاؤن ایریا قرار دیا گیا اور ۱۹۷۳ء میں نوٹیفائڈ ایریا بنا دیا گیا۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی:ص ۵۵۔۵۶/از:نور الحسن راشد،مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

نانوتہ کے ممتاز خاندان:-

ہم لکھ چکے ہیں کہ نانوتہ میں مسلمان کب آباد ہوئے اس سلسلہ میں کوئی واضح روایت نہیں ملی،لیکن یہاں کے قدیم خاندانوں میں دو خاندان بہت مشہور ہوئے،ایک سادات کا،دوسرا صدیقی شیوخ کا۔نور الحسن راشد صاحب ان دونوں خاندانوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"یہ دونوں خاندان کئی نسلوں بلکہ صدیوں تک
معرفت وارشاد میں ممتاز اور علم وتربیت میں نامور
ہے مغلوں کے ابتدائی عہد میں خاندان سادات
کے اصحاب اوج کمال پر پہنچے اور مغلوں کے دور
واپسیں میں صدیقی گھرانے پر بہار آئی"

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی:ص ۵۵۔۵۶/از:نور الحسن راشد۔..........

مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

ان خاندانوں میں صدیقی خاندان کے حالات ہماری بحث کا محور ہیں ہی۔چونکہ حضرت قاری محمد طیب صاحب اسی خاندان کے گل سر سبد تھے،رہا خاندان سادات تو اس خاندان نے علم وتربیت سے لے کر معرفت وارشاد ہر جگہ شہرت حاصل کی ہے،البتہ ان کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہیں۔اس خاندان کے اہم لوگوں میں سید شاہ غلام نانوتوی،مولانا سید شاہ صابر علی نانوتوی،اور سید احمد مدنی

کا نام لیا جاتا ہے، جنہوں نے شریعت وطریقت دونوں شعبوں کی سنہری تاریخ رقم کی ہے۔

نانوتہ کا علمی ماحول:۔

حضرت نانوتوی کا خاندان جب نانوتہ میں آباد ہوا اس وقت وہاں کا علمی ماحول کیا تھا یا بعد میں کیا رہا، اس سلسلہ میں بھی کوئی واضح اطلاعات نہیں ملتی ہیں۔ ہم نے جو مطالعہ سے سمجھا ہے اس کو لکھتے ہیں:

ہم نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اس خاندان کے جد اعلی قاضی مظہر الدین صاحب علم تھے، ان کی علمی شہرت کی بناء پر ہی سکندر لودھی نے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی اور جہاں آباد کا قاضی مقرر کیا، اس کے بعد ان کے صاحب زادے قاضی میرا بڑے کو نانوتہ کا علاقہ سپرد کیا گیا تھا، یہ بھی عالم، فاضل تھے، ان کے بعد ان کی اولاد میں علم منتقل ہوا؛ یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، قرین قیاس یہی ہے کہ قاضی میراں بڑے نے اپنی اولاد کی علمی تربیت بھی کی ہوگی۔ اور اس وقت کے نانوتہ کے احوال کا تقاضہ بھی یہی ہے، اس لئے قاضی میراں بڑے نے ۱۴/ رجب ۹۰۲ھ مارچ ۱۴۹۷ء کو نانوتہ میں وفات پائی۔

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی: ص ۵۵۔۵۶/ از: نور الحسن راشد.................. مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اور اسی دسویں صدی میں سید احمد نانوتوی موجود تھے، اور ان کی شہرت کے بارے میں لالہ نند کشور کے حوالہ سے ہم لکھ چکے ہیں، یہ اپنے زمانہ کے صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے شیخ عبد القدوس گنگوہی کے بھی ان سے مراسم تھے۔ اور ان کے صاحب زادے شیخ مصطفٰی نانوتوی بھی علم ومعرفت میں اچھا مقام رکھتے تھے، جغرافیہ سہارنپور میں لکھا ہے:

> ان کے بیٹے سید مصطفٰی جہانگیر بادشاہ کے وقت
> میں معزز درویش تھے۔

(جغرافیہ سہارنپور: ص ۲۲/ از: ذاکر بیگ نانوتوی............ مطبوعہ سہارنپور)

ان کے بعد گیارہویں صدی میں سید شاہ غلام نانوتوی متوفی ۱۰۳۰ھ کا نام ملتا ہے، کمال سنبھلی

نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''صاحب ذوق، وجد بود''

(تذکرہ استاد الکل مولانا مملوک العلی: ص ۶۰ /از: نور الحسن راشد، مطبوعہ الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

ان کے بعد مولانا صابر علی نانوتوی متوفی ۱۰۵۱ھ کا نام ہے انہی کے ملفوظات کے ایک مرتب نے ''اعظم علمائے عصر اور اتقیائے دھر'' میں ان کا شمار کیا ہے۔ شیخ جیون نانوتوی گیارہویں صدی کے بڑے عالم گزرے ہیں، ان کے علاوہ بے شمار نام ہیں جو زمانہ میں علم ومعرفت کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے، ان حضرات کی موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی میراں بڑے کی اولاد میں علم منتقل ہوا ہے۔ شاہ جہاں کے دور میں حضرت قاری صاحب کے جد اعلیٰ مولوی محمد ہاشم کا نام ملتا ہے جن کے بارے میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''وہ خود تو عالم وفاضل تھے''

(سوانح قاسمی: ج ۱/ ص ۔ ۱۷ گیلانی............مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند)

ان مولوی ہاشم کے بعد انہی کے ایک پوتے کا نام مولوی یعقوب صاحب نے ''محمد مفتی'' لکھا ہے۔ اس میں ''مفتی'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فتوی نویسی کا کام کرتے تھے۔ یہاں تک تو یہ تاریخی ثبوت محفوظ ہے کہ علمی ماحول کسی نہ کسی شکل میں باقی رہا۔ لیکن بادشاہ عالمگیر کے بعد مغل اقتدار تشیع کا شکار ہو چکا تھا، خود بہادر شاہ ظفر جو ستر سال کی عمر میں بادشاہ ہوا تھا، تشیع سے متأثر تھا (سوانح قاسمی: ج ۱/ ص ۵۹ گیلانی مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند) اس دور میں صاحب منصب لوگ بھی اس فتنہ سے متأثر ہوئے اس کے بعد کے حالات مولانا گیلانی سے سنئے:۔

''اور اس کے بعد پے در پے ایسے حالات مسلسل
رونما ہوتے رہے جن کا لازمی نتیجہ تھا کہ نہ صرف
مرکز بلکہ صوبوں پر بھی انہی لوگوں کا سیاسی اقتدار
قائم ہو گیا جو کھلم کھلا شیعہ تھے، ورنہ تشیع کی طرف
رجحان کے مرض سے تو شاید ہی اسی زمانہ کی کوئی

قابل ذکر ممتاز ہستی پاک نظر آئی"

(سوانح قاسمی: ج ارص ۶۰ گیلانی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اس فتنہ سے نانوتہ بھی محفوظ نہ رہ سکا اور یہاں بھی تشیع کو فروغ ہوا ماحول اس قدر تبدیل ہوا کہ شیعہ اور سنی آپس میں رشتہ داریاں بھی کرنے لگے حضرت نانوتوی لکھتے ہیں:

"بس ازاں عرض کردم کہ بنواحی کہ زادو بوم احقر است، شیعیان وسنیان چناں مخلوط اندر کہ رشتہ ورابطہ قرابت طرفین رابطرفین محکم و مستحکم است"۔

ترجمہ۔"بعد اس کے میں نے عرض کیا کہ جس علاقہ میں احقر کا وطن ہے وہاں شیعہ وسنی دونوں فرقے باہم ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں کہ دونوں فرقوں میں رشتہ داریوں کے تعلقات بھی مظبوطی کیساتھ قائم ہیں"

(فیوض قاسمیہ: ص ر۵ مولانا محمد قاسم نانوتوی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اور یہ تو احوال ہیں نانوتہ اور اس کے ہم زلف آبادیوں کے۔خود حضرت کے خاندان کے ہی شیخ تفضّل حسین شیعہ ہوگئے تھے۔اس سلسلہ میں ہم ان کے قتل کا واقعہ بھی بیان کر چکے ہیں، ان اطلاعات کی موجودگی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں علم کا زور کم ہوگیا تھا اور جہالت نے پاؤں پھلادئے تھے ہمارے دعوے کی بنیاد حضرت نانوتوی کے خاندان کے چند نام ہیں، جیسے شیخ محمد بخش اور خواجہ بخش، یہ نام گواہ ہیں کہ اس وقت مسلمانوں نے یہ تمیز بھی کھودی تھی کہ اولاد بخشی کی قوت اللہ تعالی سے وابستہ ہے یا نہیں؟ مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"اسی زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی شیخ محمد بخش جن کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ

میں رکھنے والوں نے ان کا یہ نام رکھا تھا، اس وقت
مسلمان اسکی تمیز بھی کھو بیٹھے تھے کہ اولاد بخشی کی
قوت خالق تعالی جل مجدہ کی ذات واحد کے ساتھ
وابستہ ہے یا نہیں، اس کا نتیجہ تھا کہ باوجود مومن
ومسلم ہونے کے اس معاملہ میں لاپروائیوں سے
کام لینے لگے تھے"۔

(سوانح قاسمی: ج:۱رص ۶۸............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

ہمارا خیال ہے کہ حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم عہدوں اور اقتدار پر اہل تشیع قابض ہو چکے تھے، اگر وہ اپنے اندر یہ تبدیلی نہ لاتے تو ان کی جائیداد چھین لی جاتی تھی" "تذکرہ کاملان رامپور" میں لکھا ہے کہ اودھ کے تسلط روہیل کھنڈ کے وقت امروہہ کے امرا نے تبدیل مذہب اور حاضری دربار کی بدولت اپنی جاگیروں کو قائم رکھا۔لیکن حالات کی اس قدر ابتری کے باوجود ایک جماعت ایسی بھی تھی جو شریعت وطریقت کو مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی، چنانچہ جب حضرت احمد شہید بریلوی "تطہیر پنجاب" کے لئے نکلے تو آپ نے نانوتہ میں بھی قیام فرمایا تھا اور آپ کے دست حق پر سیکڑوں لوگوں نے بیعت کی مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں:

"سید صاحب جب نانوتہ تشریف لائے
تھے، وہاں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے، ایک
مرید نے بیان کیا کہ میری آنکھوں میں پھر رہا ہے
کہ سید صاحب مسجد جامع کے وسطی دروازے
میں کھڑے ہیں، نہایت شکیل وجمیل تھے، اور آپ
نے اپنی پگڑی اتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ
میں لیکر باقی بیعت کرنے والوں کو پکڑوا دی لوگ
برابر دوسرے سرے تک اس کو پکڑے ہوئے تھے

اور پگڑی کن کھجورے کی شکل معلوم ہوتی تھی کیونکہ
دونوں طرف سے لوگ اس کو تھامے ہوئے تھے"

(تذکرۃ الرشید: ج ۲ / ص ۲۷۲ / از: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ...... مکتبہ دار الکتاب دیوبند)

یہ کھلی دلیل ہے کہ اس وقت بھی بڑی تعداد صحیح العقیدہ اکابر کے طریقہ پر تھی۔ اس کے بعد مولانا مملوک العلی کا دور آتا ہے ہم ان کے بارے میں باب اول میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں وہ ایک بڑے عالم تھے اور دہلی کالج کے مدرس تھے، آپ نے بے شمار لائق شاگرد چھوڑے اسی دور میں حضرت نانوتوی کے والد "اسد علی" بھی تھے وہ بھی مولانا مملوک العلی کیساتھ دہلی تعلیم حاصل کرنے گئے

(سوانح عمری: ص / ۲۴ / از: مولانا یعقوب نانوتوی.......... مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند)

اور شاہ نامہ تک تعلیم حاصل کی جو اس وقت بی، اے گریجویٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا مملوک العلی کی توجہ سے مولانا مظہر نانوتوی، احسن نانوتوی منیر نانوتوی یعقوب نانوتوی اور قاسم نانوتوی صاحب وغیرہ تیار ہو گئے پھر سے ایک بزم قائم ہو گئی، ان میں سے ہر ایک اپنے حلقہ میں پیشوا اور امام کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت نانوتوی شیخ کرامت علی کی صاحبزادی سے نکاح کے بعد دیوبند میں بھی قیام کرتے تھے البتہ قاری طیب صاحب کے والد محمد احمد صاحب نانوتہ میں پیدا ہوئے اور دار العلوم میں مدرس ہونے سے پہلے تک آپ کا تعلق نانوتہ سے بھی رہا ہے۔ مدرس ہونے اور اہتمام کی ذمہ داری کے بعد آپ نے دیوبند میں ہی قیام فرمایا، حضرت نانوتوی کا خاندان خالص علمی رہا ہے ظاہر ہے کہ اس کا اثر حافظ صاحب میں منتقل ہوا اور وہی علمی مزاج حضرت قاری محمد طیب صاحب میں بھی منتقل ہو گیا، اور اس کو پروان چڑھایا دار العلوم دیوبند کے علمی ماحول اور اساتذہ کی تربیت نے، اگر ہم یہ بات کہیں تو حق بجانب ہوگا کہ قاری صاحب میں اصل بیج نانوتہ اور ان کے خاندان کے علمی ماحول نے ڈالا اور اس کو تناور شجر بنا دیا دار العلوم دیوبند کے ماحول اور اساتذہ کی تربیت نے۔ عبد اللہ جاوید صاحب رقمطراز ہیں:

چونکہ پورا گھرانہ علم و فضل اور پاکیزہ اعمال و اخلاق

اورزہدوقناعت میں ڈوباہواتھا،کتاب وسنت
اورعلوم دینیہ کی اشاعت وتحفظ سے شغف رکھتا
تھا،اسی لئے قدرتی طورپرآپ کے دل ودماغ
اورفکرو ذہن کی نشوونمااسی علمی اوردینی ماحول
میں ہوئی۔

(مظلوم شخصیت ا/۲۶۳راز:اسعد صدیقی .... مطبوعہ ادارہ انوارالقرآن دیوبند)

تاریخ پیدائش:۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب کب پیداہوئے؟اس سلسلہ میں اقوال مختلف ہیں!کوثر نیازی نے آپ کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ھ لکھی ہے۔

(سہ ماہی حسن تدبیر دہلی نومبر تا اپریل ۲۰۰۷:ص/۵۱)

یہ تاریخ غلط ہے،کیونکہ آپ کا تاریخی نام ''مظفرالدین'' ہے جس سے ہجری سال ۱۳۱۵ھ نکلتاہے،اورشمسی سال ۱۸۹۷ءنکلتاہے۔رہی تاریخ تومفتی فضیل الرحمٰن نے تاریخ ۱۸/رجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۳/دسمبر ۱۸۹۷ءلکھی ہے۔(حکیم الاسلام قاری محمد طیب:ص/۲۱:مفتی فضیل الرحمان ہلال عثمانی مکتبۃ العزیز دیوبند)اکبرشاہ بخاری نے ماہ جون ۱۸۹۷ءمطابق محرم ۱۳۱۵ھ بتائی ہے۔

(ذکرطیب:ص/۲۸۔اکبرشاہ بخاری .... کتب خانہ دارالکتاب دیوبند)

بہرحال ۱۳۱۵ھ میں آپ دیوبند میں پیداہوئے،نام محمد طیب تجویزہوا،تاریخی نام مظفرالدین رکھاگیااورحضرت مولاناعبدالغنی پھلاودی شاگردحضرت نانوتوی نے تاریخی نام'' خورشیدقاسم'' تجویزفرمایا۔

مکتب کی بسم اللہ:۔

پیدائش کے بعدسات سال آپ نے گھرہی پرگزارے،اس درمیان آپ نے باقاعدہ تعلیم کاآغازنہیں فرمایا،جب آپ کی عمرسات سال کی ہوگئی تو ممتازبزرگوں کے ایک عظیم الشان اجتماع

میں مکتب نشینی کی تقریب عمل میں آئی

(تاریخ دارالعلوم:۲/۲۳۵۔محبوب رضوی......مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مکتب نشینی کی اس تقریب میں اکابر واسلاف جمع ہوئے جیسے:حضرت مولانا ذالفقارعلی صاحب دیوبندی متوفی ۱۳۲۲۔مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی متوفی ۱۳۲۸۔مفتی عزیزالرحمٰن صاحب متوفی ۱۳۴۷ھ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب متوفی ۱۳۴۸۔اورحافظ صاحب ان کے علاوہ اساتذہ دارالعلوم نے بھی شرکت فرمائی۔قاری صاحب کی بسم اللہ مولانا ذالفقارعلی نے کرائی جوشیخ الہندمحمودالحسن صاحب کے والداوراپنے زمانہ کے علم وفضل میں سب سے بلند تھے۔

(مظلوم شخصیت:۱/۲۶۴:اسعدصدیقی..........مطبوعہ مکتبہ انوارالقرآن دیوبند)

یہ ایک مبارک لمحہ تھا،مولانا فضل الرحمٰن عثمانی صاحب نے اس مبارک مجلس کی تاریخ ذیل کے قطعہ سے نکالی ہے:

حبذا مکتب طیب کی مبارک تقریب — کہ نئی طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر
رب یسّر جوکہااس نے تو بیروئے — ابافضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

۱۳۲۲ھ

(ذکرطیب:۶۹:اکبرشاہ بخاری..........کتب خانہ دارالکتاب دیوبند)

تعلیم وتربیت:۔

آپ نے مروّجہ تعلیم کے مطابق پہلے حفظ کیا آپ کے تذکرہ نگاروں میں محبوب رضوی،اکبرشاہ بخاری وغیرہ نے لکھاہے کہ! آپ نے دوسال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرأت وتجوید کے ساتھ حفظ کیا۔

(تاریخ دارالعلوم:۲/۲۳۵۔محبوب رضوی......مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

لیکن دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی ریکارڈ کی جورودادیں محافظ خانہ میں محفوظ ہیں ان میں سے ۱۳۲۶ھ کی روداد میں درجہ حفظ قرآن میں آپ کانام اس طرح درج ہے!''قاری محمدطیب پسر مہتمم مدرسہ ہذا''اوراس کے آگے صراحت ہے''قرآن شریف تمام''اس کامطلب یہ ہے کے شعبان ۱۳۲۶ھ

میں آپ حفظ سے فارغ ہوئے، اور ابھی ہم نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا قطعہ پیش کیا ہے جس سے آپ کی مکتب نشینی کی تاریخ ۱۳۲۲ھ نکلتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ۴ سال میں حفظ مکمل کیا، رودادوں کی روشنی میں یہی اطلاع درست معلوم ہوتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں درجہ تجوید کا اجرا:۔

آپ کے والد محترم کا شروع سے یہی جذبہ تھا کہ قاری صاحب ابتدا سے ہی ایسے حافظ کے پاس حفظ شروع کریں جو بہترین قاری بھی ہو، چنانچہ حضرت تھانوی کے مشورہ کے بعد مولانا قاری حافظ عبدالوحید صاحب الہ آبادی کا انتخاب عمل میں آیا۔ جب قاری عبدالوحید صاحب دارالعلوم تشریف لائے تو حضرت شیخ الہند نے یہ مشورہ دیا کہ اب دارالعلوم میں افادۂ عام کے لئے شعبہ تجوید کھول دیا جائے، چنانچہ اس رائے پر عمل کیا گیا اور حضرت قاری صاحب اس شعبہ کے سب سے پہلے طالب علم قرار پائے۔ اور شعبہ کے قیام کے بعد دارالعلوم نے یہ ضابطہ بنادیا کہ ہر طالب علم کم از کم ایک سال روزانہ ایک گھنٹہ تجوید کی مشق کرے۔ قاری صاحب نے فن تجوید میں کافی مہارت حاصل کرلی اور ''قاری'' آپ کے نام کا جز بن گیا۔ اسی دور کی بات ہے اساتذہ دارالعلوم اور طلبہ آپ سے قرأت سنتے تھے، حضرت گنگوہی کبھی دیوبند تشریف لاتے یا آپ گنگوہ حاضر ہوتے تو حضرت گنگوہی آپ سے قرآن ضرور سنتے تھے، آپ نے حفظ سے فراغت تو ۱۳۲۶ھ میں ہی حاصل کرلی تھی جیسا کہ روداد کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے، لیکن تجوید درجہ فارسی اور عربی کے سالوں میں بھی پڑھتے رہے۔

آپ نے دارالعلوم کے ریکارڈ کے مطابق اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی شائقین حضرات وہ تمام تفصیل ''مظلوم شخصیت'' میں مع نقشہ سن وار ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

درجہ فارسی میں داخلہ:۔

دارالعلوم کی روداد کے مطابق ۱۳۲۷ھ میں آپ نے درجہ فارسی میں داخلہ لیا، اور تین سال مسلسل پڑھنے کے بعد شعبان ۱۳۲۹ھ میں فارسی کا نصاب مکمل کرلیا۔ ان تینوں سالوں میں ابتدائی کتابوں کے سے لیکر درجہ انتہا تک فارسی کی تمام کتابیں پڑھیں، البتہ ۱۳۳۰ کی روداد میں بھی عربی

کتابوں کیساتھ چند فارسی کتابوں کے پڑھنے کا تذکرہ ملتا ہے مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے آپ کی درجہ فارسی کی تعلیم پانچ سال بتائی ہے، لکھتے ہیں:

''حفظ قرآن اورقرأت وتجوید کی تکمیل کے
بعد دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی وریاضی میں
داخلہ ہوا، اوراس کا پانچ سالہ نصاب مکمل کر کے
سندفراغت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کے درجہ
فارسی کے پانچ سالہ نصاب میں فارسی کی ابتدائی
کتابوں سے اعلی درجہ تک کی بڑی بڑی کتابیں
پڑھائی جاتی تھیں، جن میں گلستان، بوستان، مثنوی
مولانا روم، سکندر نامہ انوار سہیلی اور فارسی گرامر میں
احسن القواعد نمبر ۵''

(حکیم الاسلام: ص۲۴ رمفتی فضیل الرحمان عثمانی.........مکتبۃ العزیز دیوبند)

عثمانی صاحب کی یہ اطلاع درست نہیں ہے، اس لئے کہ ہمارے سامنے دارالعلوم کا ریکارڈ ہے، چنانچہ ۱۳۲۷ھ میں آپ نے فارسی کی درج ذیل کتابیں پڑھیں، مفیدنامہ، صفوۃ المصادر، گفتگونامہ، مفیدالانشاء، حمد باری، کریما، تشریح الحروف، حکایات لطیف اور تقسیم حساب بسیط تک۔ ۱۳۲۸ھ میں یہ کتابیں پڑھیں: پندسودمند، مصدر فیوض رقعات نظامیہ، گلستان سعدی، حساب کسور عام۔ ۱۳۲۹ھ میں ان کتابوں کا امتحان دیا: بوستان سعدی، رقعات عالمگیری، احسن القواعد، حساب کسوراعشاریہ وغیرہ۔ ۱۳۳۰ھ میں ان کتابوں میں کامیابی حاصل کی: رقعات امان اللہ حسینی، احسن القواعد، انوار سہیلی، تحریر اقلیدس مقالہ اول، حساب اربع سے شراکت تک۔

ان تفصیلات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ قاری صاحب نے فارسی تعلیم زیادہ سے زیادہ چار سال حاصل کی ان چار سالوں میں اتنی استعداد پیدا ہوگئی تھی، کہ آپ برجستہ فارسی میں تقریر اور گفتگو کر لیتے، جب ۱۳۵۸ھ میں ظاہر شاہ تخت نشین ہوئے تو دارالعلوم میں بھی تبریک اور تہنیت

کا جلسہ منعقد ہوا، اور حضرت قاری صاحب روابط کو مضبوط بنانے کیلئے دارالعلوم کے نمائندہ کی حیثیت سے افغانستان تشریف لے گئے: محبوب رضوی لکھتے ہیں:

> ''اس طرح ظاہر شاہ کی تخت نشین پر بھی تبریک وتہنیت کا جلسہ منعقد ہوا، اس موقعہ پر مجلس عاملہ نے طے کیا کہ دارالعلوم اور افغانستان کے قدیم علمی اور تعلیمی روابط کی تجدید اوران کو مستحکم بنانے اور تبریک اور تہنیت کے پیغام کو حکومت افغانستان تک پہنچانے کیلئے مہتمم صاحب دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے کابل تشریف لے جائیں''

(سوانح قاسمی: ۱/۲۹۵: مولانا گیلانی............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

وہاں پر آپ نے دارالعلوم دیوبند کا تعارف اور دارالعلوم کے افغانستان کے ساتھ تعلق پر فارسی میں ہی تقریر کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فارسی زبان سے آپ کو مناسبت طبعی ہوگئی تھی، چنانچہ اس کی انتہا یہ ہے کہ آپ کا خاصا فارسی شعری کلام موجود ہے ان شاء اللہ ہم پانچویں باب میں اس پر گفتگو کریں گے۔

عربی کی تکمیل:۔

قاری صاحب نے عربی کی ابتداء ۱۳۳۰ھ سے کردی تھی۔ اس سال آپ نے صرف میر، علم الصیغہ، وغیرہ شروع کردیں تھیں۔ اور ۱۳۳۷ھ کو قاری صاحب نے دورۂ حدیث شریف کی کتابوں کا اعلی نمبرات سے امتحان پاس کیا، اور سند فضیلت حاصل کی۔

حضرت قاری صاحب کی کچھ نمایاں خصوصیات:۔

حضرت قاری صاحب کو اللہ تعالی نے نمایاں خصوصیات سے نوازا تھا۔ اور آپ

کی یہ خصوصیات آپ کے علمی آباء واجداد اور سنجیدہ و باوقار اساتذہ کی صحبت سے حاصل ہوئی تھیں۔آپ ان موروثی خصوصیت و امتیازات کے علاوہ کچھ فطری اور ذاتی خصوصیات کے بھی مالک تھے،ان خصوصیات کی بناء پر آپ ہمیشہ ممتاز رہے خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں۔عقیدت مندوں کے ہجوم میں ہوں یا دوست واحباب کی بے تکلف مجالس میں۔

چائے میں شکر:۔

ان خصوصیات میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ بہت زیادہ میٹھی چائے نوش فرماتے تھے۔اس سلسلہ میں آپ کی عادت یہ تھی کہ چائے کے ہر کش کے بعد آپ کچھ شکر بقیہ چائے میں ضرور ملاتے تھے اور ہر کش میں پہلے سے تیز شکر کا ذائقہ لیتے تھے۔آپ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ چائے ہو تو میٹھی!ورنہ کھولا ہوا پانی پینے سے کیا فائدہ۔

پان بنانا:۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ کو پان کھانے سے زیادہ پان بنانے میں لذت محسوس ہوتی تھی،پان بنانے کا طریقہ انوکھا اور انفرادی تھا۔پہلے آپ پان کے پتے کو ایک چھوٹے چاقو سے چوکور تراشتے تھے،اسکے بعد پان کے اندرونی حصے کی باریک باریک رگوں کو چاقو سے صاف کرتے تھے۔اس عمل کے بعد بڑے سلیقہ سے چونے اور کتھے سے پان کو مزین کرتے تھے۔آپ کا یہ عمل کافی وقت میں پورا ہوتا تھا اور آپ اس عمل کے دوران حد درجہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ہم نے اپنے بعض اساتذہ سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ سفر میں ایک عقیدت مند ساتھ میں تھے آپ نے پان بنانے کا ارادہ کیا تو اس عقیدت مند نے اصرار کیا کہ میں بنا دیتا ہوں،حضرت منع فرماتے رہے اور وہ اصرار کرتا رہا ،آخر فرمایا:مولوی صاحب!''اصل مزہ تو آپ لے لو اور بکری کی طرح پتے چبانے کا کام ہم کریں''۔

دوران تقریر دستی رومال کی حرکت:۔

ہم نے اپنے مقالہ میں مختلف مقامات پر حضرت قاری صاحب کی تقریری صلا

حیت کو اجاگر کیا ہے اور ہم نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت قاری صاحب اپنے زمانہ کے واحد مقبول عام و خاص مقرر تھے، آپ کے خطبات کو آج بھی دیکھا جا سکتا ہے، ان میں سے بعض خطبات مستقل تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں مثلاً علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں سائنس کے طلباء کے درمیان کی گئی تقریر۔ سائنس اور اسلام کے موضوع پر مستقل تصنیف ہے آج بھی اس کو پڑھ کر سائنس کے میدان کے ماہرین انگشت بدنداں کہ ایک بوریہ نشیں عالم نے کیسے کیسے راز کھولے ہیں۔ آپ کی تقریر عام فہم، سہل اور مواد سے پُر ہوتی تھی، آپ کی خطابت کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ عام و خاص دونوں کی رعایت سے آپ مضامین کو بیان فرماتے تھے۔ ان سب امتیازات کے ساتھ آپ کی کچھ حرکات و سکنات بھی سامعین کے لئے دل چسپی کا سامان فراہم کرتی تھیں، مثلاً آپ تقریر کے دوران لال رنگ کا دستی رومال ہاتھ میں لئے ہوتے تھے اور وقتاً فوقتاً ایک خاص انداز سے رومال کو کبھی حرکت دیتے اور کبھی منھ سے پان کے ذرات کو صاف کرتے تھے، آپ کی یہ عادت آپ کی تقریر کی نمایاں خصوصیت مانی جاتی ہے، انتقال سے تین دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی لوگ اس مہذب خصلت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

قوتِ برداشت:۔

آپ ایشیاء کی عظیم اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے انتظام و انصرام سے وابستہ تھے، بحیثیت منتظم ملازمین اور طلباء سے سابقہ پڑتا ہے اور نرم و گرم گفتگو کے بارہا مواقع آتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثال قوت برداشت عطا فرمائی، اکثر آپ ملازمین کے غیر مہذب حرکتوں کو بھی آپ برداشت فرماتے تھے، ایسے سینکڑوں واقعات آج بھی بزبانِ زد عام و خاص ہیں کہ آپ نے ملازمین کے ساتھ ترش کلامی فرمائی اور کچھ ہی دیر کے بعد معافی بھی مانگ لی، ہم نے اساتذہ سے سنا ہے کہ ایک دربان نے حضرت قاری صاحب سے ناموافق گفتگو کی، حضرت قاری صاحب ترش رو ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں اس دربان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی کے لئے کھڑے بھی ہو گئے۔

اس سے بھی اہم واقعہ مولانا ندیم الواجدی مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ ''ترجمانِ دیوبند'' کا ہے جو

ہم کو بروایت مفتی سعید الظفر صاحب استاذ دارالعلوم حیدرآباد و سابق معین مدرس دارالعلوم دیو بند پہنچا ہے:

مولانا واجدی صاحب فرماتے ہیں کہ

زمانۂ طالب علمی میں ہم نے ایک بڑے عالم کا مضمون (جو نصاب کی تبدیلی سے متعلق تھا) اپنے دیواری پرچہ میں اپنے نام سے شائع کیا۔ظاہر ہے یہ ایک بڑی جرأت تھی دارالعلوم اور مسلکِ دارالعلوم کی نظر میں نصاب کی تبدیلی یا اس پر گفتگو ایک بڑا جرم تصور کی جاتی تھی اور اس زمانے میں اس کی سزا ''اخراج'' طے تھی۔

جب یہ مضمون شائع ہوا تو حضرت قاری صاحب سفر میں تھے، ناظمِ دارالاقامہ نے پرچہ کو ضبط کر لیا اور اخراج کی رپورٹ لکھ دی گئی لیکن بعض اساتذہ کی دخل اندازی کی وجہ سے اخراج کو حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری تک موقوف کر دیا گیا۔ آخر حضرت تشریف لائے اور ہم کو طلب کیا گیا۔میں دفترِ اہتمام میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حضرت قاری صاحب پرچہ کا بغور مطالعہ فرما رہے ہیں، کچھ دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ماشاء اللہ خوب لکھا ہے، بہت اچھے مشورے دیئے ہیں، اور اپنے معتمد مولانا عبدالحق صاحب کو آواز لگائی اور فرمایا مولوی عبدالحق دیکھئے! اس

> طالب علم نے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے، اس مضمون
> کی چند کاپیاں لے کر مدارس کو رائے اور مشورے
> کے لئے بھیجئے اور حضرت قاری صاحب نے میری
> بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہاں تو اس جرم کی سزا ''اخراج'' تھی لیکن حضرت نے اس کو برداشت کیا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ واقعہ کا بقیہ حصہ مزید حیران کن ہے۔

مولانا واجدی فرماتے ہیں: کہ

> پھر ہم نے معمول کے مطابق پرچہ نکالا لیکن طلباء
> نے نصاب پر مضمون کی وجہ سے اس پورے پرچے
> کو ہی کنویں میں پھینک دیا، اس واقعہ کی جب
> اطلاع حضرت قاری صاحب کو ہوئی تو آپ نے
> افسوس کا اظہار فرمایا اور دربان کو حکم دیا کہ آپ
> رات کے وقت مولوی صاحب کے پرچے کی بھی
> نگرانی کریں گے۔

ایک عظیم ادارے کے عظیم انتظام سے وابستہ شخص کے لئے ایسی عادت کو ''امتیاز'' ہی کہا جائے گا، ورنہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بڑے تو بڑے چھوٹے منتظم بھی ملازمین اور طلباء کی نا موافق تو کجا موافق باتوں کو بھی برداشت نہیں کرتے۔

مولانا اسلم صاحب قاسمی سے انٹرویو:۔

ہم نے اپنے اس طویل تحقیقی مقالہ میں قاری صاحب کے حالات زندگی، ان کے علمی ذوق و مزاج اور تقریباً ہر پہلو کو مستند اور معتبر حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قاری صاحب کی خانگی زندگی ایک ایسا گوشہ ہے جو تذکرہ نگاروں سے مخفی رہا۔ آپ اہل خانہ کے ساتھ کیسے رہتے تھے؟ بچوں کے ساتھ آپ کے معاملات کس نوعیت کے تھے؟ گھریلو زندگی میں مصروفیات کیسی تھیں؟ ظاہر ہے یہ ایسے

سوالات ہیں جن کا تعلق گھر والوں سے ہی ہے۔ باہر والے ان حالات پر واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ جس طرح آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خانگی زندگی عام صحابہؓ کی نظروں سے اوجھل ہے' اس اہم معاشرتی پہلو کو متعارف کروانے میں ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اہم رول ادا کیا۔ اگر یہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کو تفصیل سے بیان نہ کرتیں تو شاید وہ پہلو ہمیشہ کے لئے پردۂ خفا میں چلا جاتا۔



حضرت مولانا اسلم صاحب (صاحبزادہ قاری صاحب) سے انٹرویو لیتے ہوئے۔

قاری صاحب کی خانگی زندگی کو جاننے کیلئے ہم نے بھی دیوبند کا کئی مرتبہ سفر کیا اور ۲۴ رشعبان ۱۴۳۱ھ مطابق ۶ راگست ۲۰۱۰ء بروز جمعہ کو پہلا انٹرویو حضرت قاری صاحب کے لائق صاحبزادہ حضرت مولانا اسلم صاحب مدظلہ العالی سے لیا۔ حضرت موصوف کی پیدائش ۱۹۳۸ء (۱۳۵۶ھ) کو دیوبند میں ہی ہوئی۔ آپنے از اول تا آخر مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہی حاصل کی اور ۱۹۵۸ء میں فراغت حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار رہے اور ۱۹۸۰ء میں شعبہ تنظیم و ترقی کے ناظم اور اجلاس صد سالہ کے نگراں بنائے گئے۔

دارالعلوم دیوبند کی تقسیم کے بعد جب دارالعلوم وقف وجود میں آیا تو آپ نے وہاں تدریسی خدمات شروع کیں اور اس وقت سے اب تک حدیث کی بڑی کتب کے درس کے ساتھ نظامت

تعلیمات اور صدارت تدریس کی ذمہ داریوں کو بھی سنبھالتے ہیں۔

آپ کا اس وقت ہندوستان کے منتخب واعظین اور خطباء میں شمار کیا جاتا ہے۔ موصوف کو عربی' فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت ہے۔ آپ نے سیرت حلبیہ کا اردو ترجمہ بیس ضخیم جلدوں میں کیا ہے۔ موصوف کا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

سوال:- آپ کے دادا مرحوم حضرت حافظ احمد صاحب کی کتنی اولادیں تھیں؟

جواب:- ہمارے دادا مرحوم حضرت حافظ احمد صاحب کی شادی محلّہ دیوان دیوبند میں ہوئی تھی' ان سے پہلے تین اولاد ہوئیں دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ مگر بچپن میں ہی ان تینوں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی' اکابر دارالعلوم دیوبند بالخصوص حضرت شیخ الہند اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ان حضرات کی دلی تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی کی نسل چلے۔

ایک دن حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے مولانا عبدالسمیع صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند کو بلایا اور فرمایا کہ حضرت حافظ صاحب کے یہاں کئی سال سے اولاد نہیں ہو رہی ہے اور ہماری تمنا ہے کہ حضرت نانوتوی کی نسل باقی رہے اور چلتی رہے۔ فتح پور ہسوا میں ایک بزرگ ہیں جو اولاد کے سلسلہ میں مستجاب الدعوات ہیں۔ تم وہاں ان کی خدمت میں جاؤ اور میری طرف سے درخواست کرو کہ یہ صورتحال ہے وہ دعا فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ حافظ احمد صاحب کو اولاد کی دولت سے نوازیں۔

چنانچہ حضرت شیخ الہند کے ارشاد کے مطابق' ان بزرگ کی خدمت میں مولانا عبدالسمیع صاحب حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کرکے دعا کی درخواست کی انہوں نے فرمایا! ہم اس کا جواب کل دیں گے' حکم کے مطابق دوسرے دن مولانا عبدالسمیع صاحب حاضر ہوئے اور ان بزرگ سے ملاقات کی۔

ان بزرگ نے فرمایا ہم نے دعا کی تھی وہ قبول ہوگئی اور ہمیں بشارت دی گئی ہے کہ حافظ صاحب کے لڑکا ہوگا جو حافظ بھی ہوگا' قاری بھی ہوگا' عالم بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔

یہ واقعہ مولانا عبدالسمیع صاحب نے حضرت قاری صاحب سے اس وقت بیان کیا جب وہ ۱۳۴۶ھ میں حج کے لئے روانہ ہوئے اس تانگہ میں حضرت قاری صاحب کے ساتھ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب بھی سوار تھے فرمایا جب تو پیدا ہوا تو ہم نے کہا الحمد للہ ان بزرگوں کی کہی ہوئی ایک بات پوری ہوگئی، جب تو حافظ ہوگیا اور اس کا ایک بڑا جشن منایا گیا تو ہم نے کہا الحمد للہ دوسری بات بھی پوری ہوگئی جب تو نے قرأت کی تکمیل کی تو ہم نے کہا الحمد للہ تیسری بات بھی پوری ہوگئی، جب تو نے درس نظامی کو پورا کرلیا تو ہم نے کہا الحمد للہ چوتھی بات بھی پوری ہوگئی، جب تو حج کو جارہا ہے تو ہم نے کہا الحمد للہ پانچویں بات بھی پوری ہوگئی۔

چنانچہ حافظ صاحب کو تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی، بڑے صاحبزادے کا نام محمد طیب تجویز ہوا اور دوسرے کا نام محمد طاہر رکھا گیا اور صاحبزادی کا نام طیبہ تھا اور یہ تینوں صاحب اولاد بھی ہوئے۔

سوال:- آپ کے دادا حضرت مولانا احمد صاحب کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ کس سے محبت تھی؟

جواب:- میرے دادا کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ لگاؤ حضرت قاری صاحب ہی سے تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تین اولاد کے انتقال کے بعد ایک طویل عرصہ کے بعد پیدا ہوئے تھے اور حضرت قاری صاحب نے غیر معمولی طریقہ سے تعلیم میں ترقی کر کے سب کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ آپ سے تعلق ہی کی وجہ تھی کہ دادا صاحب نے آپ ہی کے لئے دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تجوید کا اجراء کیا جو الحمد للہ آج تک کام کررہا ہے۔

سوال:- آپ حضرت قاری صاحب کی اولاد کی تفصیل بتائیے۔؟

جواب:- والد مرحوم کی کل نو اولادیں تھیں۔

(۱) فاطمہ بیگم:- یہ سب سے بڑی صاحبزادی تھیں، ماسٹر رشید احمد صاحب (بریلی) کے نکاح میں تھیں، تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہوگئیں اور کراچی میں رہائش

اختیار کرلی۔ وفات کے بعد وہیں مدفون ہیں۔ ان کی تمام اولاد امریکہ منتقل ہوگئی۔

(۲) سیدہ:- یہ فاطمہ بیگم کے بعد پیدا ہوئیں لیکن قدرت نے ساتھ نہیں دیا اور صرف دو ہفتہ میں ہی انتقال کر گئیں۔

(۳) ہاجرہ بیگم:- یہ تیسری صاحبزادی ہیں' ان کا نکاح مولانا حامدالانصاری غازی (رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند و مدیر المدینہ اخبار بجنور) سے ہوا' وہ بڑے ادبی ذوق کی حامل تھیں' برصغیر کے ادبی حلقوں میں وہ معتبر نام شمار ہوتی تھیں۔ ''نازلی'' تخلص کرتی تھیں۔ ۱۸ سے زائد اصلاحی و معاشرتی ناولوں کی مصنفہ ہونے کے علاوہ ہندو پاک کے مختلف دینی' ادبی اور اصلاحی ماہناموں میں مختلف موضوعات پر' ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئیں۔

(۴) حضرت مولانا محمد سالم قاسمی:- ان کی پیدائش جنوری ۱۹۲۶ء (جمادی الاخری ۱۳۴۴ھ) میں ہوئی۔ آپ نے از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء (۱۳۶۷ھ) میں فارغ ہونے کے بعد آپ نے سالہا سال تک دارالعلوم ہی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۲ء (۱۴۰۳ھ) میں دارالعلوم میں پیدا ہونے والے اختلاف کے بعد آپ نے اپنے رفقاء کے تعاون سے دارالعلوم وقف کے نام سے دوسرا دارالعلوم قائم کیا جس کے شروع سے مہتمم ہیں اور وہیں بخاری شریف کی تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ملک اور بیرون ملک سینکڑوں دینی و دعوتی اسفار کرتے ہیں۔ پرسنل لا بورڈ کے رکن مجلس عاملہ رہے اور اب نائب صدر ہیں' مجلس مشاورت کے بھی صدر ہیں' دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ' مظاہر العلوم وقف کی مجلس شوریٰ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے رکن ہیں' انہیں مصری حکومت کئی سال پہلے برصغیر کے ممتاز عالم کے نشان امتیاز سے نواز چکی ہے۔

(۵) مولانا محمد عاصم قاسمی:- ان کی پیدائش حضرت مولانا سالم صاحب کے بعد ہوئی' دارالعلوم دیوبند میں حفظ قرآن کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کررہے تھے کہ

۷ مئی ۱۹۴۳ء (۷ر جمادی الاول ۱۳۶۱ھ) میں ۱۴ سال کی عمر میں وفات ہوگئی۔

(۶) حمیرا بیگم: ان کی ولادت مولانا محمد عاصم صاحب کے بعد ہوئی۔ دیوبند کے معروف گھرانے کے سابق چیرمین اور رئیس دیوبند محتشم صاحب کے صاحبزادے سید احتشام کاظمی سے منسوب ہیں۔ احتشام صاحب تقسیم ملک کے بعد کراچی منتقل ہوگئے اور بودوباش اختیار کرلی۔ گذشتہ تین دہائیوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔

(۷) عذرا بیگم: یہ اولاد میں ساتویں نمبر پر ہیں۔ ان کا نکاح دیوبند کے ڈاکٹر افضال سے ہوا تھا اور شادی کے تقریباً دوسال بعد بچی کی ولادت ہوئی اور دونوں کا ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوگیا۔ بوقت وفات عذرا بیگم ۲۱ برس کی تھیں، قاسمی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

(۸) مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی:- آٹھویں نمبر پر میری پیدائش ہوئی۔

(۹) محمد اعظم صاحب قاسمی:- ان کا اولاد میں آخری نمبر ہے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ساری تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی، چنانچہ بی۔اے، ایم۔اے، اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں بطور لیکچرار تقرر ہوا اور ترقی کرکے پروفیسر ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی علی گڑھ میں ہی رہائش پذیر ہیں۔ بہترین شاعر بھی ہیں ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی ہے لیکن پوری عمر نہ کسی مشاعرہ میں شرکت کی اور نہ ہی کوئی غزل رسالہ وغیرہ میں دی۔

سوال:- آپ حضرت والا کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے اپنے بھائی بہنوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا، موجودہ وقت میں آپ تین بھائی الحمد للہ بقید حیات ہیں، بڑی دلی تمنا ہے کہ آپ اپنی اور اپنے بھائیوں کی اولاد کے بارے میں بھی ذرا تفصیل سے بتائیں۔ سب سے پہلے حضرت مولانا سالم صاحب کی اولاد کے سلسلہ میں بتائیں۔

جواب:- بھائی سالم کی کل چھ اولادیں ہیں۔

(۱) محمد سلمان قاسمی:- شرح جامی تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں تعلیم حاصل کی' ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں بہ غرض ملازمت جدہ چلے گئے' چار سال وہاں قیام رہا' ۱۹۸۶ء میں پاکستان منتقل ہوگئے اور پی آئی اے میں ملازم ہوگئے اور تا حال اسی عہدہ پر فائزہ ہیں۔

(۲) محمد سفیان قاسمی :- حفظ قرآن کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیم مکمل کی' ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے درمیان تعلیم ہی پرائیوٹ طریقہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہائی اسکول سے ایم اے تک امتحانات دیئے۔ ۱۹۷۶ء میں جامعۃ الازہر قاہرہ میں کلیۃ شرعیہ سے ماجستیر (ایم۔اے) کیا۔ ۱۹۸۰ء میں واپسی ہوئی۔ ۱۹۸۳ء سے دارالعلوم وقف سے بھی وابستگی ہوئی اور ابتدائی کتب زیر درس رہیں۔ تدریجاً انتظامی ذمہ داریاں بھی سپرد ہوئیں' گذشتہ چار برس سے نیابت اہتمام متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ ترمذی شریف جلد ثانی کے اسباق متعلق ہیں۔ ۲۰۰۷ء کلکتہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن منتخب کئے گئے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بھی رکن ہیں۔

(۳) محمد عدنان قاسمی :- جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہائی اسکول کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم کام تک تعلیم حاصل کی' تجارتی سرگرمی کیلئے ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۹ء ساوتھ امریکہ کے ملک چلی میں مقیم رہے۔ حالیاً دہلی میں مقیم ہیں اور تجارتی مصروفیات میں مشغول ہیں۔

(۴) حافظ محمد عاصم قاسمی :- حفظ قرآن کے بعد جامعہ ملیہ دہلی سے ہائی اسکول کیا' جید حافظ ہونے کے ساتھ بہترین قاری بھی ہیں۔ ان کی قرأت سے متاثر ہوکر بعض عرب حضرات نے بغرض تراویح امریکہ دعوت دی' بقیہ تعلیم وہیں پر مکمل کی۔ تعلیم کے بعد تجارتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ واشنگٹن کے اسلامک سنٹر سے بھی وابستہ رہے اور اپنے حلقۂ اثر میں تبلیغ اسلام خاص موضوع رہا' چالیس سے زائد افراد نے دل نشین انداز تعلیمات سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔ ان کو انہوں نے قرآن کی تعلیم دی۔ آپ دنیا

کے مختلف ممالک میں مقیم رہے اور امریکی شہریت حاصل کی، حالیاً دہلی میں مقیم ہیں۔

(۵) اسماء اعجاز :- سید اعجاز حسن صاحب جو کہ چاند پور ضلع بجنور کے ایک معروف گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، اسماء ان سے منسوب ہیں، ایم اے اردو تک تعلیم حاصل کی، حالیاً دہلی میں مقیم ہیں۔

(٦) عظمیٰ ناہید: مولانا حامد انصاری غازی صاحب کے صاحبزادے سلمان منصور غازی صاحب کے نکاح میں ہیں۔ اقراء ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو کی ہندوستانی شاخ کی چیر پرسن ہیں۔ اس کے علاوہ ملک اور بیرون ملک اصلاحی تحریکات سے فعال وابستگی کی بنیاد پر ملک کی معتبر ترین خاتون کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ میں خواتین ونگ میں نہایت فعال شخصیت کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔

سوال:- آپ حضرت والا اپنی اولاد کے سلسلہ میں کچھ بتائیں۔

جواب:- میری کل چار اولاد ہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔

(۱) مولانا محمد فاروق قاسمی :- دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فضیلت کی، اس کے بعد امریکہ چلے گئے وہاں پر دس سالہ قیام میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ۲۰۰۰ء میں وطن واپسی ہوئی اور دارالعلوم دیوبند وقف سے وابستہ ہوگئے تا حال اسی ادارہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

(۲) محمد ہشام قاسمی :- حفظ کلام اللہ کے بعد ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول تا ایم۔اے۔ دہلی یونیورسٹی سے کیا، اس کے بعد اپنے تجارتی کاروبار میں مشغول ہوگئے ہیں۔

(۳) فوزیہ زرین :- امریکہ میں مقیم اجمیری خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک ذی استعداد فاضل سے منسوب ہوکر امریکہ چلی گئیں اور وہیں پر ۳۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بی۔اے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پرائیوٹ طریقہ پر امتحانات دے کر تعلیم حاصل کی تھی۔

(۴) فرح زرین :- گھر پر رہ کر ضروری دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ طریقہ پر ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی اور کاندھلہ کے ایک معروف گھرانے کے فرد بدرالاسلام صاحب سے منسوب ہیں۔

سوال:- چھوٹے بھائی محمد اعظم صاحب قاسمی کی اولاد کی تفصیل کیا ہے؟

جواب:- ان کے صرف دو لڑکے اور دو لڑکیاں ماشاء اللہ حیات ہیں۔

(۱) احمد فرید :- مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ابتداء سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فضائی فوج کے لئے منتخب کر لئے گئے' حالیاً دہلی میں مقیم ہیں اور لیفٹیننٹ کے عہدہ پر فائز ہیں۔

(۲) قاسم رشید:- علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دہلی میں زیر تعلیم ہیں۔

(۳) صباحت:- شادی کے بعد امریکہ میں مقیم ہیں۔

(۴) زینب:- یہ بھی شادی کے بعد امریکہ چلی گئیں۔

سوال:- حضرت قاری صاحب کے مزاج کے سلسلہ میں کچھ بتائیں؟

جواب:- حضرت قاری صاحب گھر سے باہر کی طرح گھر کے اندر بھی انتہائی نرم مزاج تھے۔سب سے مسکرا کر بات کرتے تھے' میں نے پوری عمر ان کو کبھی غصہ کرتے نہیں دیکھا۔اگر بچے ان کے سامنے شیطانی بھی کرتے تھے تو مسکراتے رہتے تھے' ان کے غصہ کا آخری درجہ یہ تھا کہ بچوں کو مسکرا کر "کیا واہیات ہے!" فرماتے تھے۔یہ والد مرحوم کے غصہ کی انتہا تھی البتہ والدہ صاحبہ ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں وہ سمجھ جاتی تھیں کہ والد صاحب کو تکلیف ہوئی ہے تو پھر وہ بچوں کی خبر لیتی تھیں۔

سوال:- بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا' کیا کسی بچے سے زیادہ محبت بھی کرتے تھے؟

جواب:- والد مرحوم دارالعلوم دیوبند سے چھٹی کے بعد سیدھے گھر تشریف لاتے تھے اور گھر آ کر بچوں سے فرماتے کہ کیا تم لوگ کھیل نہیں رہے ہو؟ اور پھر فرماتے آؤ کھیلیں گے' اور اس کے بعد بچوں کے ساتھ کبڈی کھیلنے لگتے تھے' عام طور پر والد مرحوم بچوں کو انہی کی معصوم

زبان میں مخاطب کرتے تھے۔

والد مرحوم کا تمام بچوں کے ساتھ برابر تعلق تھا' ہم نے کبھی بھی کمی زیادتی محسوس نہیں کی' نہ ہی لین دین میں اور نہ ہی پیار محبت میں۔

سوال:- حضرت قاری صاحب کے گھریلو معمولات بتائیں؟

جواب:- حضرت والد صاحب دارالعلوم سے سیدھے گھر تشریف لاتے اور اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور مسلسل چند گھنٹے لکھنے پڑھنے کے بعد تھکان محسوس ہوتی تھی تو باہر تشریف لاتے اور ہم لوگ گھر کے صحن میں چند تخت بچھا دیتے تھے تاکہ والد صاحب کے ساتھ تمام افراد خانہ بیٹھ سکیں' بیٹھتے ہی حضرت نصیحت شروع کر دیتے تھے اور سب سے زیادہ حقوق اللہ اور حقوق العباد اور زبان کی حفاظت کی تلقین کرتے تھے۔

والد صاحب تہجد کے پابند تھے ان کی زندگی انتہائی سادہ تھی حتی کہ اپنے کپڑوں کا بھی خیال نہیں کرتے تھے' والدہ صاحبہ ہی کو خیال رہتا تھا۔

سوال:- آپ کو کھانے میں کیا پسند تھا؟

جواب:- والد صاحب کو طبعی طور پر تو کسی چیز کی طرف میلان نہیں تھا جو گھر میں مل جاتا تھا اسی کو کھا لیتے تھے' کبھی ہم نے فرمائش نہیں سنی' البتہ گوشت اور اس میں بھی قیمہ بہت پسند فرماتے تھے۔

عمر کے اول مرحلہ میں چائے کا شوق نہیں تھا' آخری عمر میں جب کھانا دشوار ہو گیا تو چائے نوش فرماتے تھے اور وہ بھی انتہائی میٹھی۔

سوال:- حضرت کا ذوق مزاح کیسا تھا؟

جواب:- والد صاحب خود مزاح نہیں فرماتے تھے' کبھی کوئی لطیفہ سناتا تھا تو شدت ہنسی کے وقت رومال لے کر زور سے منہ بند کر لیتے تھے' اس کی وجہ سے چہرہ سرخ اور آنکھوں سے پانی نکلنے لگتا تھا۔

سوال:- حضرت کی تواضع و انکساری سے متعلق کچھ بتائیں؟

جواب:- حضرت والد صاحب انتہائی متواضع انسان تھے' بڑوں کے ساتھ ساتھ چھوٹوں سے بھی تواضع سے پیش آتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی سپاہی کسی طالب علم کی انکوائری کے لئے دفتر اہتمام آتا تو آپ اس کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ پیشکار صاحب حضرت کو منع کرتے تھے' لیکن حضرت فرماتے بھائی وہ بھی انسان ہے اس کا بھی احترام کرنا چاہیے۔

سوال:- ان کی کوئی خاص وصیت ذکر کیجئے؟

جواب:- والد صاحب نے انتقال سے کچھ پہلے فرمایا کہ میرے پاس کچھ رقم الماری میں رکھی ہے اس کو تم تقسیم تو نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بہت تھوڑی ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم لوگ اس کو ایصال ثواب کیلئے خرچ کر دینا۔

ہم نے تدفین کے بعد الماری کھولی تو ساری زندگی کی پونجی گیارہ ہزار اور چند سو تھی۔ ہم نے صدقہ کرنا چاہی تو بہنوں نے کہا کہ اس رقم کو تمام بھائی بہنوں میں شریعت کے مطابق تقسیم کرو اور پھر ہر ایک اپنے ہاتھ سے اس کو صدقہ کرے' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

سوال:- کوئی اہم واقعہ ذکر کیجئے؟

جواب:- ایک انور دہلوی صاحب تھے وہ دہریہ قسم کے آدمی تھے' دہلی میں رہتے تھے اور رسالہ ''شمع'' میں کام کرتے تھے۔ میں دہلی جاتا تو ان سے بھی ملتا تھا۔ انہوں نے والد مرحوم کا تذکرہ تو بہت سنا تھا' لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ وہ کسی کام سے دیوبند آئے اور میرے تعلق کی وجہ سے گھر ملنے بھی آئے اور مجھ سے کہا کہ آپ کے والد صاحب کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے آج ملوا بھی دو۔ میں نے والد صاحب کو اطلاع دی' والد صاحب مہمان خانہ میں تشریف لائے' والد صاحب کو دیکھتے ہی انور صاحب ہکا بکا رہ گئے اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی' انور صاحب نے والد مرحوم کو دیکھتے ہی دین حق کا اعتراف کرلیا۔

☆☆☆

دوسرا انٹرویو:-

دوسرا انٹرویو خاندان قاسمی کے اہم فرد حضرت مولانا سفیان قاسمی صاحب کا ہے جو حضرت قاری صاحب کے پوتے اور مولانا سالم صاحب کے صاحبزادے ہوتے ہیں۔ یہ انٹرویو ۲۶؍شعبان ۱۴۳۱ھ مطابق ۸؍اگست ۲۰۱۰ء بروز اتوار لیا گیا ہے۔ ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔



حضرت مولانا سفیان (نبیرہ حضرت قاری صاحبؒ) سے انٹرویو لیتے ہوئے۔

مولانا سفیان قاسمی صاحب نے حفظ قرآن کریم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیم مکمل کی اور ۱۹۷۵ء میں فارغ ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں دارالعلوم وقف سے وابستہ ہوکر ابتدائی کتابوں کی تدریس انجام دینے لگے، تدریجاً انتظامی ذمہ داریوں بھی سپرد ہوئیں۔ گذشتہ چار برس سے نیابت اہتمام متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ ترمذی شریف جلد ثانی کے اسباق متعلق ہیں۔ ۲۰۰۷ء کلکتہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن منتخب کئے گئے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بھی رکن ہیں۔ ان کا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

سوال:- آپ کے دادا حضرت قاری صاحب مرحوم بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے تھے؟

جواب:- حضرت دادا مرحوم ہمیشہ اتباع سنت کی تاکید فرماتے تھے اور زبان کی حفاظت کی بہت

زیادہ نصیحت کرتے تھے اور خود بھی اس پر بہت زیادہ عمل کرتے تھے، مجھے یاد ہے دارالعلوم دیوبند کے قضیہ کے دوران ایک مرتبہ میں نے غصہ سے ''مولوی اسعد'' کہہ دیا، حضرت قاری صاحب بہت غصہ ہوئے اور فرمایا تم بڑوں کا ادب نہیں جانتے ہو۔ اس کا یہ اثر ہے کہ اب کبھی مخالف کے لئے بھی بے ادبی کے الفاظ زبان پر نہیں آتے ہیں۔

دادا مرحوم کی تربیت کا انداز بھی نرالا تھا، ایک الماری میں دادا مرحوم کے پیسے رکھے رہتے تھے اور اس کی چابی ڈیکس میں رہتی تھی، مجھے پتنگ اڑانے کا شوق تھا میں خاموشی سے کچھ پیسے الماری سے نکال لیتا تھا، حضرت نے محسوس کرلیا تو ایک دن بلایا اور فرمایا میاں سفیان! یادداشت کچھ کمزور ہوگئی ہے، رکھی ہوئی رقم بھی یاد نہیں رہتی ہے آج سے اس الماری کی چابی تم رکھو۔ جب ضرورت ہوگی ہم تم سے پیسے لے لیں گے۔ چنانچہ اس دن سے چابی ہمارے پاس رہنے لگی اور ہماری چوری بھی بند ہوگئی۔

سوال:- آپ نے حضرت کے ساتھ بہت اسفار کئے ہیں۔ ان کے کچھ واقعات سنایئے؟

جواب:- واقعات تو بہت ہیں صرف چند کا تذکرہ کرتا ہوں۔

(۱) پہلا واقعہ ۱۹۷۲ء کا ہے جب میں نے حضرت کے ساتھ پہلا سفر جہاز کے ذریعہ کیا۔ جب جہاز بلندی پر چلا گیا تو حضرت نے فرمایا۔ میاں سفیان! یہ جو چھوٹی چھوٹی چیزیں نظر آرہی ہیں یہ سب شہر ہیں۔ اس سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب ہمارا جسم بلند ہوگیا تو دنیا کی یہ تمام چیزیں چھوٹی ہوگئیں۔ حالانکہ اسی دنیا میں انہی چیزوں کو بڑا سمجھ کر جھگڑا ہوتا ہے۔ اگر انسانی روح ترقی کر جائے تو دنیا کی ہر چیز حقیر معلوم ہونے لگتی ہے اور بے معنی ہوجاتی ہے۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ میں نے تقریباً چار سال ممبئی میں قرآن سنایا اور حضرت سنتے تھے وہاں کریم نام کے مشہور آدمی تھے ان کا اہل بدعت کے یہاں بڑا مقام تھا۔ روزانہ تراویح کے بعد حضرت کا خطاب ہوتا تھا اور خطاب کے بعد سوالات کا سلسلہ تھا۔

ایک دن یہ کریم صاحب تقریباً تیس آدمیوں کو ساتھ لے کر مجلس میں آئے، لوگوں میں

کھلبلی مچ گئی کہ نہ جانے کیا واقعہ پیش آجائے۔ لیکن حضرت نے آنے کی اجازت دی۔ وہ آئے اور انہوں نے سوال کیا کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم عشق رسول میں آپ لوگوں سے بڑھے ہوئے ہیں وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ حضرت نے جواب دیا کہ ہم اس دعویٰ کی تائید کرتے ہیں۔ واقعی آپ عشق رسولؐ میں ہم سے آگے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قدم آگے ہیں اور ہم دو قدم پیچھے اور پیچھے چلنے والا متبع ہوتا ہے۔

اس جواب کی وجہ سے کریم صاحب اور وہ تمام لوگ اسی وقت تائب ہوئے اور پورے رمضان تراویح اور وعظ میں حاضر رہے۔

(۳) تیسرا واقعہ مجھے یاد ہے کہ ہم بہت چھوٹے تھے حضرت نے فرمایا کہ ہفتہ بھر نماز پڑھو گے تو چار آنے ملیں گے۔ ہم لالچ میں خوشی خوشی نماز پڑھنے لگے اور ہر ہفتہ چار آنے ہم کو ملتے تھے۔

ایک مرتبہ ہمارے گھر حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کی اہلیہ محترمہ جن کو سب آپا جی کہتے ہیں تشریف لائیں، باتوں باتوں میں والدہ مرحومہ نے ان چار آنے کا ان سے بھی تذکرہ کیا تو آپا جی کہنے لگیں اس مہنگائی کے دور میں چار آنے بہت کم ہیں، کم از کم پچاس پیسے تو ہونے چاہیئے۔ ہم نے ان کی یہ بات سنی تو ہماری سمجھ میں آئی کہ واقعی چار آنے کم ہیں چنانچہ جب نماز کا وقت ہوا اور دادا حضور نے آواز لگائی تو ہم نے اپنا مطالبہ حضرت کے سامنے رکھا کہ چار آنے کی جگہ پچاس پیسے کردیئے جائیں تو نماز پڑھیں گے ورنہ نہیں۔ تو حضرت نے خوشی خوشی چار آنے سے اضافہ کرکے پچاس پیسے کردیئے۔

(۴) ایک واقعہ ان کی احتیاط سے متعلق ہے۔ ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد میں نے جامعہ ازہر جانے کا ارادہ کیا مجھے اس سلسلہ میں چودھری عبدالعزیز عطر والے ممبئی سے ملنا تھا۔ ان کا حضرت قاری صاحب سے قریبی تعلق تھا۔ میں نے دادا مرحوم سے ایک خط لکھنے کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا صبح دفتر اہتمام آؤ۔

میں صبح دفتر اہتمام پہنچا تو حضرت کچھ لکھ رہے تھے، میں نے جا کر دوبارہ درخواست کی، تو حضرت نے اپنے ہاتھ والا قلم جیب میں رکھا اور ایک دوسرا قلم نکالا اور میرا خط لکھ کر دے دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا پہلے قلم میں روشنائی ختم ہوگئی تھی؟ حضرت نے جواب دیا نہیں! اس میں روشنائی ہے لیکن وہ مدرسہ کا قلم ہے، میرا نہیں ہے۔ اور تمہارا خط ہمارا ذاتی کام ہے اس لئے میں نے تمہارا خط اپنے ذاتی قلم سے لکھا ہے۔

شیوخ واساتذہ کا تعارف:۔

حضرت قاری صاحب کی شخصیت عالمی شخصیت ہے، خاندانی اور موروثی کمالات کے علاوہ بھی آپ ایک قدر آور شخصیت کے مالک تھے، اگر خاندانی اور دیگر نسبتیں الگ کر دی جائیں تو قاری صاحب کی قدر آوری میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی۔

ان سب باتوں کے باوجود شخصیت کو بنانے اور نکھارنے میں اساتذہ کی محنت، ان کی علمی وعملی، سیاسی اور سماجی مصروفیات کا بہت بڑا دخل ہے، عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ محنتی اور ہوشیار طالب علم صاحب علم اور مصروف اساتذہ سے متأثر ہوتا ہے اور ان کو اپنے لئے نمونہ بناتا ہے، اور پھر ہر اہم جگہ اپنے استاذ کی نقل کرتا ہے اور اس طرح اس کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہوتی رہتی ہے۔

حضرت قاری صاحب کے اساتذہ میں ایسے مشاہیر بھی ہوئے ہیں جو اپنے وقت کے امام ملت، علم وعمل کا نمونہ، خواص وعوام کی رشد وہدایت کا مرکز۔ علم حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ میں ان کا ثانی نہیں۔ قومی اور ملکی امور میں مسلمہ طور پر قائد تسلیم کئے گئے۔ یقیناً قاری صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں ان حضرات کی خصوصیات کا بھی بڑا حصہ ہے، قاری صاحب کے اساتذہ کی تعداد، روداد دارالعلوم دیوبند کے مطابق تقریباً بیس ہے، ہم ان میں سے چند اساتذہ وشیوخ کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں تاکہ قاری صاحب کی شخصیت مزید واضح ہوجائے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی:۔

آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم ہیں آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو بریلوی میں ہوئی۔

(تاریخ دارالعلوم :۲/۱۷۹ محبوب رضوی.........مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا مہتاب علی دیوبندی سے حاصل کی، قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، چنانچہ آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے ۱۲۸۶ھ میں نصاب دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتوی کی خدمت میں علم حدیث کی تحصیل کیلئے حاضر ہوئے، آپ نے ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء کو فراغت حاصل کی (روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ :ص/۱۰ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند) ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا اور ترقی کرتے کرتے ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں صدرالمدرسین بنائے گئے۔

حضرت نانوتوی کے بعد سب سے زیادہ فیضان آپ کی ذات سے ہوا، آپ نے ہی علوم نانوتوی اور فکر ولی اللھی کی ترویج واشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔

دارالعلوم کی روداد کے مطابق قاری صاحب نے حضرت شیخ الہند سے کوئی باضابطہ کتاب نہیں پڑھی البتہ ۱۳۳۹ھ میں حضرت قاری صاحب حضرت شیخ الہند کے دست حق پر بیعت ہوئے۔

(تاریخ دارالعلوم :۲/۱۳۳ محبوب رضوی.........مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا سید انور شاہ کشمیری:۔

آپ ۲۷/شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء کو کشمیر میں سادات کے ایک معزز علمی خاندان میں پیدا ہوئے قرآن شریف اور کچھ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا سید معظم شاہ سے حاصل کی، ۱۴/سال کی عمر ہوئی تھی کہ طلب علم کیلئے نکل پڑے تقریبا تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہے اور پھر ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو دارالعلوم تشریف لائے، اور حضرت شیخ الہند سے حدیث کی تکمیل کی، ۱۳۱۴ھ میں فراغت کے بعد حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ باطنی

فیوض سے بھی مستفیض ہوئے اور خلافت حاصل کی۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی اور کشمیر میں خدمت انجام دیں اور ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء کو دیوبند میں مدرس ہوئے اور طویل زمانہ تک بغیر مشاہرے کے کتب حدیث کی انجام دی۔ آخری عمر میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدت سے مجبور ہوکر دیوبند تشریف لے آئے اور ۳/صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو تقریباً ۶۰/سال کی عمر میں وفات پائی۔

(تاریخ دارالعلوم: ۲/۷۶ محبوب رضوی............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ کو قدرت کی جانب سے بے مثال حافظہ بخشا گیا تھا، ایک مرتبہ دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین ومطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات وسطور کے یاد رہتیں حضرت قاری صاحب نے لکھا ہے کہ:

"آپ تمام علوم منقولات ومعقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، قوت حافظہ میں یگانہ روزگار تھے، کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف تھے، آپ کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا، جو ایک خاص امتیازی طرز لئے ہوئے تھا، آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم وفنون بنادیا تھا، آپ کے درس نے نقل وروایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کیلئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی"۔

(ذکر طیب: ۵۴۔ اکبر شاہ بخاری............مکتبہ دارالکتاب دیوبند)

مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ کی وفات پر "معارف" میں لکھا تھا:۔

"ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی

سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت
خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوتہ
حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال
تھے۔علوم حدیث کے حافظ ونکتہ شناس، علوم ادب
میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعروسخن سے بہرہ
منداورزہد وتقوی میں کامل تھے، مرتے دم تک علم
ومعرفت کے اس شہید نے قال اللہ وقال الرسول
کا نعرہ بلند رکھا"

(تاریخ دارالعلوم: ۲/۷۵ /محبوب رضوی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

قاری صاحب نے آپ سے دارالعلوم کی روداد کے مطابق ۱۳۳۷ھ میں حدیث کی تکمیل کیوقت بخاری اور ترمذی شریف پڑھی۔

(مظلوم شخصیت: ۱/۶۳: اسعد صدیقی............ مطبوعہ مکتبہ انوارالقرآن دیوبند)

اور حضرت شیخ الہند کے انتقال کے بعد آپ سے ہی بیعت ہوئے۔

(تاریخ دارالعلوم: ۲/۱۳۳ /محبوب رضوی............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی:-

آپ تھانہ بھون کے فاروقی خاندان میں ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔قرآن شریف حافظ حسین علی سے حفظ کیا، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں حضرت مولانا فتح محمد تھانوی سے پڑھی۔ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم میں داخلہ ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں فراغت حاصل کی۔فراغت کے بعد ۱۳۰۱ھ میں اولا مدرسہ فیض عام کان پور میں صدر مدرس ہوئے اور پھر جامع العلوم کی سند صدارت کو زینت بخشی۔اور ۱۳۱۵ھ میں ملازمت ترک کر کے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں متوکلاعلی اللہ قیام فرمایا، اور ۴۷/سال تک تبلیغ دین، تزکیہ نفس اور تصنیف وتالیف کی ایسی عظیم الشان اور گراں قدر خدمات انجام دیں جس کی مثال اس دور کی کسی دوسری شخصیت میں نہیں ملتی۔۱۶/رجب

۶۲ ۱۳ھ کو شب میں تھانہ بھون میں اس جہان فانی کو خیر آباد کہا۔

(تاریخ دار العلوم: ۵۳/۲............مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیوبند)

آپ کے معمولات، تصانیف اور تبلیغ دین کے سلسلہ میں مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں:۔

"حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
جنہیں آج دنیا اس صدی کے عظیم رہنما کی حیثیت
سے جانتی ہے۔آپ ایک امیر گھرانے کے چشم
وچراغ تھے، لیکن دار العلوم میں طالب علم کی زندگی
اس طرح بسر کی کہ مدرسہ کے قریب ایک چھوٹی سی
مسجد میں رہتے اور طالب علمی ہی کے زمانے سے
اوقات نظم وضبط کا یہ عالم تھا کہ ان کی مصروفیات
کو دیکھ کر وقت معلوم کیا جاسکتا تھا۔زمانہ امتحان
کا ہو یا عام تعلیم کا، ہمیشہ عشاء کی نماز کے
بعد سو جاتے اور آخری شب میں تہجد کیلئے
بیدار ہوتے، کبھی اس معمول میں فرق نہیں آیا، دین
اور علم دین کی خدمات کیلئے جتنے شعبے ہیں سب
میں آپ کے مآثر بے شمار ہیں، ایک ہزار سے
زائد آپ کی وہ مقبول تصانیف ہیں جن سے
لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب
آیا اور آپ کے سلسلہ ارشاد سے بھی لاکھوں
مسلمانوں کی زندگی بنی اور سیکڑوں مشائخ طریقت
پیدا ہوئے"

(ذکر طیب: ص/۵۱۔بحوالہ الرشید دار العلوم دیوبند)

قاری صاحب نے حضرت حکیم الامت سے باضابطہ کوئی کتاب نہیں پڑھی البتہ حضرت علامہ انورشاہ کشمیری کے بعد آپ نے اصلاح نفس کیلئے حضرت حکیم الامت سے ہی رجوع کیا اور خلافت حاصل کی۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی:۔

آپ ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔آپ کا تاریخی نام ''ظفرالدین'' رکھا گیا،شروع ہی سے تعلیم دارالعلوم میں حاصل کی اور ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔۱۳۳۴ھ کی روداد دارالعلوم دیوبند میں آپ کے سلسلہ میں اس طرح معلومات درج ہیں:۔

''مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نے فراغت کے بعد بطور معین المدرس دارالعلوم میں درس دیا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں افتاء کا کام بھی کیا،اسی زمانہ میں ان کو داعیۂ طریقت پیدا ہوا،خاندان نقشبندیہ میں حضرت مولانا رفیع الدین کے ہاتھ پر بیعت کی،چند سال کی ریاضات ومجاہدات کے بعد اجازت سلسلہ حاصل ہوئی،چند سال تک میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ واقعہ اندرکوٹ میں مدرس رہے،اس زمانہ میں آپ کو دوبارہ داعیۂ حج پیدا ہوا،اس سفر میں آپ کا حج کے ساتھ یہ بھی مقصد تھا کہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداداللہ قدس سرہ کی خدمت میں قیام فرمائیں،چنانچہ ڈیڑھ سال آپ کا اس سفر میں صرف ہوا اور حضرت حاجی صاحب نے بھی آپ کو مجاز فرمایا،شوال ۱۳۰۵ھ میں

تشریف لے گئے تھے، اور صفر ۱۳۰۷ھ میں واپس
تشریف لائے ۱۳۰۹ھ میں آپ کو میرٹھ سے
دیوبند بلایا گیا اس وقت سے برابر دارالعلوم کی
خدمت میں مصروف ہیں، آپ اس وقت مفتی
مدرسہ ہیں، لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ کے چند سبق
بھی آپ سے متعلق رہتے ہیں''

(روداد دارالعلوم: ۱۳۳۳ھ۔ ص/۱۹............ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

۱۷ر جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں وفات پائی حضرت سید اصغر حسین صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔

قاری صاحب نے آپ سے جلالین، مؤطا امام محمد اور مؤطا امام مالک پڑھی۔

(روداد دارالعلوم مشمولہ مظلوم شخصیت: ۱/۶۳ اسعد صدیقی ...... مطبوعہ مکتبہ انوار القرآن دیوبند)

مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری:-

آپ چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۰۴ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی فراغت کے بعد عرصہ دراز تک دربھنگہ اور مرادآباد وغیرہ میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ آخر اکابر نے آپ کو دارالعلوم بلایا اور نظامت تعلیم کا شعبہ آپ کے سپرد کیا گیا اور شعبہ تبلیغ کی ذمہ داری بھی آپ ہی کو دیدی گئی۔ ان سب ذمہ داریوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سے شرف بیعت حاصل تھا، آخری عمر میں حضرت تھانوی کی طرف رجوع کیا اور مجاز بیعت ہوئے یکم رمضان ۱۳۵۰ھ کو دارالعلوم سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن چلے گئے اور دسمبر ۱۹۵۱ء کو وفات پائی آپ نہایت ذہین تھے، آپ کے وعظ وتقریر کی بہت شہرت تھی، مناظرے اور مباحثہ میں تو کوئی آپ کا ثانی نہیں تھا، بدعت اور قادیانیت کے بڑھتے سیلاب کے آگے آپ ہی نے بند باندھا، جناب محبوب رضوی لکھتے ہیں:۔

''نہایت ذکی اور طباع تھے، ظرافت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ان کے وعظ

وتقریر کی بڑی شہرت تھی اور مناظرے میں توان کا پایہ بہت بلند تھا، بدعات اور قادیانیت کے رد میں انہیں بڑا شغف تھا''

(تاریخ دار العلوم: ۶۳/۲............مطبوعہ مکتبہ دار العلوم دیو بند)

قاری صاحب نے آپ سے میزان الصرف اور منشعب پڑھی۔

(روداد دار العلوم مشمولہ مظلوم شخصیت: ۱/۵۵ اسعد صدیقی۔ مطبوعہ مکتبہ انوار القرآن دیو بند)

علامہ شبیر احمد عثمانی:-

آپ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے ۱۹۰۷ء میں دار العلوم سے فراغت حاصل کی، آپ کا شمار شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے اور آپ انہی سے بیعت تھے۔ مختلف جگہ درس وتدریس کا مشغلہ رہا پھر دار العلوم بلائے گئے۔ اور ۱۹۲۸ء میں بعض اختلافات کی وجہ سے دار العلوم سے علاحدہ ہوگئے اور علامہ کشمیری کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے۔ آخری عمر میں دار العلوم کے صدر مہتمم رہے پاکستان کے قیام کے بعد آپ پاکستان تشریف لے گئے اور ۱۳/دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہاول پور میں وفات پائی۔ آپ کے اکابر نے آپ سے جو توقعات وابستہ کی تھیں آپ نے ان کو پورا کر دکھایا چنانچہ ۱۳۳۲ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ:۔

''مولوی شبیر احمد صاحب، ماشاء اللہ ان نوجوان اہل علم میں سے ہیں جن کو علوم اکابر کا حامل قرار دیا جائے تمام علوم معقول ومنقول میں کامل استعداد رکھتے ہیں تقریر وتحریر میں بے مثل ہیں، خصوصاً علم حدیث میں ایسا ملکہ ہے جو معمر اور تجربہ کار مشائخ کو ہوتا ہے ہمیں خدا تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہ نوجوان اپنے علم وصلاحیت اور ہر قسم کی قابلیت سے دار العلوم کے شاندار امتیازات میں ہونے کے ساتھ اپنے سلف

کے سچے خلف ثابت ہوں گے''

(تاریخ دارالعلوم:۲/۱۰۱............مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

آپ کی تقریر کے سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:۔

''علامہ اپنے وقت کے زبردست متکلم، نہایت خوش بیان مقرر، محدث، مفسر، محقق، مدبر تھے۔ حلقۂ علماء میں ایسا قادرالکلام مقرر اور ایسا بلیغ البیان خطیب شائد اب تک میسر نہیں ہوا ہوگا''۔

(ذکر طیب ص/۶۱۔ اکبر شاہ بخاری............مطبوعہ دارالکتاب دیوبند)

آپ کثیرالتصانیف عالم ہیں آپ کی تصانیف میں ممتاز کتابیں فتح الملھم شرح مسلم اور ترجمہ شیخ الہند پر تفسیری حواشی ہیں۔

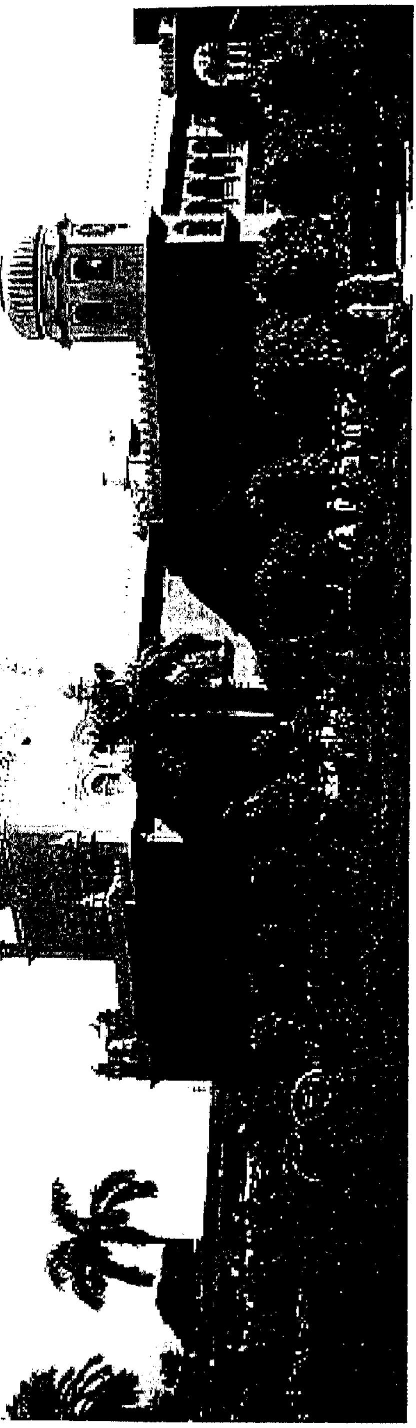
حضرت قاری صاحب نے آپ سے نسائی شریف، اور صغری کبری پڑھیں۔

(مظلوم شخصیت:۱/۵۷۔ اسعد صدیقی............مطبوعہ مکتبہ انوارالقرآن دیوبند)

☆☆☆

لامیۃ العجم

لمحز



دارالعلوم دیوبند

باب سوم: تدریس واہتمام

دوسرے باب میں قاری محمد طیب صاحب کی تعلیم وتربیت کو ہم نے تفصیل سے لکھا ہے، ہم اس تیسرے باب میں تدریس واہتمام کا ان شاء اللہ تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔

تدریس کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ درس وتدریس میں بھی ایک شخصیت جھلکتی ہے، طلبہ کو درس دیتے ہوئے طلبہ پر قابو پانا، قدیم طریقۂ تدریس میں اصلاح اور ممکنہ اضافے۔ غرض اس جائزہ سے شخصیت کے علمی خدوخال واضح ہوجائیں گے۔

اس جائزہ میں شخصیت کو اس پہلو سے بھی سمجھنے کا موقعہ ملے گا کہ ایشیاء کی عظیم درسگاہ کے انتظام وانصرام کے ساتھ قاری صاحب خود کو درس وتدریس سے علاحدہ نہیں کرسکے تھے، کوئی نہ کوئی درس اپنے لئے مخصوص فرماتے تھے، عموماً حجۃ اللہ البالغہ آپ کے زیر درس رہتی تھی۔

اہتمام کا جائزہ آپ کی عملی، انتظامی، قوت فیصلہ اور قوت برداشت کا جائزہ ہے۔ ہمارے یہ دونوں جائزے یہ تاثر پیش کریں گے کہ شخصیت میں تدریس اور اہتمام دونوں متوازی ہیں۔

تدریس کا آغاز:-

حضرت قاری صاحب ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، اور آپ نے فراغت کے بعد تدریس کا آغاز کیا، اس وقت کے اکابر نے آپ کا انتخاب معین مدرس کی حیثیت سے کیا تھا، قاری صاحب کی تدریس کا ابتدائی دور اہل علم اور اہل نظر کا دور تھا، اپنے زمانہ کے مستند علماء محدثین اور فقہاء کے درمیان درس دینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، اس کے باوجود قاری صاحب نے تدریس کا آغاز کیا اور افہام وتفہیم، اخلاص کی وجہ سے بہت جلدی طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا جناب عبداللہ جاوید غازی پوری لکھتے ہیں:۔

> ''دوران تعلیم میں چونکہ اکابرواساتذہ کی حقیقت
> شناس نگاہوں نے آپ کی صلاحیتوں اور خداداد علمی
> ملکات کو تاڑ لیا تھا۔ نیز آپ کے ذاتی اوصاف اور علمی

صلاحیتوں کا سب ہی کو اعتراف تھا۔اس لئے آپ
کو تعلیم سے فراغت کے بعد منصب تدریس پر فائز
کیا گیا۔خداداد ذکاوت وذہانت،فہم وفراست
اور پھر خاندانی وجاہت ونسبت کی بناء پر بہت
جلد آپنے عام مقبولیت اور علمی حلقوں کی گرویدگی
حاصل کرلی۔اس سند علم وفضل پر فائز ہونے کے
بعد آپ کے اوصاف وکمالات کے حقیقی جوہر کھلے:''

(ذکر طیب۔ص۷۵)

تدریس کے لئے درسگاہ کا انتخاب:-

قاری صاحب نے اپنی تدریس کے لئے نودرہ کی درمیانی درسگاہ کا انتخاب کیا،جو فی الحال پنجم اولی کی درسگاہ ہے،قاری صاحب نے اس درسگاہ کا انتخاب کیوں کیا؟اوراس کے کیا اثرات وبرکات ظاہر ہوئے؟۔پورا واقعہ قاری صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں جناب عبداللہ جاوید کے واسطہ سے:۔

''جب میں فارغ ہوگیا تو ابتدائی کتابوں کے
اسباق میرے سپرد کئے گئے میں نے اپنے لئے
نودرہ کی درمیانی درسگاہ پسند کی بعض حضرات نے
کہا کہ اس کے دونوں طرف درسگاہیں ہیں،ان
میں شوروشغب زیادہ رہتا ہے۔نودرہ کی پشت
پر پہلے تو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں اور جہاں اب
تحتانی دارالحدیث ہے،اس جگہ بہت بڑا تالاب
تھا،بعض مرتبہ بارش کے زمانہ میں تالاب
بھر جاتا تو پانی درسگاہ میں بھی آجاتا تھا،اس لئے یہ

درسگاہ مناسب نہیں تھی، مگر پھر بھی میں نے اسی
درسگاہ کو پسند کیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس
درسگاہ کے بارے میں، میں اپنے بزرگوں سے
حضرت مولانا یعقوب صاحب کا مکاشفہ سنے
ہوئے تھا کہ میں اس درسگاہ سے عرش تک
نور کا ایک سلسلہ زنجیر کی مانند دیکھتا ہوں، اس لئے
اس میں حل مسائل کی برکت راسخ ہے۔''

(مظلوم شخصیت: ج ۱۔ صفحہ ۲۹۴)

درسگاہ کے برکات:-

چنانچہ قاری صاحب اپنی اس درسگاہ میں درس دیتے رہے، آپ کا انداز تدریس شروع ہی سے حل کتاب کا تھا، مسئلہ اور حل کتاب کی طرف آپ کی پوری توجہ رہتی تھی، آپ کی ہمیشہ کوشش یہی رہی کہ سبق کو آسان انداز میں حل کیا جائے اور اس کا خلاصہ اور مغز طلبہ کے سامنے مختصر انداز میں پیش کردیں کتاب حل کرنے کی آپ نے کوشش کی، ورنہ بغل میں دبا کر اساتذہ کی خدمت میں جا پہونچے اور کتاب کو حل کیا۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا کہ آپ بھی حل نہیں کر پاتے اور اساتذہ کی تقریر سے انشراح ہو نہیں پاتا تو اس ارادہ کے ساتھ درسگاہ تشریف لے جاتے کہ طلبہ سے کہدوں گا کہ یہ سبق حل نہیں ہوا یا انشراح نہیں ہوا، آپ کسی دوسرے استاذ سے رجوع فرمالیں، لیکن آپ درسگاہ تشریف لے جاتے اور خود بخود منجاب اللہ زبان پر ایک تقریر جاری ہوجاتی جو خود کیلئے بھی انشراح کا سبب ہوتی اور طلبہ بھی مطمئن ہوجاتے، دیکھئے اس طرح کے ایک واقعہ کا قاری صاحب نے تذکرہ کیا ہے:۔

''ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی کتاب میں کوئی سخت مقام
آگیا نہ خود سے حل ہوا اور نہ ہی اساتذہ کی
تقریر سے انشراح ہوا، ارادہ ہوا کہ طلبہ سے کہہ
دوں گا، اسکے حل کیلئے ہم نے بہت کوشش کی مگر حل

نہیں ہوسکا، بات میری سمجھ میں پوری طرح
نہیں آئی، تم لوگ کسی استاذ سے حل کرالینا، مگر جب
پڑھانے کا وقت آیا تو اس مشکل مقام کیلئے ایسی
تقریر خود بخود ذہن میں آئی کہ مسئلہ بالکل واضح
اور صاف ہوگیا اور طلبہ بھی منشرح ہوگئے میں نے
اسے نو درہ ہی کی برکت محسوس کی۔"

(مظلوم شخصیت۔ج۔ا۔ص ۲۹۵)

درس وتدریس پر محنت:۔

دور طالب علمی کو اسباب کی فراہمی کا دور کہا جاتا ہے، طالب علم اپنے دور طالب علمی میں علوم آلیہ کو حاصل کرلیتا ہے، وہ بھی اتنی حد تک کہ اس سے آگے چل کر علوم عالیہ کو حاصل کرسکے۔اس دور میں یہ سفر چاہے جہاں تک پہونچے بہرحال وہ سفر بے شعوری کا ہی ہوتا ہے، تحصیل علم کا اصل دور اور زمانہ مدرسی کا زمانہ ہے، اب انسان کا شعور بھی بالغ ہوتا ہے اور زمانہ طالب علمی میں حاصل کردہ اسباب کی مدد سے نئے سرے سے غور وخوض شروع کرتا ہے، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ ہر مسئلہ کی تحقیق کے بعد خوشی کے ساتھ ساتھ اپنے دور طالب علمی کی سمجھ پر ہنسی بھی آتی ہے۔اس کو اپنے مطالعہ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے کیا پڑھا، اور کیا سمجھا، وہ صحیح بھی تھا یا نہیں؟۔

تدریس کا دور غور وخوض اور محنت کا دور ہوتا ہے، معلم مطالعہ کے وقت مسئلہ پر ہر پہلو سے غور وفکر کرتا ہے۔اور جو معلومات اس کے ذہن میں جمع ہوتی ہے اس ذخیرہ میں سے سبق کے متعلق مواد اور مغز کو الگ ترتیب دیتا ہے، اور اس ترتیب میں بھی اس کو اپنے طلبہ کے اذہان کی ترتیب کا خیال رکھنا پڑتا ہے چونکہ ہر جماعت میں ذکی اور ذہین طلبہ کے ساتھ غبی طلبہ بھی ہوتے ہیں بلکہ سست اور لاپرواہ طلبہ کی بھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔معلم اس انداز پر اپنے سبق کی ترتیب رکھتا ہے جو ان سب کے لئے یکساں مفید ہو۔نیز استاذ اپنے ذہن کو ہر وقت چوکنا رکھتا ہے کہ نہ جانے کب اور کس مسئلہ میں ذکی اور ذہین طلبہ اعتراضات کا سلسلہ شروع کردیں۔

عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ جو استاذ ابتدائی درجات سے تدریس کا آغاز کرتا ہے، وہ جوں جوں ترقی کرتا ہے اس کے سبق میں جلا آتی چلی جاتی ہے اور اس کا انداز تفہیم سلجھنے لگتا ہے اور آگے چل کر ایک کامیاب مدرس بن جاتا ہے۔

قاری صاحب نے اپنی تدریس کا آغاز ابتدائی درجات کے کتابوں سے کیا نیز بتدریج ترقی کرکے ایک کامیاب مدرس ثابت ہوئے۔آپ کے ابتدائی دور کے شاگرد جناب پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی لکھتے ہیں:۔

''جوانی سے لیکر اب تک میں نے خوب دیکھا تعلیم
سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دارالعلوم میں ابتدائی
کتابیں پڑھانے لگے تھے۔میں نے ان سے
ہدایۃ النحو اور قدوری پڑھی تھی''

(انوارالقاسمی ۔ج۔۱۔ص۲۹۳)

درس وتدریس میں ترقی:۔

اس کے بعد قاری صاحب مسلسل ترقی کرتے رہے علم میں پختگی آتی گئی اور درس کو شہرت حاصل ہوتی رہی۔وجہ وہی ہے کہ آپ نے اپنی تدریس کا آغاز ابتدائی درجات سے کیا اور بتدریج ترقی کی۔درس نظامی کی یہ خصوصیت ہے کہ اوپر کے درجات کی کتابوں کا سمجھنا نیچے کی کتابوں کے سمجھنے پر موقوف ہے اوپر کی کتابوں کا درس انشراح کے ساتھ وہی استاد دے سکتا ہے جس نے ابتدائی درجات کو محنت اور جانفشانی سے پڑھایا ہو۔جناب عبداللہ جاوید صاحب لکھتے ہیں:۔

''پھر ہر سال اسباق میں ترقی ہوتی گئی،اور علم وفن
کی کتابیں آپنے پڑھائیں صرف،نحو،فقہ،حدیث
تفسیر،کلام معانی۔آپ کی محنت سے جہاں منتظمین
مطمئن اور خوش تھے وہیں پڑھنے والے طلبہ
بھی۔کیوں کہ آپ کا انداز بیاں دلنشین تھا،اپنے

اندر جذب وکشش رکھتا تھا''

(مظلوم شخصیت۔ج ا۔ص۔۲۹۳)

زیر درس کتب:۔

آپ نے درس وتدریس کے آغاز کے بعد مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں، خصوصیت سے حجۃ اللہ البالغہ آخری دم تک آپ کے زیر درس رہی۔ کتب حدیث میں سے ابن ماجہ، مشکوۃ شریف اور شمائل شریف ایک مدت تک آپ کے زیر درس رہی۔ کچھ مدت کے لئے آپ نے بخاری شریف کا بھی درس دیا، لیکن طبیعت کے ناساز ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

فن حدیث سے مناسبت:۔

قاری صاحب ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے، اس کی قدرے تفصیل باب اول میں بیان کی جاچکی ہے، آپ کے اجداد کے ہر طبقہ میں علم شناس حضرات موجود تھے، البتہ آخر میں آپ کے دادا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے دور میں علم معقول کے ساتھ ساتھ علم حدیث کا بھی کسی قدر شوق آپ کے گھرانے میں پیدا ہوگیا، حضرت نانوتوی کو علم حدیث سے شدید مناسبت تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ کے استاذ محترم محدث سہارنپوری نے بخاری شریف کے آخر کے چند پاروں کے تحشیہ کا کام آپ ہی کے سپرد کیا، حضرت نانوتوی کے بعد قاری صاحب کے والد حضرت مولانا محمد احمد صاحب خالص فقہ اور حدیث کے عالم تھے، آپ میں یہ خصوصیت اس قدر نمایاں تھی کہ نواب حیدرآباد نے آپ کو منصب قضاء کا عہدہ سونپ دیا۔

قاری صاحب پر والد کا خاصا اثر ہوا، اور انہوں نے براہ راست والد محترم سے اس اثر کو قبول کیا۔ حضرت حافظ صاحب نے بھی اس طرف توجہ دی چنانچہ ضعف کے باوجود قاری صاحب کو مشکوۃ شریف خود پڑھائی۔ اور دار العلوم دیوبند کا یہ وہ مبارک دور ہے کہ جب حدیث کے بلند پایہ محدثین جمع تھے، چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیری کے طریقہ درس حدیث، انداز استدلال اور حدیث کے ساتھ شدت اشتغال نے قاری صاحب کے ذوق کو جلا بخشی۔ چنانچہ ایس ایچ غوری کے ایک سوال کے

جواب میں قاری صاحب نے لکھا تھا:۔

میرے اساتذہ میں جن حضرات کے تعلیمی اور تر
بیتی مؤثرات نے مجھے زیادہ متاثر کیا ان میں اول
نمبر میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد
صاحب مہتمم خامس دارالعلوم ہیں، مجھے فن حدیث
سے مناسبت اور لگاؤ انہیں کے درس اور تربیت
سے پیدا ہوا ،اور دینی علوم وفنون میں میرا طبعی
رجحان اور میلان زیادہ تر حدیث کی طرف انہیں
کے تربیت سے ہوا ۔اس تاثر کو جلا اور وسعت
حضرت الاستاذ الاکبر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ
علیہ صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کے درس سے
ہوئی ،جن کے درس میں تمام ہی علوم وفنون سے
بحث ہوتی تھی۔

(حسن تدبیر۔سہ ماہی دہلی۔نومبر تا اپریل ۲۰۰۷۔ص۔۱۳۳)

طریقہ تدریس حدیث:۔

قاری صاحب اپنے طریقہ تدریس میں مجتہد قرار نہیں دئے جاسکتے۔چوں کہ قاری صاحب کو علم حدیث سے مناسبت والد محترم اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے درس سے ہوئی تھی لہٰذا آپ کے درس حدیث میں یہ مناسبت نمایاں ہے۔

ہم یہاں یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ حدیث کا قدیم طریقہ تدریس بالکل مختصر ہے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے یہاں درس حدیث بہت ہی مختصر ہوتا تھا عموماً ان حضرات کے یہاں اختلافات فقیہ اور دلائل ائمہ نیز طویل تقاریر کا رواج نہیں ملتا۔حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے طریقہ تدریس کو تفصیل سے اپنے فارسی رسالہ ''رسالۂ دانشمندی،، میں بیان کیا

ہے، وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔اور چونکہ علماء دیو بند خانوادۂ ولی اللہی سے استفادہ کرنے والے ہیں۔انہوں نے بھی اسی طریقہ کی اتباع کی۔علامہ کشمیری کا جب دور آیا تو انہوں نے باضابطہ تفصیلی درس کی بنیاد ڈالی اور اختلاف ائمہ ہوں یا دلائل ائمہ نیز تمام ہی علوم وفنون سے آپ شدت کے ساتھ بحث کرتے تھے۔اسی طریقہ تدریس کو دارالعلوم دیو بند کی تاریخ میں ''انقلاب'' کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔چنانچہ بعد والوں نے اسی طریقہ کو اپنایا۔

قاری صاحب کو چونکہ علامہ سے خصوصی تعلق اور لگاؤ تھا،اس کا پر تو آپ کے طریقہ تدریس پر بھی پڑا اور آپ بھی اسی لے میں بہ پڑے۔

آپ کے درس میں علوم نانوتوی:-

البتہ آپ کے درس میں علوم قاسمیہ بھی بکثرت ملتے ہیں، اگر اس سے ہٹ کر یہ بات کہی جائے تو صحیح ہوگی کہ آپ نے تشریحات اسلامیہ کو منقولات سے ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دلائل عقلیہ سے بھی واضح کرنے کا ایک نیا رخ دیا۔صرف یہی پہلو آپ کے اندر طریقہ تدریس میں بھی اجتہادی شان کی نشان دہی کرتا ہے۔

عقلی اور نقلی علوم کے امتزاج سے آپ کی تقریر موضوع کے ہر پہلو پر حاوی رہتی۔اور طلبہ کے لئے باعث اطمنان ہوتی۔عبداللہ جاوید ہاشمی نے لکھا ہے:

> حضرت حکیم الاسلام ایک طرف تو حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف کے صحیح وارث تھے اور دوسری طرف براہ راست حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری سے شرف تلمذ حاصل تھا،اس لئے آپ کے درس میں دونوں بزرگوں کے علوم ومعارف کا فیضان رہتا تھا چنانچہ آپ منقولات اور تشریحاتِ اسلامی کو دلائل عقلیہ سے اس انداز میں ثابت فرماتے کہ

جس سے ہر دور کا ذہن مطمئن ہو سکے اور حضرت
نانوتوی کے رنگ میں اسلامی تعلیمات پر تقریر اسی
نہج سے کرتے کہ مسئلہ کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہتا
تھا، جن لوگوں نے درسی تقاریر سنی ہیں وہ اس بات
کو جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ علوم قاسمیہ کا فیضان
اس طرح ہوتا کہ بے ساختہ حضرت کی زباں سے
حضرت نانوتوی کی پوری تقریر نقل ہوتی چلی جاتی
تھی۔ اور بسا اوقات تو اتنی ہم آہنگی ہوتی تھی کہ
الفاظ تک میں کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا حضرت حکیم
الاسلام سے راقم کو مشکوۃ شریف اور ابن ماجہ
شریف میں شرف تلمذ حاصل ہوا ہے''۔

(ذکر طیب۔ص ۷۸)

قاری صاحب کے درس میں علوم شاہ ولی اللہ کی جھلک:-

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی اسرار وحکم پر مشتمل شاہ کار ترین تالیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے حضرت قاری صاحب کو خصوصی شغف تھا۔ بلکہ آپ کو ہمیشہ ایسی کتابوں سے زیادہ دلچسپی رہی کہ جن میں حقائق الٰہیہ اور معارف ربانی کا خزانہ ہو۔حضرت شاہ ولی اللہ ،حضرت امام غزالی، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت نانوتوی کی کتابوں سے آپ کو طبعی دلچسپی تھی ،البتہ خصوصیت کے ساتھ زندگی بھر ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس دیتے رہے۔ایک مرتبہ جناب ایس ایچ غوری صاحب نے قاری صاحب سے تحریری سوال کیا تھا کہ آپ کی پسندیدہ کتب ، مصنف، شاعر ،موضوعات اور مجلّات کیا ہیں؟ حضرت قاری صاحب نے اس کا مندرجہ ذیل جواب دیا تھا:۔

''میری محبوب کتابیں عارفین کی وہ کتب ہیں جن
میں دین کی لمیات سے بحث ہوتی ہے اور اسی

لئے میرا قلبی رجحان زیادہ تر اپنے جد امجد حضرت
قاسم العلوم کی کتب کی طرف ہے کہ وہ حقائق
الٰہیہ اور معارف ربانی کا خزانہ ہوتی ہیں، نیز
حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت امام غزالی اور امام
ربانی حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شیخ اکبر
رحمہم اللہ کی مصنفات سے طبعی دلچسپی ہے گو وقت
مطالعہ کے لئے بہت کم ملتا ہے، اور اسی لئے
میرے درس میں زیادہ تر ''حجۃ اللہ البالغہ للشاہ ولی
اللہ رحمہ اللہ'' رہتی ہے۔ انہی سے اصولا فقہیات
دین حل ہوجاتی ہیں''۔

(حسن تدبیر۔ص۔۱۷۴)

حجۃ اللہ البالغہ کا درس:۔

آپ کی دلچسپی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی تقریر اور درس دونوں ہی حقائق الٰہیہ اور معارف ربانی کا خزانہ بن گئیں، بلکہ بعض مرتبہ آپ کی زبان سے حضرت نانوتوی کی کتب کے صفحات کے صفحات بیان ہوجاتے تھے۔ قاری صاحب کا ساکن وصف بحر علم و معرفت خود بخود متلاطم اور موجزن ہوجایا کرتا تھا اور آپ کے حکیمانہ و عارفانہ ذوق کے جواہر و اسرار کھلتے اور پڑھنے والوں کی نظر، تشریحات اسلامی کے ان مخفی گوشوں پر ایسی وسیع ہوجاتی، کہ جن کا سالہا سال کی شبانہ روز محنت کے بعد بھی میسر آنا مشکل ہے۔

جناب مولانا عبیداللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور حضرت قاری صاحب کے درس ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے تعلق سے لکھتے ہیں:۔

''امام رازی وغزالی کے علوم و معارف کے حافظ
تھے، اس کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم پر

بھی گرفت خوب مضبوط تھی، دارالعلوم دیو بند میں
ایک طویل مدت تک ”حجۃ اللہ البالغہ“ کا باقاعدہ
درس دیتے رہے۔ اس درس کی شان یہ ہوتی تھی
کہ اس وقت دارالعلوم کے بڑے بڑے اساتذہ
اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت قاری
صاحب اس طرح اس کی تشریح وتوضیح فرماتے کہ
سبحان اللہ! بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے نکلتا تھا۔

بوعلی وقت فخر الدین رازیِ زمان
شہ ولی اللہ دوران وغزالی زمان

(ذکر طیب۔ ص۔ ۲۱۱)

قاری صاحب مسند اہتمام پر:-

قاری صاحب جب دارالعلوم دیو بند میں مدرس ہوئے اس وقت آپ کے والد حضرت حافظ محمد احمد صاحب مہتمم تھے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نیابت اہتمام پر فائز تھے حضرت حافظ صاحب کا اکثر وقت حیدر آباد میں گزرتا تھا اور اہتمام کا مکمل کام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیکھتے تھے، جب یہ لوگ کمزور اور بوڑھے ہو گئے تو اواخر ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوری کے رکن مولانا سعید الدین صاحب رامپوری نے مجلس شوریٰ میں یہ تحریر پیش کی تھی کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم اپنی کبر سنی کے سبب سے ضعیف ہو گئے ہیں ہر چند ان حضرات نے اب تک خدمات دارالعلوم میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، تاہم مجلس شوری کا یہ فرض ہے کہ وہ اس امر کا احساس کرتے ہوئے ایسے وسائل اختیار کرے کہ جس سے ان حضرات کو فی الجملہ اپنے کاموں میں مدد مل سکے۔ رجسٹر تجاویز مجلس شوریٰ ۱۳۴۰ھ میں یہ تجویز ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

”حضرت مہتمم صاحب (یعنی حضرت مولانا حافظ
احمد صاحب) اور نائب مہتمم (یعنی حبیب الرحمٰن

صاحب عثمانی) سلمہما کی جو کچھ خدمات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات بہ وجہ تقاضائے عمر و نیز بہ سبب امراض گونا گوں ضعیف ہوگئے ہیں اگر چہ خدمات دارالعلوم میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے ہیں لیکن مجلس شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا احساس کرے، ایسے وسائل پیدا کرے، جس میں دونوں حضرات کو خاص طور سے اپنے کاموں میں امداد ملے، لہٰذا ایک عہدہ نائب دوم کا تجویز کرنا ضروری ہے اور اس خدمت پر ایسا شخص تجویز کرنا ضروری ہوگا جو صاحب علم، عالی خاندان اور باثر ہو، دارالعلوم کے ساتھ سچی اور دلی ہمدردی، مثل ان ہر دو حضرات کے رکھتا ہو پس میں اپنی رائے میں اس عہدے کیلئے مولانا قاری محمد طیب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کو تجویز کرتا ہوں ۔ مولانا موصوف، نوجوان، صالح، صاحب علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلٍ بعد نسلی سچی و دلی ہمدردی رکھنے والے ہیں۔

حضرت مہتمم صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے فرزند اکبر ہیں۔ مولانا طیب صاحب پوتے۔ حضرت مہتمم صاحب کے زمانے میں دارالعلوم کو جس قدر ترقیات آمدنی میں ہوئیں اور

جس قدر درجات تعلیم المضاعف ہوئے، جس قدر طلبہ کی تعداد بڑھی اور جس قدر ہندوستان سے باہر دور دراز اقالیم وممالک میں اس دارالعلوم دیوبند کی قدر ومنزلت قلوب میں عامۃً روز افزوں پیدا ہوئی، اس کے ثبوت میں خود دارالعلوم ایک مجسم شہادت موجود ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانان بہی خواہان دارالعلوم پر عموماً اور مجلس شوریٰ پر خصوصاً روحانی طور سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ میں بہ شرط قابلیت وصلاحیت، نظام دارالعلوم تفویض کردیا جائے، تاکہ وہ روحانی فیض جو ترقیات دارالعلوم کے لئے باطنی طور پر ممد ومعاون ہے، برابر جاری رہے۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۲۷۹۔ ج:۱)

دوبارہ نیابت اہتمام:۔

مجلس شوریٰ کی اس تجویز کی رو سے حضرت قاری صاحب کو ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں نیابت اہتمام سپرد کیا گیا، مگر قاری صاحب کی طبیعت علم دوست تھی، انتظام وانصرام سے آپ کو طبعی وحشت تھی۔ اسی بنیاد پر چند دنوں کے بعد ہی آپ نے انتظام سے اپنے آپ کو الگ کرکے تدریسی وتعلیمی شعبہ میں منتقل کروالیا۔ لیکن اکابر دارالعلوم کے اصرار پر دوبارہ نیابت اہتمام پر آپ کو واپس آنا پڑا۔

قائم مقام مہتمم:۔

حضرت قاری صاحب نیابت اہتمام کے عہدہ پر تقریباً سات سال ۱۳۴۸ھ تک اپنے والد ماجد اور حضرت حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کے زیر نگرانی ومشورہ کام کرتے رہے، لیکن وسط ۱۳۴۸ھ

میں حضرت حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے انتقال کی وجہ سے حضرت قاری صاحب کو قائم مقام مہتمم بنادیا گیا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد جب اس بات کا اندازہ کرلیا گیا کہ اس منصب جلیل کو سنبھالنے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود ہے تو مجلس شوریٰ نے اپنے ذیل کے فیصلے کے ساتھ انہیں مستقلاً مہتمم بنادیا۔

''ہم سب ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ۱۸رشوال ۱۳۴۸ھ سے ۲۱رشوال ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم کے تمام شعبوں کا غور سے معائنہ کیا جو امور بحث طلب مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ میں پیش کئے' ان کا بلا رورعایت تصفیہ کیا' ہم ممبران اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے مولوی قاری محمد طیب صاحب نے زمام اہتمام اپنے ہاتھ میں لی ہے' ان کے ہر طریق عمل سے صدق و اخلاص نیت' حب وبغض فی اللہ اور ادائے حقوق و فرض شناسی میں عزم قوی اور ثبات و استقلال بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے۔ **ولله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه.**

ہم سب حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے قوی امید رکھتے ہیں کہ تھوڑی سی مدت میں جن خوبیوں کا مہتمم صاحب سے ظہور ہوا ہے' انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس سے اضعافاً مضاعفۃ ظاہر ہوگا'' **وما ذلك على الله بعزيز**" یہ الفاظ بے اختیار قلب سے نکلے ہیں اس میں نہ نفع کو دخل ہے اور نہ مہتمم

صاحب کی خدمات کی داد ہے۔

(رجسٹر مجلس شوریٰ۔۱۳۴۰ھ)

حکیم الاسلام کا طویل دور اہتمام :۔

حضرت قاری صاحب منصب جلیل پر تقریباً ساٹھ سال فائز رہے۔ یہ منصب ان کو ۲۵۔۲۶ سال کی عمر میں ملا تھا۔ ان کے اس طویل دور اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کو ہمہ جہت پھولنے پھلنے کا موقع ملا' ہند اور بیرون ہند دارالعلوم دیوبند کا تعارف ہوا۔ دارالعلوم کی عمارتوں اور آمد میں حیران کن اضافہ ہوا' طلبہ کی خاصی تعداد بڑھی' متعدد شعبہ جات وجود میں آئے' آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم کو بے شمار مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن آپ کی حسن تدبیر نے ہر مشکل کو آسان کر دیا۔ مشہور ادیب مولانا نور عالم خلیل امینی لکھتے ہیں:

> ''حکیم الاسلام کا دور اہتمام نہ صرف سب سے زیادہ طویل تھا بلکہ دارالعلوم دیوبند کی ہمہ گیر ترقی' عالمی شہرت اور اس کے ایک مدرسہ سے واقعی جامعہ بننے کا عمل' انہی کے سعادت مندانہ دور میں پایہ انجام کو پہنچا۔ دارالعلوم کی اکثر قابل ذکر عمارتیں انہیں کے زمانے میں بنیں' دارلعلوم کے نئے نئے اور مفید سے مفید تر ضروری شعبے انہی کے دور میں قائم ہوئے' اندرون ملک و بیرون ملک کے بے شمار ممتاز علماء وفضلاء و مشاہیر وقت اور سرکاری وغیر سرکاری سربراہوں کے وفود کی دارالعلوم میں آمد اور اس کی دینی وعلمی مظہری ترقی سے اپنے غیر معمولی تأثر کا اظہار انہی کے دور اہتمام میں سب سے زیادہ روبعمل آیا۔

ملک کی آزادی اور اس کے بعد ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے کشت وخون کا طویل وشدید المناک واقعہ انہی کے زمانہ میں پیش آیا اور آزادی سے پہلے کے حالات سے یکسر مختلف آزادی کے بعد کے حالات سے دارالعلوم کو ہم آہنگ کرنے اوراپنی سمت سفر میں کسی تردد کے بغیر محوسفر رہنے کا یارا انہوں نے ہی دیا اور اپنی علمی لیاقت' اسلامی ذہانت اور ہمہ گیر فکری صلاحیت کی وجہ سے اس کی رفتار کار میں نہ صرف کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دیا' بلکہ بہ ظاہر احوال پہلے سے زیادہ تازہ دمی' تیز گامی اور اولوالعزمی کے ساتھ آگے بڑھنے اور علوم شریعت اور خدمت دین وملت کے میدان میں نئے نئے نقش ہائے عمل ثبت کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس طویل دور اہتمام میں دارالعلوم کے لئے بہت سے نازک موڑ آئے' جن سے حکیم الاسلام اپنی علمی و فکری و دینی بصیرت اور دوراندیشی کے ذریعہ بہ خوبی گزر گئے اور دارالعلوم کی رفتار عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا۔''

(پس مرگ زندہ۔ص:۱۲۳)

قاری صاحب کے دور اہتمام کی تعمیری' تعلیمی اور تنظیمی ترقیات:۔

ہم گذشتہ صفحات میں واضح کر چکے ہیں کہ حضرت قاری صاحب کا دور اہتمام دور ترقی ہے' آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم دیوبند نے ہمہ جہت ترقی کی' اگر آپ کے دور اہتمام کی ترقیات کا

تذکرہ اجمالاً نہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شخصیت کا تعارف خصوصاً آپ کا علمی اور انتظامی ذورق ادھورا رہ جائے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ حضرت قاری صاحب کے دور اہتمام میں دارالعلوم کی تعمیری، تعلیمی، تنظیمی، ترقی اور مشاہیر وقت کی آمد پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

قاری صاحب کے اسفار

(۱) حضرت قاری صاحب کا سفر افغانستان:-

دارالعلوم دیوبند میں ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر تبریک وتہنیت کا جلسہ منعقد ہوا اور اس موقع پر مجلس عاملہ نے طے کیا کہ دارالعلوم اور افغانستان کے قدیم علمی اور تعلیمی روابط کی تجدید اور ان کو مستحکم بنانے کیلئے مہتمم صاحب دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے کابل تشریف لے جائیں چنانچہ آپ کا یہ سفر ہوا اور آپ نے وہاں دارالعلوم کا زبردست تعارف کرایا۔

(۲) حضرت قاری صاحب کا سفر برما:-

۱۳۷۶ھ میں حضرت قاری صاحب نے برما کا سفر کیا۔ ان کا یہ سفر ۱۵/ جمادی الاول سے ۲۸/رجب تک جاری رہا جس کے دوران انہوں نے برما کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور عوام وخواص کے جلسوں کو خطاب کیا جس سے دارالعلوم کے تعارف اور حلقۂ اثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

(۳) قاری صاحب کا سفر افریقہ:-

۶ محرم ۱۳۷۹ھ کو ہمدردان دارالعلوم کی دعوت پر قاری صاحب نے ری یونین کا سفر فرمایا اس سفر کے دوران زنجبار، دارالسلام، موریشس، مڈغاسکر اور ری یونین کے مختلف شہروں کا دورہ کیا وہاں کے باشندوں نے جگہ جگہ جلسے کئے جنہیں حضرت قاری صاحب نے خطاب کیا۔

(۴) حضرت قاری صاحب کا سفر افریقہ ومصر:-

قاری صاحب نے ۱۳۸۳ھ میں دو بیرون سفر کئے پہلا سفر جنوبی افریقہ کا تھا، دوسرا مصر کا۔ یہ دونوں سفر مختلف حیثیتوں سے دارالعلوم کیلئے مفید ترین ثابت ہوئے۔ آپ کا یہ سفر اواخر محرم ۱۳۸۳ھ

میں شروع ہوا۔ جس وقت آپ جوہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر اترے تو جنوبی افریقہ کے چاروں صوبوں کے مسلمانوں کے نمائندے اجتماع خوش آمدید کہنے کیلئے مجتمع تھے جو تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھے۔ جوہانسبرگ کے ڈچ میئر ''اوبرہولز'' خیر مقدم کیلئے اپنی اہلیہ کے ساتھ موجود تھے۔ آپ نے اس موقع سے ڈربن اور کیپ ٹاون کا دورہ کیا اور بڑے بڑے اجتماعات کو خطاب کیا۔

(۵) دوسرا سفر:-

۱۹رشوال ۱۳۸۳ھ کو ''عالمی موتمر اسلامی'' قاہرہ کی دعوت پر ہوا۔ اس موتمر میں دنیائے اسلام کے ممتاز علماء کو دعوت دی گئی تھی، ہندوپاک کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیوبند تھے۔ دارالعلوم کے وفد میں قاری صاحب کے علاوہ مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا سعید اکبر آبادی بھی تھے۔ موتمر کے بعد قاری صاحب اور مولانا منت اللہ رحمانی قاہرہ سے حج بیت اللہ کیلئے حجاز تشریف لے گئے، اس دوران جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور اپنے اعزاز میں منعقدہ خیر مقدمی جلسے سے خطاب کیا، جس کے دوران آپ نے دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ ۶رمحرم ۱۳۸۴ھ کو دیوبند واپس تشریف لائے۔

(۶) قاری صاحب کا سفر یورپ:-

۱۴رجمادی الاخری ۱۳۹۱ھ میں قاری صاحب نے انگلستان، فرانس، اور مغربی جرمنی کا سفر کیا یہ سفر ۱۵رشعبان ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا۔ اس کے دوران آپ نے انگلستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا جس میں قابل ذکر یہ ہیں، گلوسٹر، بریڈ فورڈ باٹلے، بلیک برنڈ، برسٹنگ، بریٹن، شیفلڈ، کونٹری، برمنگھم، راجڈیل، وال سول اور لندن اس دوران آپ نے بڑے بڑے اجتماعات کو خطاب کیا اور بریڈ فورڈ یونیورسٹی کے طلبہ کی خواہش پر ان کے ایک جلسے میں بھی تقریر کی۔

۲۲ردسمبر ۱۹۷۱ء تک انگلستان میں قیام رہا، وہاں سے واپسی میں ''پیرس'' جانا ہوا، وہاں کے دو جلسوں میں عربی تقریریں کیں، پیرس سے ''مغربی جرمنی'' کا سفر ہوا اور وہاں سے مکہ مکرمہ حاضری ہوئی، عمرہ اور روضہ اقدس کی زیارت کے بعد ''کویت'' کا سفر ہوا وہاں مختصر قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی۔

(۷) قاری صاحب کا سفر افریقہ وحجاز و یورپ :-

اوائل شعبان ۱۳۹۵ھ میں مشرقی افریقہ کے ملک ''ری یونین'' میں ''سینٹ پیٹر'' کے مقام پر قاری صاحب نے عالی شان مسجد کا افتتاح کیا' وہاں سے ''رابطہ عالم اسلامی'' کی دعوت پر'' رسالۃ المسجد'' کے اجلاس میں شرکت کیلئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے' اس اجلاس میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی' مولانا منظور نعمانی اور مولانا منت اللہ رحمانی اراکین مجلس شوریٰ دارالعلوم نے بھی شرکت کی۔ مکہ مکرمہ سے قاری صاحب پیرس (فرانس) ہوتے ہوئے لندن تشریف لے گئے اور وہاں کے متعدد شہروں کے اجتماعات سے خطاب کیا۔

قاری صاحب کے دور اہتمام میں وفود کی آمد

(۱) علماء مصر کا وفد :-

۲/ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو جامعہ ازہر کے علماء کا ایک موقر وفد دارالعلوم آیا' جس نے دارالعلوم کا معائنہ کیا اور اساتذہ کی محنت اور تعلیم و تدریس کی جامعیت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوا۔ دارالعلوم اور جامعہ ازہر کے مابین ارتباط باہمی کے رشتے کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کئے جانے کی خواہش کا پرزور الفاظ میں اظہار فرمایا۔

(۲) حافظ محمد ابراہیم وزیر رسل ورسائل کا دورہ دارالعلوم :-

دارالعلوم کو ریلوے اسٹیشن سے ملانے کے لئے عرصہ سے ایک مستقل سڑک کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں جبکہ ہندوستان کے سات صوبوں میں قومی حکومت قائم ہوگئی تھی تو یوپی کی صوبائی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی گئی اس سلسلہ میں وزیر رسل ورسائل حافظ محمد ابراہیم تشریف لائے اور بچشم خود معائنہ کے بعد سڑک کی منظوری دی۔

(۳) سفیر افغانستان کی دارالعلوم میں آمد :-

۷/رجب ۱۳۶۹ھ کو سفیر افغانستان سردار نجیب اللہ خاں دارالعلوم میں سرکاری حیثیت سے

تشریف لائے، انہوں نے اس موقع سے فرمایا:

''دارالعلوم دیوبند افغانستان کے عوام کی نظر میں
ایک علمی درسگاہ ہے، مگر میں اپنے مشاہدہ کی بناء پر
کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک علمی درسگاہ ہی نہیں
بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم تنہا
ہندوستان کا ورثہ نہیں، بلکہ تمام عالم اسلام کی
میراث ہے''

(تاریخ دارالعلوم دیوبند ۔ص:۳۲۶۔ج۱)

(۴) مولانا آزاد کی تشریف آوری:-

۲۹/ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ کی صبح کو حکومت ہند کے وزیر تعلیم مولانا آزاد دارالعلوم دیوبند تشریف لائے ۔ اس موقع سے انہوں نے دارالعلوم کے طلبہ کو خطاب کیا اور حصول علم کی راہ میں انہیں انتھک کوشش کی دعوت دی۔

(۴) اچاریہ ونو بھاوے کی دارالعلوم آمد:-

۲۹/ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ مطابق ۲/دسمبر ۱۹۵۱ء کو ''اچاریہ ونو بھاوے'' اپنی بھومی دان تحریک کے سلسلہ میں وارد دیوبند ہوئے، سات بجے شب ہی دارالعلوم دیکھنے آئے اور طلبہ کی خواہش پر ان کے درمیان ایک مختصر سی تقریر میں کہا :

''یہ یونیورسٹی ہمارے ملک کا بہترین سرمایہ ہے
جس میں پورے ایشیا کے نوجوان جمع ہیں غلامی
کے دور میں اس یونیورسٹی نے جو خدمات انجام
دی ہیں مجھے امید ہے کہ یہ آزادی کے دور میں
اس سے بہت زیادہ عظیم الشان خدمات انجام

دے گی۔انہوں نے کہا: یہی ایک ادارہ ہے جس
نے پہلے دن سے برطانوی سامراج کی مخالفت
کی اور اس مخالفت میں ہر محاذ پر سب سے پہلے
قربانیاں دیں''۔

(تاریخ دارالعلوم۔ص۳۳۲ج ا)

(۵) ایک مصری فاضل کا ورود:۔

۱۳۷۱ھ میں عرب لیگ نے دارالعلوم کے نوادر مخطوطات کے مشاہدے اور ان کے حصول کے لئے اپنے نمائندے شیخ محمد رشاد بن عبدالمطلب کو دیوبند بھیجا۔ انہوں نے کتاب معائنہ میں دارالعلوم کے حوالے سے جو کچھ کہا اس میں یہ بھی لکھا کہ :

کوئی شبہ نہیں کہ فخر ومباہات کے زبردست اسباب
میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ میں نے اس
ادارے کی زیارت کی جو مضبوط بنیادوں پر قائم
ہے کیوں کہ اس کے قائم کرنے والے انتہائی مخلص
اور صالح تھے۔

(تاریخ دارالعلوم۔ص۳۳۴ج ا)

(٦) انورالسادات کی دارالعلوم آمد:۔

۱۳۷۳ھ میں عرب جمہوریہ مصر کے بعد میں ہونے والے صدر محمد انور السادات جو اس وقت ''موتمر اسلامی'' کے جنرل سکریٹری تھے' دارالعلوم تشریف لائے' اس موقع سے انہوں نے کتاب معائنہ میں لکھا:

''اس عظیم دینی اور تاریخی درسگاہ کی زیارت نے
مجھے مجبور کیا کہ میں بہ صمیم قلب اپنے بھائیوں کی

خدمت میں مبارکباد پیش کروں جو اس عظیم
ادارے کو چلا رہے ہیں۔"

(تاریخ دارالعلوم ص ۳۳۷۔ ج ۱)

(۷) صدر جمہوریہ ہند کی دارالعلوم آمد:۔

۱۴رذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد دارالعلوم تشریف لائے' اس موقع سے ایک عظیم الشان جلسے کو صدر نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"دارالعلوم کے بزرگوں نے صرف اس ملک
کے رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ
انہوں نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل
کرلی ہے کہ غیر ملک کے طالب علم بھی آپ کے
یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پا کر اپنے
ملکوں میں واپس جا کر اس کی اشاعت کرتے
ہیں میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم میں جو علم سکھایا
جاتا ہے اس سے صرف دارالعلوم یا مسلمانوں کی
خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور پوری دنیا کی
خدمت ہوتی ہے ۔ آج دنیا میں مادیت کے
فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کا صحیح
علاج روحانیت میں دیکھتا ہوں کہ سکون اور
اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے
لئے مہیا فرما رہے ہیں"۔

(تاریخ دارالعلوم۔ص ۳۴۳۔ ج ۱:)

(۸) شاہ افغانستان کا دورہ:-

۵/شعبان ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵/فروری ۱۹۵۸ء کو شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ بہ ذریعہ کار دہلی سے دارالعلوم تشریف لائے یہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔شاہ افغانستان نے دارالعلوم کے دار جدید کے احاطے میں ۲۰ ہزار افراد کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

''میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع ملا' یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور پر وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور ومعروف ہے۔افغانستان کے علماء دارالعلوم کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو عزت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' افغانستان میں اس دارالعلوم کی شہرت محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ ایک مشہور ادارہ ہے بلکہ دراصل یہ نتیجہ ہے ان تعلقات کا جو افغانستان اور اس دارالعلوم کے درمیان عرصۂ دراز سے قائم ہیں۔''

(تاریخ دارالعلوم۔ص ۳۵۶۔ج۔۱)

(۹) ڈاکٹر پی ہارڈی کی آمد:-

۱۳۸۰ھ میں لندن یونیورسٹی میں ''شعبہ تعلیم اسلام'' کے لکچرار ڈاکٹر ''پی ہارڈی'' اپنی تاریخی تحقیق کے سلسلہ میں دیوبند آئے اور ایک ہفتہ دارالعلوم میں قیام کیا وہ دارالعلوم سے بہت متاثر ہوئے اور کتاب معائنہ میں عقیدت مندانہ تاثرات کا اظہار اس طرح کیا۔

''یہاں آنے کے بعد میں نے دارالعلوم دیوبند آنے کا ارادہ کیا تاکہ اپنا مقصد حاصل کرسکوں'

یہاں آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ میری توقعات
پوری ہوئیں بلکہ بہترین اخلاق اور مخلصانہ تعاون
نے مجھے بے حد متاثر کیا' یہاں فاضل علماء نے
میری رہنمائی کی''

(تاریخ دارالعلوم۔ص۳۶۱۔ج۔۱)

(۱۰) مسٹر ہمایوں کبیر کی آمد:-

جمادی الاول ۱۳۸۱ھ میں مرکزی حکومت کے وزیر ثقافت و سائنسی تحقیقات ''پروفیسر ہمایوں کبیر'' دارالعلوم آئے اور انہوں نے خیر مقدمی جلسے میں دارالعلوم کی دینی اور ملکی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور فرمایا:

''یہ دارالعلوم ایشیا میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے''

(تاریخ دارالعلوم۔ص۳۶۴۔ج۔۱)

(۱۱) شام کے جلیل القدر عالم عبدالفتاح ابوغدہ کی آمد:-

۱۳۸۲ھ میں جامعہ حلب شام کے استاذ جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے دارالعلوم کو دیکھ کر جن تاثرات کا اظہار فرمایا وہ غیر معمولی ہیں۔انہوں نے اس موقع سے مشائخ دارالعلوم کی اردو کتابوں کا عربی ترجمہ کرنے کی دعوت دی۔

(۱۲) اتر پردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد:-

۲۳/مارچ ۱۹۶۵ء کو اتر پردیش کے گورنر'' وشواناتھ داس'' دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر جلسہ عام میں اپنے گہرے اور گراں قدر تاثرات کا اظہار کیا۔

(۱۳) مغربی ممالک کے ریسرچ اسکالرس کی دارالعلوم آمد:-

۱۳۸۹ھ میں امریکہ سے مسز'' گیلی گراہم' جرمنی سے مس'' کیریں ڈیٹ میرا'' اور کیلی فورنیا سے'' مسز مٹکاف'' اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کیلئے دیوبند آئیں اور دارالعلوم کے کتب خانے سے

استفادہ کیا۔ جرمن طالبہ نے اپنا یہ تاثر بیان کیا کہ :

''مجھے دارالعلوم میں توقع سے زیادہ مواد ملا۔ مجھے
امید نہیں تھی کہ میرے تحقیقی مقالے کے تعلق سے
یہاں کی لائبریری میں اتنا زیادہ مواد مل سکے گا''

(تاریخ دارالعلوم ۔ص۳۹۸۔ج۔۱)

(۱۴) عرب ممالک کے زائرین کے تاثرات:-

رجب ۱۳۸۹ھ میں عرب ملکوں میں سے مراکش، الجزائر اور مشرق اردن کے چند حضرات دارالعلوم تشریف لائے اور اپنے گراں قدر تاثرات کا اظہار فرمایا۔

(۱۵) آل انڈیا زرعی کمیشن کے ایک ممبر کی دارالعلوم آمد:-

۱۳۹۱ھ میں آل انڈیا زرعی کمیشن کے ایک ممبر ''چودھری رندیر سنگھ'' نے دارالعلوم کا دورہ کیا اور پر جوش تقریر میں کہا:

''آپ سے بہت ہی پرخلوص اور صاف لفظوں
میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ بحیثیت
مسلمان اس ملک کے اہم فرقے کے افراد ہیں،
آپ کو فرقہ پرستوں کی تنگ نظریوں سے پریشان یا
متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مسلمانوں کا اس
ملک پر بڑا احسان ہے، انہوں نے مزید کہا:: کہ ہم
اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس ملک میں
اسلام کے نام پر اور اسلام کی سچی روشنی پھیلانے
والے لوگ اور ادارے موجود ہیں''

(تاریخ دارالعلوم ۔ص۴۰۱۔ج۔۱)

(۱۶) مصری ثقافتی وفد کی آمد:-

۱۳۹۱ھ میں ''محمد توفیق عویضہ'' کی قیادت میں مصر کا ایک وفد دہلی سے بہ ذریعہ کار دیوبند پہنچا' وفد نے ملاقات کے دوران کہا کہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں علامہ رشید رضا کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ

''ہندوستان میں جس شخص نے دارالعلوم کو
نہیں دیکھا اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا''

(تاریخ دارالعلوم۔ص ۴۱۰۔ ج۔۱)

(۱۷) جاپانی وفد کی آمد:-

۷ ستمبر ۱۹۷۲ء کو بہ ذریعہ کار دہلی سے ٹوکیو یونیورسٹی جاپان کے اردو پروفیسر ''تاکشین سوزوا'' اور تاریخ کے پروفیسر ''مت میوآرا'' ایک اسکالر خاتون کے ساتھ دارالعلوم آئے اور دارالعلوم کی معلومات حاصل کیں۔ وہ یہاں کے ماحول اور پرسکون فضا سے بہت متاثر ہوئے۔

(۱۸) رابطہ عالم اسلامی کے وفود کی آمد:-

۱۳۹۳ھ میں سعودی عرب سے دو وفد دارالعلوم آئے' ایک وفد ''رابطہ عالم اسلامی'' مکہ مکرمہ کی جانب سے دارالعلوم آیا' جو دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر رہا تھا' اس وفد کے سربراہ ''سید ابراہیم ثقاف'' تھے اس کے کچھ عرصے بعد دوسرا وفد شعبان ۱۳۹۴ھ کے اوائل میں آیا اس میں وزارت معارف کے ڈائرکٹر اور ادارہ ''مباحث اسلامیہ'' کے نمائندے شامل تھے۔ ان حضرات نے دارالعلوم کو دیکھنے کے بعد اسے علم کا روشن مینارہ' عرفان و معرفت کا مرجع اور طالبین ہدایت کی پناہ گاہ قرار دیا۔

(۱۹) گورنر اتر پردیش کی آمد:-

۱۳۹۳ھ کے اواخر میں اتر پردیش کے گورنر ''اکبر علی خان'' دارالعلوم دیکھنے آئے۔ موصوف نے دارالعلوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ'

''یہ اکابر دیوبند ہی تھے جنہوں نے کروڑوں

انسانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ اور جنگ
آزادی میں حصہ لینے کے لئے زبردست جذبات
پیدا کئے، ہندو مسلم اتفاق، انسانیت کی اعلیٰ قدروں
کی حفاظت اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے
اسوہ حسنہ اور تعلیمات مقدسہ کی ترویج و اشاعت
کی وہ مشعل روشن کی جس سے پورے ملک کا
گوشہ گوشہ منور ہو گیا، علم و دانش کا یہ گہوارہ اسلامی
تعلیمات کا بین الاقوامی مرکز، جنگ آزادی کا
مضبوط قلعہ، یکجہتی کا مرکز اور ہندوستان جیسے ملک
کی عظمتوں کا امین ہے''

(تاریخ دارالعلوم۔ص ۴۱۱۔ ج۔۱)

(۲۰) شیخ الازہر اور دیگر علمائے عرب کی آمد:۔

۱۳۹۵ھ میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر، شیخ عبدالرحمٰن بیطار، مفتی اعظم مصر محمد خالد اور سابق شیخ الازہر شیخ محمد الفحام دارالعلوم تشریف لائے، شیخ الازہر نے اپنے خطاب میں کہا کہ:

''میں یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مہتمم
دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، رفعت علم اور
اخلاص للّٰہیت ہی کے یہ آثار ہیں جو اس ادارے
میں دیکھے جارہے ہیں''۔

شیخ محمد الفحام نے فرمایا:

''میں ایک زمانے سے دارالعلوم دیوبند کی زیارت
کا مشتاق تھا، میرا یہ اشتیاق دن بہ دن بڑھتا رہا،
میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری موت اس

وقت تک نہ آئے جب تک میں دارالعلوم دیوبند کی
زیارت نہ کرلوں، الحمدللہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی
جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا، میں نے اپنی آنکھ
سے جو کچھ یہاں دیکھا وہ اس سے بہت زیادہ ہے
جو میں نے سنا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ
دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء کو ہر قسم کی توفیق
اور ترقی سے نوازے، یہ ادارہ اسلام کے قلعوں
میں سے ایک محفوظ قلعہ ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں
کی اعانت فرمائے جو اس میں کام کر رہے ہیں
تاکہ وہ اسلام کی خوب سے خوب تر خدمت
انجام دے سکیں۔"

(تاریخ دارالعلوم۔ ص ۴۱۵۔ ج۔ ۱)

ان حضرات کے چند روز بعد علمائے عرب کی ایک دوسری جماعت آئی جس میں یوسف السید ہاشم رفاعی وزیر حکومت کویت، استاذ عبدالرحمٰن مدیر البلاغ کویت اور قطر کے شیخ عبدالمعز عبدالستار کے ساتھ "تاشقند" کے نمائندے "شرف الدین محدوف" وغیرہ شامل تھے، یوسف السید ہاشم رفاعی نے فرمایا کہ:

"اس فکری چیلنج کیلئے ہمیں علمائے راسخین کی
ضرورت ہے اور علمائے راسخین پیدا کرنے کے
لئے دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے کی ضرورت ہے
اور یہ ضرورت صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ
سارے عالم کی ضرورت ہے"۔

شیخ عبدالمعز عبدالستار نے فرمایا کہ:

''ہم اپنے وطن میں برابر دارالعلوم کے بارے میں
سنتے اور پڑھتے رہتے تھے اور جانتے تھے کہ
دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دین کی روشنی کا
مینار ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے سارے عالم
اسلام کو منور کررہا ہے' اللہ تعالیٰ آپ کے مستقبل کو
حال سے زیادہ بہتر بنائے جیسا کہ اس نے حال کو
ماضی سے بہتر بنایا''۔

(تاریخ دارالعلوم۔ص۔۱۷۔۴۱۶۔ج۔۱)

(۲۱) صدر جمہوریہ ہند کی آمد:۔

۲۳؍ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کو صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد دارالعلوم کی زیارت کو دہلی سے بذریعہ ہیلی کوپٹر تشریف لائے۔ یوپی کے وزیراعلیٰ اور گورنر کے علاوہ چند مرکزی اور صوبائی وزراء بھی ہمرکاب تھے۔

صدر جمہوریہ نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا کہ:

''یہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری
دنیائے اسلام کی ایک اہم عظیم تاریخی اور دینی
درسگاہ ہے میں اس کے اکابر اور اساتذہ کے خلوص
اور اسلامی سادگی سے بے حد متاثر ہوں۔''

(تاریخ دارالعلوم۔ص ۴۱۹۔ج۔۱)

دارالعلوم کی ترقیات

(۱) بالائی مسجد کی تعمیر:۔

آپ نے سب سے پہلے دارالعلوم کی مسجد قدیم کی بالائی منزل تعمیر اور توسیع کی چونکہ طلبہ کی

روز افزوں کثرت کے سبب سے مسجد دارالعلوم تنگ ہوگئی تھی، بالخصوص دھوپ اور بارش میں سخت تکلیف پیش آتی تھی۔ محبوب رضوی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے سب سے پہلے جو اقدامی تجویز اپنے قلم سے لکھی وہ مسجد کی بالائی منزل کی تعمیر سے متعلق تھی، نیز صحن مسجد کو بھی مشرق کی جانب بڑھایا گیا اور حوض جو پہلے صحن کے آخر میں تھا توسیع کے بعد تقریباً وسط میں ہوگیا''۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ص ۲۸۲۔ ج:۱)

(۲) دارالحدیث کی تکمیل:-

دارالحدیث کی پرشکوہ عمارت جو عرصے سے زیر تعمیر تھی، حضرت قاری صاحب کے دور اہتمام میں پوری ہوئی۔

(۳) دورۂ تفسیر کا اجراء :-

حضرت شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کے مدارس میں علم حدیث کی کتابوں میں سے صرف مشکوٰۃ المصابیح یا شارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے علم حدیث کے معیار کو بلند کیا اور باقاعدہ صحاح ستہ کی تدریس شروع کی۔ دارالعلوم دیوبند نے حضرت شاہ صاحب کے اس معیار کو باقی رکھا۔

علم تفسیر میں قاری صاحب کے دور اہتمام سے پہلے تک تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی کی صرف سورہ بقرہ داخل نصاب تھی، ان کتابوں سے قدرے مناسبت تو پیدا ہو جاتی تھی لیکن علم تفسیر میں رسوخ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ تجویز زیر غور تھی کہ ان کے ساتھ مزید کچھ کتابوں کا اضافہ کیا جائے چنانچہ قاری صاحب کے زمانہ میں مزید دو کتابیں داخل نصاب کی گئیں ایک تفسیر بیضاوی مکمل

اور دوسری تفسیر ابن کثیر اور اس طرح دورۂ تفسیر کا اجراء عمل میں آیا۔

(۴) دار الحدیث فوقانی کی تعمیر:-

۱۳۵۲ھ میں دار الحدیث فوقانی کی تعمیر مکمل ہوئی۔

(۵) ۱۳۵۲ھ میں قواعد داخلہ میں اصلاح ہوئی:-

اس سے پہلے طالب علم کے داخلہ کی کارروائی دستی لکھی ہوئی درخواست پر ہوتی تھی، جس کی وجہ سے داخلہ میں تاخیر ہوتی تھی، اب جدید وقدیم طلبہ کیلئے الگ الگ فارم طبع کرائے گئے اور فارم کو کچھ اس طرح ترتیب دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر تمام شعبہ جات سے گزر کر داخلہ مکمل ہو جائے۔

(۶) طعام ٹکٹ کا اجراء:-

۱۳۵۲ھ میں طعام ٹکٹ کا اجراء عمل میں آیا۔ اب تک طلبہ کیف ما اتفق کھانا کھالیتے تھے، لیکن اب باقاعدہ طعام ٹکٹ جاری کیا گیا اور مستقل نظام ترتیب دیا گیا۔

(۷) صدارت اہتمام:-

۱۳۵۴ھ میں مجلس شوریٰ نے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کو ان کی عظیم شخصیت اور علم وفضل کے پیش نظر صدارت اہتمام کے لئے منتخب کیا، اس زمانہ میں علامہ کا مستقل قیام گجرات کے مشہور ڈابھیل میں تھا، علامہ وہاں سے بالکلیہ قطع تعلق کے لئے آمادہ نہ تھے چنانچہ ابتداء کچھ مدت تک یہ صورت رہی کہ کچھ عرصہ ڈابھیل میں قیام فرماتے تھے اور کچھ عرصہ دیوبند میں مگر بالآخر دار العلوم کی مرکزیت نے ان کو یہاں کھینچ لیا۔

(۸) حضرت تھانوی کا سرپرستی سے مستعفی ہونا:-

دار العلوم دیوبند میں اہتمام سے اوپر مجلس شوریٰ کو ہیئت حاکمہ حاصل ہے، البتہ ہمیشہ مجلس شوریٰ ایک سرپرست بھی طے کرتی تھی۔ سرپرست کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں محبوب رضوی لکھتے ہیں:

”سرپرست کے اختیارات کا حاصل یہ تھا کہ

ممبران میں اختلاف رائے کی صورت میں
سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا' اس
میں خواہ سرپرست کی رائے قلت ہی کی جانب
کیوں نہ ہو' البتہ اگر ممبران متفقہ طور پر کسی چیز کو
پاس کرتے اور سرپرست کو اس سے اختلاف ہوتا
تو وہ وجوہ اختلاف کو مدلل تحریر کرکے مجلس میں
دوبارہ غور وخوض کیلئے بھیج دیتے تھے' اس صورت
میں اگر مجلس اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرتی تو
البتہ مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی تھی اور بغیر
استرضائے سرپرست اس کا نفاذ ہوجاتا تھا۔

(تاریخ دارالعلوم دیو بند۔ ص ۲۸۶۔ ج:۱)

۱۳۴۵ھ میں جب انتظامی امور کے لئے قوانین مدون ہوئے تو مندرجہ بالا طریق عمل باضابطہ بنادیا گیا' مگر ۱۳۴۸ھ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بارے میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہوگیا' ایک جماعت کی رائے تو اس طریق عمل کی حمایت میں تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے کسی اور عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر رکھنا چاہتی تھی' چنانچہ شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا' حضرت تھانوی علیہ الرحمہ جو ۱۳۴۴ھ سے سرپرست تھے ازخود مستعفی ہوگئے' رجب ۱۳۴۵ھ میں مجلس شوریٰ نے حسب ذیل الفاظ میں یہ استعفیٰ منظور کرلیا:

"مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس پورے غور وفکر اور احترام
و تقدیس اور عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت
مولانا تھانوی مدظلہ کے استعفیٰ کو نہایت افسوس کے
ساتھ منظور کرتا ہے اور حضرت ممدوح سے

درخواست کرتا ہے کہ اپنی دعوت صالحہ اورتوجہات
عالیہ سے دارالعلوم پر ہمیشہ ظل گستر رہیں گے۔"

(روداد مجلس شوریٰ۔۳۰/رجب ۱۳۵۴ھ)

(۹) شعبہ تنظیم وترقی کا قیام:۔

۱۳۵۵ھ میں شعبہ تنظیم وترقی کا قیام عمل میں آیا۔اس شعبہ کا مقصد دارالعلوم کے اثرات کو ہمہ گیر بنانا تھااوراس کی صورت یہ تھی کہ اس شعبہ کے تحت سفراء کاتقرر کیا جائے اور وہ ملک کے کونے کونے میں فضلاء دارالعلوم اور دیگر حضرات کوسالانہ کم ازکم ایک روپیہ کاممبر بنائیں۔

(۱۰) شعبہ محافظ خانہ:۔

یہ شعبہ بھی ۱۳۵۵ھ میں قائم ہو۔اس شعبہ کا مقصد دارالعلوم کے کاغذات وغیرہ کی حفاظت تھی تاکہ تمام کاغذات محفوظ رہیں اور بوقت ضرورت آسانی سے مل جائیں۔

(۱۱) شعبہ ورزش :۔

یہ شعبہ بھی ۱۳۵۵ھ میں قائم ہوا۔تفریح اور ورزش کے فوائد محتاج تعارف نہیں ہیں۔دن رات محنت کرنے والے طلبہ کی ذہنی تھکن کو دور کرنے کے لئے یہ شعبہ قائم ہوا۔اس میں جسمانی ورزشوں کے علاوہ لاٹھی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

(۱۲) چند جدید عمارتیں:۔

۱۳۵۶ھ میں چند جدید عمارتیں وجود میں آئیں۔درجہ فارسی کی درسگاہ "یادگار سعدی" کے نام سے تعمیر ہوئی، دوسری محافظ خانہ کی دومنزلہ عمارت ہے جو دارالاہتمام کی جنوبی سمت میں واقع ہے۔ تیسری عمارت دار جدید کی تکمیل سے متعلق ہے جو مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے دور میں تعمیر ہونا شروع ہوئی تھیں لیکن اس کی تکمیل حضرت قاری صاحب کے دور میں پایہ انجام کو پہنچی۔

(۱۳) سلطان ابن سعود کا علمی ہدیہ:۔

۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی حج کے لئے تشریف لے گئے جس کے دوران ان کی سلطان ابن سعود سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کتب خانہ دارالعلوم کے لئے حکومت حجاز کی جانب سے شائع شدہ کتابیں عنایت فرمائیں۔

۱۳۵۸ھ میں دارالحدیث کی بالائی منزل کی درسگاہ دارالتفسیر کے نام سے تعمیر کی گئی اور دارالتفسیر کے اوپر ایک پرشکوہ گنبد بنایا گیا جو ایسا لگتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھ دیا گیا ہو۔

(۱۴) باب الظاہر کی تعمیر:۔

۱۳۵۹ھ میں افغانی عطیے کے مصرف کے تعلق سے مجلس شوریٰ نے طے کیا کہ چونکہ دارالعلوم کی مخصوص سڑک تیار ہوگئی ہے اور دارالتفسیر کا گنبد بھی مکمل ہو چکا ہے اس لئے دارالحدیث کے بالمقابل دارالطلبہ کے صدر دروازے کا بنوایا جانا ضروری ہوگیا ہے' لہٰذا افغانی عطیے سے شاہ افغانستان کے نام پر صدر دروازہ تعمیر کروا کے اس کا نام ''باب الظاہر'' رکھا جائے' اس کا سنگ بنیاد نواب صدر یار جنگ' مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ ۔۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء) کے ذریعہ رکھوایا گیا۔

(۱۵) مسلم یونیورسٹی میں حضرت قاری صاحب کی تقریر:۔

مسلم یونیورسٹی کی انجمن ''اسلامی تاریخ و تمدن'' کی جانب سے حضرت قاری صاحب کو'' اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر تقریر کی دعوت دی گئی۔ آپ دعوت قبول کرتے ہوئے وہاں تشریف لے جاکر' مذکورہ موضوع پر معرکۃ الآراء عالمانہ وفلسفیانہ تقریر فرمائی' جو وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے حلقوں میں بے حد پسند کی گئی۔

(۱۶) دارالاقامہ کی تکمیل:۔

۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء کا زمانہ تباہی کا زمانہ ہے اسی سال جنگ عظیم ہوئی' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس ماحول میں بھی دارالعلوم کی مدد فرمائی' حضرت قاری صاحب نے مدراس کا سفر کیا اور ۴۷

ہزار کی بڑی رقم حاصل ہوئی' واپسی میں کلکتہ تشریف لے گئے وہاں بھی ۲۲ہزار کی رقم حاصل ہوئی ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دارالاقامہ کی تکمیل فرمائی۔

(۱۷) ماہنامہ دارالعلوم کا اجراء:-

۱۳۲۸ھ میں ماہنامہ ''القاسم'' دارالعلوم نے جاری کیا تھا تاکہ عام مسلمانوں کی اصلاح ہوسکے' لیکن وہ رسالہ ۱۱سال کامیابی سے نکلنے کے بعد بند ہوگیا اور طویل مدت تک کوئی رسالہ جاری نہ ہوسکا اس درمیان مخلصین ومتوسلین کی طرف سے مسلسل اصرار رہا' آخر دارالعلوم نے جمادی الاولی ۱۳۶۰ھ سے ''دارالعلوم'' کے نام سے ایک اردو ماہنامہ کا اجراء کیا۔

(۱۸) علامہ عثمانی کی یکسوئی:-

۱۳۵۴ھ میں علامہ شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم مقرر ہوئے تھے' ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں مجلس شوریٰ نے وقتی حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اختیارات مہتمم دارالعلوم مولانا قاری محمد طیب صاحب کو منتقل کردیے اور علامہ عثمانی مستعفی ہوکر اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہوگئے۔

(۱۹) شعبہ خوش خطی کا اجراء:-

فن کتابت کو زندہ رکھنے کیلئے ۱۳۶۴ھ میں شعبہ خوشخطی کا اجراء عمل میں آیا۔

(۲۰) دارالصنائع کا قیام:-

دارالعلوم کا بنیادی مقصد تعلیم وتدریس اور تبلیغ ودینی قیادت ہے' لیکن طلباء کے لئے معاشی راہیں کشادہ کرنے کیلئے دارالعلوم نے مولانا عبدالغفور صاحب امام مسجد دارالعلوم کی سعی سے شعبہ تجلید کا آغاز کیا اور پھر اسی شعبہ سے ۱۳۶۵ھ میں دارالصنائع کا قیام عمل میں آیا۔

(۲۱) دارالافتاء کی جدید عمارت:-

قدیم دارالافتاء کی عمارت بہت مختصر تھی اور آخری دور میں دارالعلوم کی شہرت کے ساتھ رجوع بھی زیادہ ہوگیا جس کی وجہ سے دارالافتاء میں کارکنان کا اضافہ کیا گیا تو عمارت ناکافی ہوگئی

'اس لیے ۱۳۶۷ھ میں دارالافتاء کی متعدد کمروں پر مشتمل عمارت بن کر تیار ہوئی اور دارالافتاء کو اس میں منتقل کیا گیا۔

(۲۲) مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لیے علماء دیوبند کا انتخاب:-

۱۳۶۸ھ میں پہلا موقع تھا کہ مسلم یونیورسٹی نے اپنے کورٹ کے لیے علماء دیوبند کو منتخب کیا' مولانا حفظ الرحمٰن سعید ہاروی' مولانا محفوظ الرحمٰن نامی اور مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو کورٹ کی رکنیت کیلئے منتخب کیا گیا۔

(۲۳) حکومت ہند کی جانب سے بیرون ہند دارالعلوم کا تعارف:-

۱۳۶۹ھ میں ہی وزارت خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کے سلسلے میں اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دارالعلوم کی تاریخ اور موجودہ حالات کا بیرونی دنیا' بالخصوص مشرق وسطی کے ممالک میں تعارف کرایا جائے' چنانچہ اس مقصد سے دارالعلوم کے حالات اور تصاویر لینے کے لئے یکے بعد دیگرے وزارت خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے اراکین دیوبند آئے جنہوں نے معائنے کے بعد بلند آواز میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

(۲۴) شعبہ طب میں اضافہ اور دارالشفاء کا قیام:-

۱۳۷۲ھ میں دارالعلوم نے شعبہ طب میں اضافہ کیا اور دارالشفاء میں سات معالجین' چھ کارکنان اور دوا کی تقسیم کے لئے افراد میں اضافہ کیا۔

(۲۵) ملک حجاز کا پیغام تبریک وعطیہ:-

مسجد نبوی میں توسیع کے ارادہ اور اس کے لئے نقشہ تیار کئے جانے کے موقع سے ۱۳۷۳ھ میں دارالعلوم نے اپنی طرف سے شاہ سعود کو مبارک باد پیش کی' جس کے جواب میں شاہ سعود نے اپنے سفیر ہند کے ذریعہ دارالعلوم کا شکریہ ادا کیا۔ اتفاق سے اسی سال شاہ سعود ہندوستان تشریف لائے اور دارالعلوم کو بطور خاص ۲۵ ہزار کا عطیہ عنایت فرمایا۔

(۲۶) امریکہ اور یورپ میں دارالعلوم کا تعارف :-

۱۳۷۴ھ میں کناڈا یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے ایک ریسرچ اسکالر کی طلب پر دارالعلوم کی علمی و دینی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بھیجا گیا' جو امریکہ اور یورپ کے علمی حلقوں میں دارالعلوم کے تعارف کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا۔

(۲۷) مصر سے دارالعلوم کے روابط :-

موتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری محمد انور السادات کی آمد کے موقع پر حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب نے موصوف سے جامعہ ازہر اور دارالعلوم کے مابین روابط قائم کئے جانے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی' موتمر اسلامی اور جامعہ ازہر میں قاری صاحب کی اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور ۱۳۷۵ء میں جامعہ ازہر مصر سے دو جلیل القدر اساتذہ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی کو دو سال کے لئے دارالعلوم میں جدید عربی ادب اور انشاء کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔

(۲۸) دارالعلوم کی مسجد میں توسیع :-

۱۳۷۰ھ میں مسجد کے حوض کو وسط صحن سے ہٹا کر مشرق کی جانب دارالافتاء کی عمارت کے نیچے بنایا گیا جس سے مسجد کے صحن میں کشادگی پیدا ہوئی اسی کے ساتھ سردی کے موسم میں گرم پانی کے لئے ایک ٹنکی تیار کرائی گئی۔

(۲۹) فتاویٰ دارالعلوم کی تدوین :-

حضرت قاری صاحب کی اس تجویز کو مجلس شوریٰ نے پسند کیا کہ فتاویٰ دارالعلوم کو فقہی ابواب پر ابواب وار مرتب کر کے شائع کیا جائے' چنانچہ ۱۳۷۵ھ سے تدوین و ترتیب فتاویٰ کا کام حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی کے سپرد ہوا' فتاوی دارالعلوم کی پہلی جلد ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی۔

(۳۰) شعبۂ تنظیم فضلائے دارالعلوم :-

۱۳۷۸ھ میں فضلائے دارالعلوم کی تنظیم قائم کی گئی جو ایک دیرینہ آرزو تھی۔

(۳۱) دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جوبلی میں دارالعلوم کی نمائندگی:-

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے جنوری ۱۹۶۰ء میں بڑے پیمانے پر جوبلی منانے کا انتظام کیا اس میں نمائندگی کے لئے دارالعلوم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔

(۳۲) صدر جمال عبدالناصر کیلئے دارالعلوم کی طرف سے علمی ہدیہ:-

مارچ ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ہندوستان کا دورہ کیا' انہیں دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب قاہرہ میں اپنی موجودگی کے دوران دارالعلوم آنے کی دعوت دے چکے تھے' لیکن صدر کے ہندوستان آمد کے وقت شوال کا پہلا ہفتہ تھا' جو دارالعلوم میں تعطیل کا زمانہ ہوتا ہے اس لیے مہتمم دارالعلوم نے خود دہلی پہنچ کر جمال عبدالناصر سے ملاقات کی اور دارالعلوم کی طرف سے فیض الباری' فتح الملھم اور سوانح قاسمی کے نسخے علمی ہدیہ کے طور پر پیش فرمائے' صدر ناصر نے کھڑے ہوکر بڑی عقیدت سے قبول کیا اور وقیع الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

(۳۳) جامعہ طبیہ کا اجراء:-

۱۳۸۰ھ میں جامعہ طبیہ کی باقاعدہ عمارت بنی' جس میں چار سالہ نصاب کے ذریعہ فن طب کی علمی اور عملی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

(۳۴) کتب خانہ کی ترتیب نو:-

۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم کے کتب خانہ کی مزید ترتیب کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے لئے مجلس شوریٰ کی تجویز سے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ موصوف نے بڑی جگر کاری سے فہرست سازی کا کام انجام دیا' نیز مخطوطات کی تعارف فہرست بھی تیار کی۔

(۳۵) مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت:-

وگیان بھون دہلی میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا ۲۶ واں اجلاس جنوری ۱۹۶۴ء کی شروع تاریخوں میں منعقد ہوا۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلام اسٹڈیز نئی دہلی کی درخواست پر

دارالعلوم کے منتخب مخطوطات اس موقع پر پیش کئے گئے۔ مستشرقین نے انہیں خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، کانگریس میں یہ شرکت دارالعلوم کے وسیع تعارف کا ذریعہ بنی۔

(۳۶) عربی مجلّہ دعوۃ الحق کا اجراء:-

۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم کے حلقے کو وسیع تر بنانے کے لئے ایک سہ ماہی عربی مجلّہ دعوۃ الحق کے نام سے نکالا گیا، جس کے چیف ایڈیٹر حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی تھے۔

(۳۷) دارالعلوم مرکزی حکومت کی نظر میں:-

۱۹۶۵ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے "ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا گیا جس میں دارالعلوم دیوبند کا مختصر لیکن بہت اچھا تعارف کرایا گیا۔

(۳۸) کتب خانے کا جدید ہال:-

۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں کتب خانے کی توسیع کے لئے ایک جدید ہال اور دو کمروں کا اضافہ ہوا یہ ہال عربی زبان کی کتابوں کے لئے مخصوص کیا گیا۔

(۳۹) علمائے دیوبند کی تصانیف:-

۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم کے کتب خانے میں تصانیف علمائے دیوبند کے لئے ایک گوشہ مخصوص کیا گیا اور ان کی کتابیں ایک جگہ جمع کی گئیں۔

(۴۰) مصر، شام اور اردن کے لئے امداد:-

۱۳۸۷ھ میں بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ، ملت اسلامیہ کا ایک ایسا اندوہناک واقعہ تھا جس سے پورا عالم اسلام بری طرح متاثر ہوا۔ دنیائے اسلام بالعموم مظلوم عربوں کی امداد و اعانت میں حصہ لے رہی تھی، دارالعلوم نے بھی اپنی سابقہ روایت کے تحت اس کے لئے ملک کے مسلمانوں سے اپیل کی اور ایک خطیر رقم فراہم کر کے مصر، شام اور اردن کی حکومتوں کو پیش کی۔

(۴۱) مسجد چھتہ میں تعمیر:-

۱۳۸۹ھ میں چھتہ مسجد کے شمالی حجرے جس میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کا قیام رہا کرتا تھا' کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔

(۴۲) نصاب میں تبدیلی:-

۱۳۹۰ھ میں دارالعلوم میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی جس کے نتیجہ میں حسب ذیل تبدیلیاں زیر عمل آئیں۔

(۱) نصاب تعلیم میں درجہ بندی کو لازم قرار دیا گیا۔ اس سے قبل کتاب وار طریقہ تعلیم تھا۔

(۲) نصاب تعلیم میں کچھ کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔

(۳) درجات کی تکمیل کے سلسلہ میں تکمیل تفسیر' تکمیل دینیات' تکمیل معقولات اور تکمیل ادب کا اجراء کیا گیا۔

(۴۳) جدید تعمیرات:-

۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں مندرجہ ذیل اضافہ ہوا۔

(۱) دارالشفاء جامعہ طبیہ کی نامکمل عمارت مکمل ہوگئی۔

(۲) دارالشفاء کے شمال میں افریقی طلبہ کیلئے ''افریقی بلڈنگ'' کے نام سے ایک عمارت تعمیر ہوئی۔

(۳) جدید دارالاقامہ (دار جدید) کے کچھ کمروں میں تعمیری تغیر کر کے ان کو غلے کا گودام بنایا گیا۔

(۴۴) دارالقضا کا قیام:-

۱۳۹۴ھ میں مسلم پرسنل لا اور قوانین شریعت کے تحفظ و بقا کے لئے ایک عملی طور پر محکمہ قضا قائم کیا گیا۔

صد سالہ اجلاس منعقدہ ۱۴۰۰ھ سے معاً پہلے کی گئیں

اہم تعمیرات :-

(۱) دار جدید کے نام سے مشہور دار الاقامہ کی دوسری منزل پر دسیوں کمرے تعمیر کئے گئے۔

(۲) دار الحدیث تحتانی کی شمالی وجنوبی جانب دوسری منزل پر دو بڑی درسگاہیں تعمیر ہوئیں۔

(۳) دار العلوم کی مرکزی عمارت کے دونوں طرف جانب شمال وجنوب کے مناروں کو سہ منزلہ تعمیر کیا گیا۔ یہ دونوں پہلے دو منزلہ تھے۔

(۴) مسجد قدیم میں ترمیم واصلاح کی گئی اور دونوں منارے اونچے کئے گئے۔ مسجد کا صدر دروازہ تعمیر کیا گیا۔ نیز مسجد کے حوض کو اور مشرقی جانب منتقل کیا گیا اور پہلے سے بڑا تعمیر کیا گیا۔

(۵) احاطۂ باغ کو احاطۂ دار جدید سے جوڑنے کیلئے راستہ بنایا گیا۔

(۶) احاطۂ باغ کی بالائی منزل پر بہت سے چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر ہوئے۔

(۷) تعلیمات کی دوسری عمارت اسی جگہ پر پہلے سے کشادہ اور ضرورت کے مطابق تعمیر کی گئی۔

(۸) دار العلوم کے صدر گیٹ ''باب قاسم'' کو از سر نو ترمیم کے ذریعہ پہلے سے زیادہ اچھا اور جاذب نظر کیا گیا۔

(۹) احاطۂ کتب خانہ میں ہمہ جہت دو منزلہ گیلری تعمیر کی گئی۔

(۱۰) دار التفسیر کے گنبد کی تزئین کاری کی گئی۔

تاریخی صد سالہ اجلاس :-

مذکورہ تفصیلات حضرت قاری صاحب کی ساٹھ سالہ خدمات کا نچوڑ ہیں۔ ہم نے ان ساٹھ سالہ دور کی خدمات میں سے بنیادی خدمات کو فہرست میں جگہ دی ہے۔ اگر ان کی بھی تفصیل لائی جائے اور ان کے مستقبل میں حاصل ہونے والے فوائد اور ثمرات کا تذکرہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہزاروں صفحات اس کے لئے درکار ہوں گے۔ قاری صاحب تنہا دار العلوم دیوبند کا نام اور تعارف ایسے قریوں اور ملکوں میں چھوڑ آئے جہاں تک پہنچنا ایک عام انسان کے لئے ناممکن ہے۔

ان تمام خدمات کے علاوہ ”صد سالہ اجلاس“ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب کے ذریعہ کروایا۔ یہ اجلاس کیا تھا کہ دارالعلوم کی حیثیت عالمگیر ہوکر رہ گئی ایک عام انسان سے لے کر سربراہان مملکت تک نے دارالعلوم اور اس کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جن آنکھوں نے اس اجلاس کو دیکھا ہے' انہوں نے اس سے پہلے اور نہ ہی بعد میں ایسا عظیم الشان مجمع دیکھا۔

بے نظیر اجتماع:-

یہ اجلاس صد سالہ قاری صاحب کی وفات سے دو تین سال قبل آپ کی فکر و کوشش کے طفیل دارالعلوم کا عظیم الشان صد سالہ اجلاس ۲۱۔۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء (۳۔۵ جمادی الاولی ۱۴۰۰ھ) کو ہوا جو ہر اعتبار سے بے نظیر تھا' ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا اتنا بڑا مجمع اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا' مشہور ادیب مولانا نور عالم صاحب اجلاس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ” ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا اتنا بڑا دینی علمی اجتماع اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا' جس میں ہندوستان و پاکستان و بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا کے گوشے گوشے سے علماء' فضلاء و مفکرین و دعاۃ اور اخبار نویس و ذرائع ابلاغ کے لوگ اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک جگہ جمع ہوئے ہوں۔ اس عظیم مجمع میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے عظیم عالم و داعی مفکر (جنہوں نے دنیا کا گوشہ گوشہ دیکھا اور دنیا کے بڑے سے بڑے مسلمانوں کے اجتماع کو جنہیں خطاب کرنے کا موقع ملا تھا) یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء - ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) نے اس اجلاس کی تیسری نشست بہ روز شنبہ بہ وقت ۹ بجے صبح تا ۱:۳۰ ظہر۔

۲۲/مارچ ۱۹۸۰ء (۴/جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ)
میں فرمایا تھا کہ میں نے میدان عرفات کے بعد
دنیا میں مسلمانوں کا اتنا بڑا مجمع اپنی آنکھوں سے
آج تک نہیں دیکھا ہے"۔

(پس مرگ زندہ۔ص ۱۲۳)

مسلمانوں کا جذباتی لگاؤ:-

اس اجلاس کے لئے دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے مسلمانوں اور سربراہان کو مدعو کیا گیا تھا اور ہندوستان کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے علاوہ عرب ممالک کے اخبار ورسائل کے اہم نمائندے بھی رپورٹنگ کے لئے موجود رہے جن میں "البلاغ" و "عرب ٹائمز" و "الوعی الاسلامی" کویت "اخبار العالم الاسلامی" مکہ مکرمہ "صوت الشرق" ورسالہ "منبر الاسلام" قاہرہ "الشریعۃ" اردن "المدینۃ" سعودی عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان نمائندوں نے اپنے اپنے ملک واپس جا کر جو تبصرے لکھے ہیں وہ یقیناً ہم سب کے لئے سنہری تاریخ اور لائق فخر بات ہے۔ سعودی عرب کے روزنامہ "المدینۃ" اخبار کے نمائندے استاذ ابراہیم محمد سریق نے اپنے اخبار میں ہندوستان سے واپسی کے بعد شنبہ ۱۹/۵/۱۴۰۰ھ کو اس اجلاس کے تعلق سے اپنی تفصیلی رپورٹ میں لکھا:

"اس یونیورسٹی کے ساتھ میں نے لوگوں کے
اکرام کا جو معاملہ دیکھا اس سے واقعتاً میرے دل
کو ٹھنڈک محسوس ہوئی، لوگوں کو اس ادارے سے
جو ہمدردی ہے، محبت ہے، ہم آہنگی اور روحانی وقلبی
تعلق ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی علمی ادارے
کے حوالے سے مشکل ہی سے ملے گی"۔

اس ادارے کے ساتھ ایسے جذباتی لگاؤ اور وارفتگی

کی وجہ سے میں نے ایسا منظر دیکھا جو میں نے
میدان عرفات میں حج اکبر میں دیکھا تھا''۔

(پس مرگ زندہ۔ص۱۲۴)

اجلاس کی ایک جھلک:۔

اس اجلاس کے لئے چھ لاکھ مربع فٹ میں پنڈال نصب کیا گیا تھا' مختلف صوبوں اور ملکوں کے نمائندوں اور وفود کے لئے اس کے علاوہ الگ الگ خیمے نصب کئے گئے تھے' صرف اسٹیم کی پیائش ۵۰+۱۵۰ فٹ تھی۔ اجلاس کی تیاری اور اس کو بہ خیر وخوبی انجام تک پہنچانے کیلئے ماہرین اور محبین و اساتذہ کرام کی ۲۱ کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔

ہفتہ عشرہ تک دیوبند کا اسٹیشن عملاً صرف مسلمان مسافروں ہی کے لئے مخصوص رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ پورے برصغیر کا رخ صرف قصبہ دیوبند ہی کی طرف ہے۔ ملک کے اکثر اسٹیشنوں' بس اڈوں اور پبلک ٹرانسپورٹ کے مرکزوں پر صرف دیوبند آنے والے مسلمانوں اور علماء کے لباس میں نظر آنے والے انسانوں کی بھیڑ نظر آتی تھی۔ ہندوستان کی حکومت نے ملک کے مختلف شہروں سے دیوبند اور دیوبند سے ان شہروں کیلئے بہت سی اسپیشل گاڑیاں چلائیں۔ دنیا کے اسلامی ملکوں بالخصوص عرب ملکوں کی حکومتوں نے اس بے مثال تاریخی اسلامی جشن کیلئے اپنے وفود بھیجے۔ بالخصوص سعودی عرب' مصر' کویت' عراق' اردن' عمان اور پاکستان کی حکومتوں نے' دہلی میں تعینات عرب ممالک کے اکثر سفراء نے اجلاس میں شرکت کی اور اپنے اپنے ملکوں کے وفود کی رہنمائی کی۔

ہندوستان کے اس وقت کے صدر جمہوریہ ''نیلم سنجیوا ریڈی'' (۱۹۱۳ء۔۱۹۹۶ء) نے پرجوش پیغام بھیجا' اس وقت کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی (۱۹۱۷۔۱۹۸۴ء) بذات خود اجلاس میں حاضر ہوئیں اور اس کے افتتاحی اجلاس کو خطاب کیا۔ وہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع کے' جس میں کم از کم ۱۵۔۲۰ لاکھ مسلمان شریک تھے۔ پرسکون و پروقار رہنے پر بہت حیرت زدہ تھیں۔ ہندوستان کے محکمہ ڈاک نے اس موقع سے دارالعلوم کی مرکزی عمارت کی تصویر والا یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔

اس اجلاس کے بعد لوگوں نے اس کی رونق کو یاد رکھا اور ہمیشہ اس کو اپنے لئے باعث افتخار

محسوس کیا' نورعالم صاحب لکھتے ہیں۔

"اس ملک کے مسلمان برسوں تک اس اجلاس کا
مزے لے لے کر تذکرے کرتے رہے' ہر اس آدمی
کو اس میں کسی وجہ سے شریک نہ ہونے کا بے حد
افسوس رہا جو کسی درجہ میں بھی اسلامی شعور سے بہرہ
ور تھا' ہندی مسلمانوں کے لئے بلاشبہ اس اجلاس
کے دن یادگار اور تاریخی تھے' جن کی یادوں کی شمع اب
تک دیکھنے والوں کے دلوں میں روشن ہے"

(پس مرگ زندہ۔ص ۱۲۵)

صد سالہ اجلاس کے بعد اختلاف کا ماحول:۔

ابھی لوگ اجلاس صد سالہ کی رونق کو بھول بھی نہیں پائے تھے' اس کے تذکرے لوگوں کی زبانوں پر تھے' ہند اور بیرون ہند کے اخبار و رسائل اجلاس صد سالہ کو خراج تحسین پیش کررہے تھے کہ دارالعلوم کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی' بدقسمتی سے یہ خوشی دارالعلوم کو راس نہ آئی اور دو گروپ کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوگیا' لوگوں نے ان کو "طیب گروپ" اور "اسعد گروپ" نام دیئے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم اور اس کے اکابر دو حصوں میں تقسیم ہوگئے اور دارالعلوم دیوبند پر اسعد گروپ کا قبضہ ہوگیا جبکہ طیب گروپ نے "دارالعلوم وقف" کے نام سے دوسرا ادارہ قائم کرلیا۔

یہ دور قاری صاحب کی زندگی کا آخری دور ہے اس واقعہ نے قاری صاحب پر جو اثرات ڈالے وہ غیر معمولی تھے' دارالعلوم کو ترقی دینے کے لئے آپ نے اپنی زندگی کے بہترین ساٹھ سال خرچ کئے تھے۔

دارالعلوم کو ایک عالمی ادارہ بنانے کیلئے رات دن ایک کردیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ان کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا اور یہی واقعہ ان کی موت کا سبب بھی بنا۔

اختلاف کے اسباب کیا تھے؟ :-

اس اختلاف کے اسباب کیا تھے؟ وہ کیا مقاصد تھے جن کے لئے اختلاف کو پیدا کیا گیا؟ دونوں فریقوں میں سے کون حق پر ہے؟ یہ ایسے الجھے ہوئے سوالات ہیں کہ آج تقریباً تیس سال گزرنے پر بھی جوابات نہیں مل سکے۔ دارالعلوم دیوبند کے احوال اور قاری صاحب کے تقریباً تمام ہی تذکرہ نگاروں نے اختلاف کے محرکات پر بحث کی نہیں ہے بلکہ دارالعلوم کے انخلاء کو تفصیل سے بیان ہے۔ ہماری رائے یہی ہے کہ اس اختلاف کے اسباب پردۂ خفا میں ہی رہ گئے' مولانا نور عالم صاحب لکھتے ہیں:

''بدقسمتی سے شاید دارالعلوم کو یہ اجلاس راس نہ آیا۔ یا شاید اسے کسی کی نظر لگ گئی چنانچہ اجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد بعض مرئی و غیر مرئی وجوہ و اسباب کی وجہ سے دارالعلوم میں شورش' خلفشار اور شدید اختلاف کا ماحول بن گیا۔''

(پس مرگ زندہ۔ ص ۱۲۵)

اختلاف کی حقیقت :-

ہم یہ وضاحت کر دینا پسند کرتے ہیں کہ ہمارے لئے دونوں ہی گروپ قابل احترام ہیں کسی ایک کے سلسلے میں بھی بدکلامی کو ہم اخروی نقصان کا سبب سمجھتے ہیں' البتہ ہمارے تحقیقی مقالہ کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ اجمالاً اس واقعہ کا چھیڑنا ضروری ہے۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ تذکرہ نگاروں نے اس کے اسباب پر بحث نہیں کی ہے البتہ بعض نے کہا بھی ہے تو وہ افراط وتفریط کے شکار ہو گئے ہیں۔ ہم نے بعض بڑے حضرات سے زبانی گفتگو بھی کی ہے لیکن معاملہ سلجھ نہیں سکا۔ البتہ قاری صاحب کے تذکرہ نگاروں میں سے مولانا فضیل الرحمٰن ہلالی عثمانی نے قدرے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اس لئے ان کے پورے اقتباس کو یہاں من وعن نقل کرتے ہیں۔

'' دارالعلوم پر قبضہ ایک بڑے لمبے منصوبے کے

ساتھ ہوا ہے اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔
جب تک وہ پس منظر سامنے نہ ہو قبضہ کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ ہفت روزہ ''عقائد'' دیوبند کے ۸؍اگست ۱۹۷۲ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا' یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہفت روزہ عقائد دیوبند سے شائع ہونا شروع ہوا۔ ۸؍اگست کا یہ شمارہ پہلے سال کا پہلا شمارہ تھا اس پرچہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پہلا شمارہ چھپتے ہی چند دن میں ختم ہوگیا اور پھر اسکو دوبرہ' سہ بارہ چھ ہزار کی تعداد میں چھاپنا پڑا۔ اس میں ایک مضمون'' اطہر عثمانی'' کے نام سے چھپا تھا اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عیدگاہ دیوبند پر قبضہ:-

ابھی حال ہی میں دیوبند کے ایک خاص گروپ کی طرف سے عیدگاہ دیوبند کے انتظام پر قبضہ کرنے کی ایک بھونڈی کوشش کی گئی۔ واقعہ کی تفصیل سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ پورا پس منظر پڑھنے والوں کے سامنے آجائے تاکہ اس واقعہ کی صحیح تصویر اس کے پس منظر کے ساتھ دیکھی جا سکے۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہ کے بالکل آخری دور میں دارالعلوم دیوبند کے اندر کچھ اس قسم کے واقعات

رونما ہوئے کہ اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کو دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ یہ واقعہ دارالعلوم کی تاریخ میں ایک انتہائی نازک موقع تھا جب مولانا انور شاہ کشمیری کے ساتھ چند دیگر بزرگ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب' حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور دوسرے حضرات کو دارالعلوم سے تعلق ختم کرنا پڑا۔ مولانا انور شاہ کشمیری کی خالی جگہ کو پر کرنا آسان نہیں تھا۔ ان جیسا عالم' فن حدیث کا امام اس وقت کوئی دوسرا نہیں تھا' مگر حبیب الرحمٰن صاحب بڑے فہیم و ذکی تھے اور دارالعلوم کی خیر خواہی ان کا مقصد تھا' مولانا انور شاہ کشمیری کی جگہ کے لئے انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب علیہ الرحم (۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء) کا انتخاب کیا۔ اور ان کی علمی حیثیت کو'' شیخ العرب والعجم'' جیسے القاب سے اتنا نمایاں کیا کہ مولانا انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کی خالی جگہ کا احساس کم سے کم ہو سکے۔ مولانا حبیب الرحمٰن علیہ الرحمہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے اور دارالعلوم کی ساکھ کا بروقت تحفظ کر گئے۔

حضرت مدنی کے سیاسی خیالات:۔

مگر مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ اپنی علمی

حیثیت کے ساتھ ساتھ سیاسی خیالات بھی رکھتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اس کے بعد کچھ زیادہ دن حیات نہیں رہے۔ (۳؍رجب ۱۳۴۸ء ۱۹۲۹ء کو ان کی وفات ہوگئی) ان کے انتقال کے بعد مولانا مدنی علیہ الرحمہ کے سیاسی خیالات کے اثرات کو سنبھالانے والا کوئی نہ رہا' مولانا مدنی کے مزاج میں شدت تھی' یہ شدت دینی امور میں بھی تھی' احیاء سنت میں بھی تھی اور سیاسی خیالات و نظریات میں بھی یہ شدت نمایاں تھی ۔مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد مولانا کے سیاسی نظریات کا اثر دارالعلوم کی فضا میں نمایاں ہونے لگا اور اس طرح دارالعلوم سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ موجودہ مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبان کے گروپ کا اختلاف اسی سیاسی نظریات کی شدت کا اثر تھا مگر چونکہ مولانا عالم باعمل تھے اس لئے بات بہت کچھ بنی رہی چنگاریاں دبی رہیں اور مولانا مدنی کی شخصیت کا بھاری پن ہر خلا کو ڈھانپے رہا اور مولانا محمد طیب کا تحمل ہر موڑ پر بات سنبھالتا رہا۔ ۱۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء ـ ۱۲؍جمادی الاولی ۱۳۷۷ء بروز جمعرات مولانا مدنی کا وصال ہوگیا۔ حضرت مدنی نے وصال کے بعد اپنے حلقہ اثر میں تین طرح

کے لوگ چھوڑے۔

(۱) وہ لوگ جو حضرت کے عقیدت مند مخلص تھے اور مخلصین کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔

(۲) وہ حضرات جو سیاسی اعتبار سے حضرت کے ہم خیال تھے۔

(۳) تیسرے وہ لوگ جن کے ذاتی مفادات وابستہ تھے۔

ان تینوں قسم کے لوگوں کو بدستور آستانہ مدنی سے وابستہ رکھنے کے لئے کئی اقدام کئے گئے۔

تین طرح کے لوگ :-

(۱) حضرت علیہ الرحمہ کے خلفاء کے ذریعہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے بڑے صاجزادے مولانا سید اسعد مدنی کو حضرت کا جانشین بنایا گیا یہ اقدام جس انداز میں کیا گیا تصوف کی پوری تاریخ میں شاید اس کی مثال نہیں ملے گی۔ خود مولانا مدنی علیہ الرحمہ نے صاجزادے کو اپنا خلیفہ یا جانشین نہیں بنایا بلکہ زندگی میں کسی نے ذکر بھی کیا تو ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور شیخ کے انتقال کے بعد کچھ خلفاؤں نے مل کر گویا شیخ کی مرضی کے خلاف ان کو شیخ کا جانشین بناڈالا' کچھ لوگوں نے اس حرکت کو پسند نہیں کیا مگر یا تو وہ خاموش رہے یا ان کی آواز اتنی نزور رہی کہ بے اثر ہوگئی۔ بہر حال شیخ الاسلام

کی منشاء کے بالکل برخلاف مولانا سید اسعد مدنی
جانشین شیخ الاسلام قرار دیئے گئے۔

جمعیۃ العلماء پر قبضہ:-

(۲) سیاسی پوزیشن بنانے کیلئے جمعیۃ العلماء پر قبضہ کا منصوبہ تیار کیا گیا' جمعیۃ العلماء پر قبضہ ہوجانے سے راجیہ سبھا تک پہنچنا آسان ہوگیا یہ اس جانشین کا حال ہے جس کے والد نے حکومت کے خطاب ''پدم بھوشن'' کو بے نیازی سے ٹھکرادیا تھا(۱۳۷۴ھ۔۱۹۵۴ء) کرسی کے پیچھے یہ جانشین کی سرگردانی جس کے محترم باپ نے کبھی اپنی سیاسی خدمات کا کوئی صلہ نہیں چاہا ذاتی مفاد رکھنے والے اگرچہ خوب ہاتھ دھورہے تھے مگر ابھی ایک بات باقی تھی' ابھی دارالعلوم دیوبند پر قبضہ باقی تھا ابھی وہ ادارہ باقی تھا جس کی مسند حدیث پر شیخ الاسلام درس دیتے تھے' جانشین محترم تو خود اس مسند کے لائق نہیں تھے ابھی تک لکڑی کے پیر لگا لگا کر ان کا قد لمبا کیا گیا تھا مگر اس مسند پر لکڑی کے پیر لگا کر نہیں چڑھا جاسکتا تھا کیونکہ یہ مسند بہت اونچی تھی' کیونکہ اس مسند کے تقاضے کچھ اور تھے اور جانشین محترم ان تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

اقتدار کی تصویر ابھی مکمل نہیں ہوئی ۔ ابھی ایک

رنگ اس میں باقی ہے، دارالعلوم پر قبضہ کئی اعتبار سے ضروری ہے۔

(۱) دارالعلوم بے داغ ساکھ کے بل بوتے پر حکومت سے سودا آسان ہے۔

(۲) دارالعلوم سے فارغ ہونے والی طلبہ کی کھیپ جمعیۃ العلماء کے لئے غذا کا کام دیتی ہے۔ جمعیۃ العلماء کا چارہ اب صرف مدرسوں کے طلبہ ہی رہ گئے ہیں، کیونکہ آج کی جمعیۃ مریدین کے ایک حلقہ میں محدود ہے کیونکہ آج کی جمعیۃ کے پاس ایسی کوئی آواز نہیں ہے جس سے ہندوستان کے مسلمان آواز ملاسکیں۔ کیونکہ مولانا حفظ الرحمٰن کے بعد جمعیۃ میں اب مسلمانوں کے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔

سفیروں اور وزیروں کی آمد:-

(۳) دارالعلوم کے ملازمین میں جو لوگ وابستہ ہیں ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے بھی دارالعلوم پر قبضہ ضروری ہے اس دارالعلوم پر قبضہ کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے گئے، دہلی سے سفیروں، وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو پکڑ پکڑ کر لایا گیا اور انہیں باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دارالعلوم کے کرتا دھرتا جو کچھ ہیں ہم ہیں، ارباب دارالعلوم پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی کہ اب مولانا اسعد میاں کا قد اتنا اونچا ہوگیا ہے کہ ایک جست

میں پورے دارالعلوم پر قبضہ ہوسکتا ہے' اس دارالعلوم پر قبضہ کیلئے بار بار اسٹرائیک کرائی گئی مگر وائے ناکامی! اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا اقبال کہ ہر کوشش پاؤں کی زنجیر بنتی گئی' منزل دور اور دور ہوتی گئی۔

دارالعلوم پر تسلط بہر حال ضروری ہے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بہت ضعیف ہوتے جارہے ہیں نہ جانے یہ چراغ کب گل ہوجائے اور نہ جانے موت کے ہاتھ کب اس روشنی کو ڈھانپ لیں آنے والے کل کا نقشہ کچھ اس طرح ہے۔

(۱) دارالعلوم کی مسند صدارت پر وہ شخص آئے جو خالص اپنا ہو' مفتی محمود صاحب جیسے سادہ لوح حضرات اس کام کے لئے بہت موزوں ہوسکتے ہیں ایسے شخص کے ذریعہ دارالعلوم کی تعلیمات پر اپنا قبضہ رہ سکتا ہے۔

اہل شہر کی ہمدردی:-

(۲) حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے بعد دفتر اہتمام بھی اپنے تصرف میں ہو' دارالعلوم پر تسلط کے لئے اہل شہر کا تعاون بھی ضروری ہے ورنہ یہ لوگ عین وقت پر گڑبڑ پھیلا دیتے ہیں' خاندان قاسمی کو ہر طرح سے باندھنے کیلئے شہر کا ساتھ لازمی ہے تاکہ اندر اور باہر کوئی آواز

اٹھانے والا نہ مل سکے' شہر والوں پر اپنے اثرات قائم رکھنے کیلئے ایک تو مسلم فنڈ ہے جس سے شہر والوں کی خاص ضرورتیں وابستہ رہتی ہیں مگر صرف مسلم فنڈ یہ رول اس لئے ادا نہیں کرسکتا کہ اس کا حلقہ محدود ہے۔ مذہبی انداز میں تسلط عقیدت مندی کے قیام کیلئے مناسب ہوسکتا ہے اور عقیدت ہی وہ ہتھیار ہے جو عوام کو اندھا اور بہرہ اور گونگا بنا دیتا ہے اس کے لئے عیدگاہ' جامع مسجد اور دوسرے مذہبی مرکز بہت کام دے سکتے ہیں۔

دارالعلوم پر قبضہ:-

۲۳ر مارچ ۱۹۸۲ء کی رات وہ شب تاریک تھی جس میں رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر مولانا اسعد مدنی کے گروپ نے دارالعلوم دیوبند پر اچانک قبضہ کرلیا ایک طرف اس اچانک حادثہ کی سنگینی کا اندازہ لگایے اور دوسری طرف حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صبر او راستقامت کو محسوس کیجئے صبح کے وقت جب ایک ضعیف بوڑھے کو اطلاع دی گئی کہ وہ دارالعلوم جس کو اس نے ساٹھ سال تک اپنے خون جگر سے سینچا تھا اور جس کے بقاء اور استحکام کے لئے ان کے اجداد نے اپنے اوپر دن کا چین اور رات کی

نیند حرام کر لی تھی وہ امانت جس کو یہ انسان اپنے
سینے لگائے ہوئے تھے اب اس سے چھین لی گئی
ہے اور اس پر چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح
دیواریں پھاند کر قبضہ کر لیا گیا ہے تو اس کے درد
بھرے سینے سے ایک آہ نکلی اور صرف ایک جملہ
زبان سے ادا ہوا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کچھ دیر بعد یہ بوڑھا اپنا درد سینے میں چھپائے
سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر انتہائی صبر و
استقامت کے ساتھ اٹھا' گھر والوں سے صرف
اتنا کہا کہ دارالعلوم اللہ کی امانت تھی اس نے جب
تک چاہا خدمت کا موقع دیا ہمیں اس کی رضا پر
راضی رہنا چاہیے۔

اہل خانہ کا بیان ہے کہ پھر انہوں نے سب کو اس
طرح کھانا پکانے اور مختلف کاموں میں لگا دیا کہ
ادھر سے اس حادثہ سے سب کا دھیان بٹ جائے
اور فوراً گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر اس طرح
واقعات اور قصے بیان کرتے رہے کہ سب اس
حادثہ کو بھول کر دوسری طرف لگ جائیں اور یہی
ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد اس سوگوار ماحول میں
تبدیلی آگئی اور سب یہ بھول گئے کہ کیا قیامت
سروں کے اوپر سے گزری ہے"۔

(حضرت حکیم الاسلام۔ص: ۴۷ تا ۵۵)

فیصلہ مشکل ہے:۔

اس اختلاف کی نوعیت منفرد ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ اختلاف ایک دو دن کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے تانے بانے کئی دہائیوں سے بنے جا رہے تھے۔ البتہ اس واقعہ میں کچھ پیچ وخم ایسے ہیں جو واقعہ کی ترتیب اور تفصیل کو سلجھنے نہیں دیتے ہیں۔ مذکورہ اقتباس کو فیصل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ فاضل مصنف کا انداز تحریر جانبدارانہ ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اختلاف کی آندھیاں خاموش ہو چکی ہیں اور امن وصلاح کی خوشگوار ہوائیں چل رہی ہیں تو ہم لوگوں کو بھی گڑھے مردے اکھاڑنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

اختلاف دارالعلوم اور بابصیرت علماء کی رائے:۔

بہر حال اس اختلاف کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں' لوگ کچھ بیان کر رہے ہوں لیکن بابصیرت علماء کی رائے یہی ہے کہ حضرت قاری صاحب اصلاً بالکل اس جھگڑے کے فریق نہیں تھے۔ ان کو ایسا اختلاف بالکل پسند نہیں تھا وہ اتحاد کے علمبردار تھے۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت ان کی روایت تھی۔ زبان کی حفاظت ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ایسے بہت واقعات ملیں گے کہ حضرت قاری صاحب نے زبان کی حفاظت کی سختی سے تاکید کی ہے۔ اگر کسی نے مخالف کیلئے بھی برے الفاظ استعمال کیئے ہیں تو آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا ہے مولانا نور عالم صاحب لکھتے ہیں:

> ''مجھ سے کئی ثقہ عالم نے یہ بات کہی حضرت حکیم
> الاسلام نے کئی بار اپنی جماعت کے لوگوں سے فرمایا
> کہ بھئی! اگر تمہیں لڑنا ہے تو قائد اور سپہ سالار بدل لو
> 'میں دارالعلوم کے حوالے سے کسی اختلافی جھگڑے
> کی قیادت کا کسی طرح بھی اہل تھا' نہ ہوں''

(پس مرگ زندہ۔ ص ۱۲۸)

قاری صاحب اور دارالعلوم دیوبند:-

قاری صاحب نے اس وقت کی مجلس شوریٰ کے سب سے نمایاں رکن عالم جلیل و داعی الی اللہ مولانا منظور نعمانی (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء-۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) کے نام جو کچھ اس وقت لکھا تھا' اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل اس دلخراش واقعہ سے کس طرح چھلنی ہوگیا تھا' اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ انہیں دارالعلوم سے کیسا عشق تھا بلکہ ان کے لئے سرمایہ حیات تھا اور وہ اس ناگفتہ بہ واقعے سے کتنے دردو کرب میں مبتلا تھے۔

محترم المقام مولانا محمد منظور نعمانی! زید مجدکم

السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۲۸/اپریل ۱۹۸۳ء باعث شرف اور موجب تسلی ہوا۔ یہ میرے لئے روح کی غذا اور صحت مندی کی علامت ہے' آج کا دور کرب کا دور ہے' اختلافی انتشار عالمی پیانہ پر بڑھ رہا ہے۔ ۹۹ فیصد غلط فہمیاں چھائی ہوئی ہیں اور ایک فیصد حقیقت پر حاوی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبے میں امت کی راہ نمائی اور عوامِ امت کی خدمت اس کا نصب العین رہا ہے آج اس کا کیا حال ہے؟ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول ہیں۔

یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا میں دہلی میں پنت ہسپتال میں رہا' اب دیوبند میں ہوں۔ میرا کھانا پینا صرف دوا ہے' ڈاکٹر کہتے

ہیں کہ کوئی مرض نہیں اور حال یہ ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں۔ نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا' بلکہ غم دارالعلوم کا ہے جماعت جو ایک سو سولہ برس تک اوروں کے لئے ہدایت' تقویٰ اور توحید کی علامت تھی' بکھر کر رہ گئی۔ یہی میری بیماری ہے ویسے یہ عمر کا تقاضہ ہے۔ اس عالم بے چارگی میں آپ کا مکتوب گرامی ملا' جسے میں نے اپنے لئے اور دارالعلوم کیلئے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں۔ آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو کبھی خطاوار نہیں سمجھا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے۔ معاملہ ہم سے کسی کی ذات کا نہیں' نہ معافی کا ہے بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے۔ ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ تعالیٰ سے مانگیں اور کچھ مانگیں تو دعا مانگیں۔ ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جوابدہی سے نجات ملے۔

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

اس دن سے جس نے دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کو یہ دن دکھائے میں نے تین الفاظ اختیار کر لیے ہیں: **السکوت والصبر والغنی** انہی تینوں پر اب قائم ہوں۔ زندگی کی آخری آرزو

اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس
میں روحانیت تھی' خلوص تھا اور سب ایک تھے اور
فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال
ہوجائے۔ آں محترم سے دعا کی درخواست ہے۔
والامر بید اللہ الکریم۔

والسلام
محمد طیب غفرلہ
۱۹۸۳/۵/۷ء

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی جدوجہد:-

ہندوستان آزاد ہوگیا' انگریز اپنے وطن واپس لوٹ چکا تھا' لیکن مسلمانوں اور ان کے تشخصات کے حوالے سے ماحول اب بھی انگریزی استعمار بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم بن گیا تھا۔ اس حوالے سے دارالعلوم کے اکابر و مشائخ نے اپنا قائدانہ کردار اسی طرح ادا کیا جس طرح استعماری عزائم کے خلاف کیا تھا۔ البتہ حالات و واقعات نے انداز کار کو تبدیل کردیا۔ اس حوالے سے اپنا اساتذہ واسلاف کے بعد قاری محمد طیب کا کردار بڑا نمایاں اور ممتاز رہا ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد ہندو احیاء پرستی کا مسئلہ بڑے شور سے پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں سرکاری و غیر سرکاری پلیٹ فارم کے ذریعہ مسلمانوں کی دینی شناخت مٹانے کی کوشش کی جانے لگیں۔ ان کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہر سمت سے کھڑی کی جاتی رہیں' جس کا سلسلہ دن گزرنے کے ساتھ اور شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ مسلمانوں کو اپنے دینی تشخص کی حفاظت کیلئے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑیں' مولانا نور عالم صاحب لکھتے ہیں:

''اس ملک میں آزادی کے بعد سے ہندو احیا پرستی
اور سرکاری و غیر سرکاری تعصب و تنگ نظری کے
ہاتھوں مسلمانوں کو اپنی دینی شناخت کے ساتھ

جینے کیلئے بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ ان کی راہ
میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہر سمت سے کھڑی کی
جاتی رہی ہیں' جس کا سلسلہ دن گزرنے کے ساتھ
اور شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اتنے مسائل پیدا
کئے جاتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر کیلئے
کوئی موقع نہیں ملا' وہ ہمیشہ ان مسائل سے نمٹنے ہی
میں توانائیاں صرف کرتے رہے''۔

(پس مرگ زندہ ۔ص :۱۳۵)

شاہ بانو کیس:۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں پانی سر سے گزر گیا۔ اسلامی قوانین اور احکام پر شدت کے ساتھ حملے کئے گئے ۔ چنانچہ ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء میں شاہ بانو کیس کا فتنہ کھڑا ہو گیا' جس کی مختصر روداد یہ ہے کہ شاہ بانو کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی تھی' شاہ بانو نے نان ونفقہ کیلئے دعویٰ دائر کیا جس پر سپریم کورٹ نے اسلامی احکام کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ شاہ بانو کا سابق شوہر اس کے دوسرا نکاح کرنے تک نان ونفقہ دے گا اور اگر وہ زندگی بھر نکاح نہ کرے تو زندگی بھر نان ونفقہ دے گا۔

سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اسلامی تشخصات کی کھلی خلاف ورزی تھی' چاروں طرف یہ شور ہونے لگا کہ اسلامی شریعت عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے' تو اس کا عملی جائزہ لینے اور اس کے بارے میں پیش کردہ شبہات کی جوابدہی کیلئے حضرات اساتذہ وارباب افتاء دارالعلوم دیوبند کی ایک مسلم پرسنل لاء کمیٹی بنائی گئی تاکہ وہ اس سلسلہ میں مدلل دفاع کا فریضہ انجام دے۔

اجتماعی کوشش:۔

چنانچہ کمیٹی نے خاطر خواہ طریق پر اپنا کام انجام دیا اس سلسلے میں حضرت قاری صاحب نے ممتاز فضلائے دیوبند کا ایک اجتماع ۱۴؍مارچ ۱۹۷۲ء (۲۶؍صفر ۱۳۹۲ھ) کو دارالعلوم میں طلب کیا۔

جس میں ملک کے دوسرے دانشوروں کو بھی دعوت دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس مسئلے میں ہر چند حضرات علماء اکرام نے بلاشبہ کافی توجہ فرمائی۔ مضامین و مقالات اور رسائل شائع کئے لیکن یہ ساری جدوجہد انفرادی اور شخصی طور پر ہوئی۔ ضرورت تھی کہ اجتماعی طور پر اس مسئلہ کا شرعی موقف سامنے آئے اسی پر گورنمنٹ توجہ بھی دے سکتی ہے اسی نقطہ نظر کے پیش نظر اولاً قاری صاحب نے علمائے دیوبند کے منتخب فضلاء اور ملک کے دیگر فضلاء کو دارالعلوم میں جمع ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ کی دعوت پر کثیر مجمع جمع ہو گیا تا کہ مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں شرعی موقف طے کیا جا سکے۔

مسلم پرسنل لا کنونشن کی تجویز:-

چنانچہ اسی اجتماع میں بحث وتمحیص کے بعد ایک مشترکہ بیان اور سوالنامہ مرتب کیا گیا اور اسی اجتماع میں مسلم پرسنل لا کنونشن کی تجویز بھی منظور کی گئی اور اس کی تیاری کے لئے اجتماع نے ایک تیاری کمیٹی بنائی۔ جس میں مقامی کمیٹی کے متعدد ممبران' اراکین شوریٰ' ماہرین قانون اور دانشوروں کو بہ حیثیت رکن تیاری کمیٹی شامل کیا گیا۔ اس کمیٹی کے کئی اجلاس دارالعلوم میں ہوئے' تیاری کمیٹی کا ایک اجتماع اوائل مئی ۱۹۷۲ء میں ہوا' جس میں متعلقہ سوالنامہ زیر بحث آیا جسے طبع کرا کر ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء ومفتیان کرام' مفکرین اور دانشوروں کے پاس بھیجا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ جولائی تک جوابات روانہ کر دیئے جائیں۔ ان جوابات پر غور کرنے کیلئے مقامی تیاری کمیٹی کا اجلاس دارالعلوم میں ۲ر جمادی الاخریٰ ۱۳۹۲ھ کو منعقد ہوا اور اس میں طے کیا گیا کہ ان جوابات پر مزید غور وفکر کرنے اور مجوزہ اجتماع عام کی تاریخیں مقرر کرنے کیلئے تیاری کمیٹی کا اجلاس ۵۔۶ رجب ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۵۔۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیوبند میں بلایا جائے۔ چنانچہ مقررہ تاریخوں میں یہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء۔ ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء/ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) حضرت مولانا سعید اکبر آبادی (۱۳۲۵ھ۔۱۹۰۷ء/۱۴۱۲ھ۔۱۹۸۵ء) حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء۔ ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء۔ ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء) جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی صاحب لکھنوی' جناب عبدالقادر صاحب مالیگاؤنوی'

حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب امارت شرعیہ بہار، جناب مولانا برہان الدین صاحب استاذ ندوۃ العلماء لکھنواور اراکین مسلم پرسنل لا کمیٹی اور اساتذہ دارالعلوم دیوبند نے شرکت کر کے بحث میں حصہ لیا۔

آل انڈیا کنونشن ممبئی میں:۔

تیاری کمیٹی کے فیصلے کے مطابق مجوزہ عام اجتماع کی تاریخ اور مقام طے کرنے کیلئے پانچ افراد کے ایک وفد نے جو قاری صاحب، مولانا سید منت اللہ رحمانی (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء۔ ۱۴۱۱ھ /۱۹۹۱ء) مولانا منظور نعمانی اور مولانا سالم صاحب قاسمی مدظلہ پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے ممبئی کا دورہ کیا۔ ممبئی کے مخلص اور حوصلہ مند مسلمانوں نے بڑی خوشی اور گرمجوشی سے اس کا ذمہ لیا کہ یہ آل انڈیا کنونشن ممبئی میں منعقد ہو، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کیلئے ۲۰۔۲۱ ذی قعدۃ ۱۳۹۲ء مطابق ۲۷۔۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کی تاریخیں طے ہوگئیں۔ مقصد کی اہمیت کے پیش نظر یہ مناسب اور مفید سمجھا گیا کہ ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے اکابر اور معروف مسلم تنظیموں کے سربراہوں کی طرف سے مشترکہ دعوت نامہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ ۲۷۔۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو یہ عظیم کنونشن اپنی غیر معمولی خصوصیات کے ساتھ ممبئی میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں نے حصہ لیا۔

قاری صاحب کی صدارت:۔

تحریک خلافت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہر مکتب فکر کے مسلمانوں نے متحد ہوکر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا، ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف مذہبی مکاتب فکر اور طبقات میں سے کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں جس کے اکابر علماء وزعماء کنونشن کے پلیٹ فارم پر جمع نہ ہوگئے ہوں اور سب نے با اتفاق رائے حضرت قاری صاحب کو کنونشن کا صدر منتخب کیا۔ مولانا نور عالم صاحب لکھتے ہیں:

> ”مسلمانان ہند کے مختلف مکاتب فکر کے اجتماع
> اور نمائندگی کے لحاظ سے یہ کنونشن جس قدر غیر
> معمولی تھا، اسی حد تک خدا تعالیٰ نے اسے کامیاب

بھی کیا۔کنونشن کے داعیوں اور مندوبین کی متفقہ
رائے سے جن میں سنی' شیعہ' مہدوی' بریلوی' اہل
حدیث اور جماعت اسلامی کے علاوہ دوسری سیاسی
وغیر سیاسی جماعتوں کے رہنما موجود تھے۔حکیم
الاسلام قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم کو کنونشن کا
صدر منتخب کیا گیا''

(پس مرگ زندہ۔ص:۱۳۸)

کنونشن کا اعلان :-

اس کنونشن نے اور دوسرے الفاظ میں ہندوستان کے تمام مکاتب فکر کے مسلمانوں نے متحدہ آواز کے ساتھ اعلان کردیا کہ وہ کسی حالت میں بھی مسلم پرسنل لا میں تغیر وتبدل کو گوارا نہیں کرسکتے۔ یہ شریعت اسلامی کا ایک حصہ ہے اس متحدہ آواز کا اثر ملک اور حکومت دونوں پر پڑا اور اس ذریعہ سے ہندوستان کے تمام مسلمان وحدت کلمہ کی بنا پر متحد ہوگئے جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک مثال صورت تھی۔

مسلم پرسنل لا کا دوسرا اجتماع :-

اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا دوسرا عظیم اجتماع حیدرآباد میں منعقد ہوا جس جلسے کی ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور جنرل سکریٹری امیر شریعت بہار واڑیسہ مولانا منت اللہ رحمانی کو منتخب کیا۔

مسلم پرسنل لا کا مقصد :-

مسلم پرسنل لا بورڈ کا مقصد پرسنل لا کا تحفظ اور ترمیم سے بچانا ہے۔ مسلمانان ہند خواہ ان کا تعلق کسی مکتب فکر سے ہو اپنے پرسنل لا کے تعلق سے کسی ایسے قانون کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں جو پرسنل لا کے کسی ایک شرعی جزیے پر بھی اثر انداز ہو۔ باالفاظ دیگر مسلمان اپنی معاشرتی

اور ثقافتی خصوصیات اور امتیازات کو فنا کرنے کیلئے تیار نہیں ہے جن پر اس کے ملی وجود کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ دفاع عن الاسلام کا سب سے مضبوط پلیٹ فارم ثابت ہوا جو اپنے زمانہ قیام سے آج تک الحمد للہ دفاع کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کا سہرا صرف اور صرف حضرت قاری صاحب کے سر جاتا ہے جو تاحیات اس کے متفقہ صدر، سربراہ اور راہ نما رہے۔

☆☆☆

باب چہارم

تصنیف وتالیف

باب چہارم: تصنیف وتالیف

قاری صاحب درحقیقت تقریر کے آدمی تھے، اسی میدان میں انکے جوہر بھی کھلے کیونکہ انکا حقیقی میدان یہی تھا، اپنی زندگی اور ماحول، عہدہ ومنصب، ذمہ داری وفرائض کے لحاظ سے بھی خطابت ان کی ضرورت تھی اور وہ ان کی ذات کا ایک ضروری عنصر بن گئی تھی۔ لیکن قاری صاحب نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی مصروفیتوں اور طویل اسفار کے باوجود درجنوں کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔

تصنیف اور تالیف کا جائزہ:۔

ہم نے تیسرے باب میں درس وتدریس اور اہتمام کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ان ذمہ داریوں کے ساتھ تصنیف تالیف ایک ایسا کارنامہ ہے جو بہت کم شخصیات میں دیکھا جاتا ہے۔اسلئے کہ تدریس واہتمام کا تعلق تصنیف وتالیف سے نہیں بنتا۔لیکن قاری صاحب کی جامع شخصیت میں تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کی مکمل استعداد تھی اور اپنی تصانیف کے ذریعہ یہ بھی ظاہر کردیا کہ تمام مصروفیات کے باجود تصنیفی مشاغل میں مصروف ہیں

جوہر تحریر:۔

قاری صاحب نے وعظ وخطابت ،انتظام واہتمام،درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف کے میدان میں اپنے لازوال اور انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جناب مولانا عبداللہ صاحب جاوید ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''درس وتدریس اور تبلیغ وارشاد کے علاوہ حضرت
> حکیم الاسلام قدس سرہ کی علمی وتصنیفی خدمات بھی
> ناقابل فراموش ہیں۔دارالعلوم کے اہتمام اور تبلیغی
> وتدریسی مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف ان
> کا محبوب مشغلہ تھا۔آپ کی مضمون نگاری اورانشاء

پردازی کی ابتداء زمانۂ طالب علمی سے
''القاسم'' کے صفحات سے شروع ہوئی جب ہی
سے آپکے تحقیقی مقالے علمی حلقوں میں بہ نظر
استحسان دیکھے جاتے تھے انشاء پردازی میں آپ
انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔ہندوستان
وپاکستان کے طبقۂ علماء کے صف اول کے اہل قلم
ومقالہ نگار تھے۔ملک بھر کے مؤقر جریدے
اوررسالے آپ کے مضامین کی اشاعت باعث فخر
سمجھتے تھے۔ ادق سے ادق عنوانات پر لمبے لمبے
مقالے اورمضامین ایک ہی نشست میں لکھدیتے
تھے۔آپکی تصانیف وتالیفات اورمقالہ نگاری کا
اکثر حصہ دوران سفرانجام پاتا تھا''۔

(مظلوم شخصیت ۲۰۲/۳)

قاری صاحب کی تصانیف میں اسلام کی تفہیم اورترجمانی:-

تقریروں کی طرح قاری صاحب کی تحریریں اور کتابیں بھی خالص علمی انداز کی ہیں،ان کے اندر علمیت کے علاوہ روحانیت مواد اور اسلوب نگارش کی بہت سی خوبیاں ہیں ۔ان کی اکثر کتابیں بہت ہی اہم اور نازک موضوعات پر ہیں،اورانہوں نے عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وترجمانی میں اپنا خاص کردار ادا کیا ہے اورعوام وخواص کی دینی تربیت ورہنمائی میں بڑااہم حصہ لیا ہے۔اگر ہم یہ کہیں تو حق بجانب ہونگے کہ ان کی تصانیف اصلاحیات کے اردو ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ ہے اس سلسلہ کے نمونوں میں سے قاری صاحب کی تحریر کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

''حتی کہ اگر امت کوبھی یہ خطرہ پیدا ہوکہ زمانوں
کے گزرنے سے گودین باقی رہے،لیکن اسکی وہ

کیفیت اور رسوخ کی شان نہ رہے، جو سلف میں
تھی تو دین کی صورت ہی صورت باقی رہ جائیگی
جس میں حقیقت نہ ہوگی تو ایسے بے حقیقت دین کا
ہونا نہ ہونا برابر ہوگا، اسلئے اسکا بھی اطمینان
دلایا گیا کہ امت کی خیریت کسی خاص دور کے طبقے
کیساتھ مخصوص نہیں خواہ وہ اول کا ہو یا آخر کا۔ بلکہ
دین کی خوبی وخوبصورتی، وہی اگلی کیفیت وحقیقت
اور وہی اصلی خیر و برکت ہر دور میں قائم رہیگی''

(حدیث رسول کا قرآنی معیار مشمولہ تحقیقات حکیم الاسلام ۱/۶۱)

قاری صاحب کی تحریر سادہ اور سلجھی ہوتی ہے انکی تحریر میں جھول اور معانی والفاظ کی بازی گریاں نہیں ہیں۔ ہر بات سادہ اور دلنشیں اسلوب میں کہنے کے عادی ہیں۔ جسطرح شبلی کے یہاں تحریر کی سادگی ہے اور انداز تحریر معروضی ہے اسی طرح کی جھلک قاری صاحب کی تحریر میں ملتی ہے۔ اسکے علاوہ مسلک اہل سنت والجماعت سے وفاداری، علماء سلف کی قدردانی اور انکے لئے عذر خواہی جیسے نکات قاری صاحب کی تحریر میں نمایاں ہیں جناب شمس تبریز صاحب لکھتے ہیں:۔

''ان کی سب سے بڑی قابل قدر اور لائق
خصوصیات میں مسلک اہل سنت والجماعت
میں ان کی وفاداری ووابستگی، علماء سلف کی قدردانی
اور انکے لئے عذر خواہی، اکابر امت سے استفادہ
اور ان پر اعتماد اور مشاہیر اسلام کے علمی وعملی کار
ناموں کی روشنی میں اجتہاد اور ان کے علمی وثقافتی
ورثہ سے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ
استفادہ، اسلام کے ماضی سے خوش گمانی اور حال

ومستقبل کی طرف سے امید پروری کیساتھ فکر
مندی،فکر ولی اللٰہی اور اس کے حامل و امین
اکابردیوبند خصوصا حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے
گہرے اسلامی افکار پرعبور اوران سے عقیدت کو
بنیادی حیثیت حاصل ہے"

(مضمون مشمولہ مظلوم شخصیت ۹۹/۳)

قاری صاحب بحیثیت مصنف:۔

قاری صاحب کی تحریریں حکیمانہ نکتہ افرینیوں اوردلائل،استنباط مسائل واستخراج نتائج سے بھری ہیں اسی وجہ سے دیوبندی مسلک کے مخالفین یاغیرجانبدارانہ حلقے بھی ان پراعتادکرتے ہیں اوران کی رائے اورمشورے سے مستفید ہوتے ہیں،مولانااسیرادروی لکھتے ہیں:۔کہ

"ہرکتاب اپنے مواد،اپنی معلومات،اپنے دلائل
استنباط واستخراج نتائج،حکیمانہ نکتہ آفرینیوں اور
پرشوکت ومرعوب کن کلامی مباحث کے لحاظ سے
اپناخاص امتیاز ومقام رکھتی ہے ان کتابوں کوپڑھ
کرقاری محسوس کرتاہے کہ دائرے معلومات
میں بہت سی باتیں ایسی ضرورآگئیں ہیں جن پراب
تک ان کی نگاہ نہیں پڑی تھیں،ہرکتاب قاری
صاحب کی مخصوص طرزتحریر کے ساتھ عالمانہ
ومحققانہ مباحث،زبان وبیان کی رعنائیوں اوردل
آویزیوں سے آراستہ وپیراستہ ہے"۔

(سہ ماہی حسن تدبیر نومبر ۲۰۰۶ء تااپریل ۲۰۰۷ء)

قاری صاحب کی تصانیف کا تاریخی پس منظر:۔

قاری صاحب کی تحریراورتصانیف ان کی شاعری کی طرح واقعاتی ہیں۔ ہرایک تحریراورکتاب کاایک تاریخی پس منظرہے ہم ان شااللہ تصانیف پرتبصرہ اورتجزیہ کے وقت اس تاریخی پس منظرکواجاگرکرنے کی کوشش کریں گے ہرکتاب ناگریزضرورت کے پیش نظرمعرض تحریرمیں آئی ہے۔

قاری صاحب دارالعلوم دیوبندجیسے ادارہ کے سربراہ توتھے ہی۔لیکن قدرتی طورپران کاتعلق اس عظیم علمی سلسلتہ الذہب سے تھا،کہ جنہوں نے کچھ ہی دنوں پہلے عیسائیت کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے آگے بندباندھاتھا،آریوں کی یورشوں اوربدزبانیوں کاسدباب کیاتھا،قادیانیوں کے طائرفکروخیال کے پرنوچ کران کی قوت پروازچھین لی تھی،انہیں اسباب کی وجہ سے جب قاری صاحب ملک میں اصلاحی وتبلیغی دورے کرتے تھے توان سے ہرطرح کے لوگ ملتے تھے اوروہ اپنے اشکالات اورشکوک وشبہات پیش کرتے تھے۔

ان شکوک وشبہات،اعتراضات واشکالات کودورکرناوہ اپنامذہبی ودینی فریضہ تصورکرتے تھے اوراپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اورقلم ہاتھ میں اٹھالیتے تھے عام طورپرقاری صاحب کی تصانیف کایہی پس منظرہے۔مولانااسیرادروی لکھتے ہیں:۔

> ''قاری صاحب کی اکثرکتابوں کااپنااپناایک تاریخی پس منظرہے،ہرکتاب کسی ناگریزضرورت کے پیش نظرمعرض تحریرمیں آئی ہے ایساکم ہواہے کہ خودقاری صاحب کے ذہن نے کوئی علمی موضوع منتخب کیاہو،اوراس پرغوروفکرکے بعداپنی کتاب مرتب کی ہوبلکہ اکثرہوتایہ رہاہے کہ کسی نے ان سے علمی ومذہبی سوالات کیئے،یاان کے گردوپیش ایسے حالات پیداہوگئے کہ اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کی شدیدضرورت محسوس

ہوئی یا اسلامی حلقوں میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا، یا اس
کے دفعیہ کی ایک عالم دین کی حیثیت سے ان
پر ذمہ داری عائد ہو جاتی اور انہوں نے قلم
اٹھالیا اور مختصر جواب یا مضمون کی بجائے ایک
مستقل کتاب تیار ہوگئی''۔

(سہ ماہی حسن تدبیر دہلی نومبر ۲۰۰۶ء تا اپریل ۲۰۰۷ء)

قاری صاحب کا نثر نگاری میں ادبی مقام:-

قاری صاحب کی نثر میں جمال وجلال کا پر کیف امتزاج ملتا ہے ان کا اسلوب نثر ہمارے عام مصنفین سے بہت مختلف ہے ماہرین اسلوبیات وساختیات قاری صاحب کے نثری اسالیب سے ادب کے بہت سارے مسائل کو سمجھنے میں مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ان کی نثر اچھی نثر ہے۔ پیچ در پیچ اور مبہم نہیں ہے۔وہ ایسی نثر ہے جو شاعری کی طرح سیدھے دل میں اتر جاتی ہے۔انکا نثری اسلوب ہمارے لئے یقیناً ایک نمونہ اور نظیر بھی ہے۔وہ ایسی ترسیلی نثر لکھتے ہیں جس میں معارف علوم کا دریا لہریں مارتا ہے۔وہ غیر ضروری اطناب سے پرہیز کرتے ہیں اور ایجاز واختصار کے ساتھ بات لکھتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب اور شبلی:-

حضرت قاری صاحب کو نثر نگاری کے سلسلہ میں شبلی کا ہم پلہ یا مترادف کہا جا سکتا ہے۔جس طرح شبلی کے یہاں تحریر کی سادگی ہے اور انداز تحریر معروضی ہے' اسی طرح قاری صاحب کی تحریر سادہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ان کی تحریر میں جھول اور معانی والفاظ کی پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔

شبلی کو قوم وملت ایک شاعر سے بڑھ کر ایک عمدہ نثر نگار اور مصنف تصور کرتی ہے یقیناً شبلی نے اصلاح وفکر کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کو انہوں نے نثر سے ہی پورا کیا' شاعری نثر کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ قاری صاحب کے حالات کا مطالعہ احساس دلاتا ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی میں ایک مصلح اور

مفکر کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا' آپ نے اسلامی فکر کی ترویج و اشاعت کے لئے تین میدان اختیار کئے ۔(۱) تحریر (۲) شعر و شاعری۔(۳) خطابت ۔شبلی کی طرح قاری صاحب کو بھی ادب دنیا نے ایک اچھے شاعر سے زیادہ ایک عمدہ نثر نگار اور بے نظیر خطیب تسلیم کیا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ایک اچھا ادیب ایک اچھا خطیب و مقرر بھی ہو جائے ضروری نہیں ہے ۔گذشتہ دو صدیوں کے مطالعہ کے دوران صرف ابوالکلام آزاد کا نام سامنے آتا ہے کہ وہ ایک مستند ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ لاجواب خطیب بھی تھے۔ان کے بعد ماضی قریب میں قاری صاحب کا نام ملتا ہے' جن کی ذات میں قدرت نے دونوں جوہروں کو توازن کے ساتھ ودیعت کر دیا تھا۔

مذکورہ دعوؤں کے لئے ملاحظہ فرمائیں جشن آزادی کے سلسلۂ میں ایک اقتباس:

''آج ۱۵/اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منا نے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی .جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سر چشمہ ہے ۔لیکن آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی بلکہ کتنی ہی صبر آزما دنوں، مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہونچی ہے۔گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل ہمیں بیک دم اور پر امن طریق پر اچانک شب کے ۱۲/بجے موصول ہو گیا لیکن وہ کتنے تاریک

سمندروں سے گذرتا ہواہندوستان پہونچا۔کتنے
طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس
کی راہ میں حائل ہوئیں،جن کا کتنے ہی آہنی قسم
کے انسانو ں نے مقابلہ کیاایسے اہم سوالات
ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش
نہیں کیا جاسکتا''۔

(آزادیٔ ہند کا خاموش رہنما۔مشمولہ توضیحات حکیم الاسلام ۶۲۹/۳۔)

آپ کی تحریر میں مقناطیسیت:-

قاری صاحب کے مذکورہ اقتباس سے انکی مخصوص افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ کس قدر سلسبیلی نثر ہے۔کہ انسان کے پورے وجود کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور سچ کہوں تو مولانا کی ہر تحریر ہی ایسی ہوتی ہے،رات کے اندھیروں میں سورج کی طرح چمکتی ہے اور دن کے اجالوں میں شجر سایہ دار بن جاتی ہے،انکی ہر تحریر ہر مومن کے قلب میں قندیل روشن کرتی ہے قاری صاحب نے مسلمانوں میں ملی شعور پیدا کیا اور انکے اندر خودداری اور خود شناسی کے احساس کو جنم دیا۔قاری صاحب کی شخصیت ایک مینارۂ نور تھی،جس نے نہ جانے کتنے تاریک جنگلوں کو سبزہ نورستہ میں بدل دیا۔قاری صاحب کی شخصیت میں ایک جادو تھا اور وہ جادو ہر صدی میں سر چڑھکر بولے گا،ملاحظہ فرمائیں قاری صاحب کی تحریر کا ایک اور اقتباس جس میں آپنے دارالعلوم دیوبند کی جدوجہد اور شاملی کے خون ریز معرکہ کو سکے کے دورخ بتائے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:-

''گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک
ہی حقیقت کے دو رخ تھے،فرق تیغ وسنان،قلم
وزبان کا تھا۔وہاں تشدد کے ساتھ آزادیٔ ملک
وملت اور آزادیٔ مذہب ودین کا نصب العین
سامنے تھا اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی،اخلاقی

اورآئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش
نظرتھا۔وہاں اس نصب العین کیلئے افراداستعمال
کئے جارہے تھے اور یہاں اس کے افراد بنائے
جانے لگے۔وہاں نام میدان جنگ کا تھا اور یہاں
نام مدرسہ اور مکتب امن صلح کا تھا وہاں قلب ودماغ
کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کرتے تھے اور یہاں
براہ راست دل ودماغ نے خوداپنے تصرفات
دکھلائے''۔

(آزادی ہند کا خاموش رہنما مشمولہ توضیحات حکیم الاسلام ۶۳۱/۲)

قاری صاحب کا تنقیدی اردو ادب:۔

اردو تنقید کے بنیادی خدوخال عربی اور فارسی تنقید سے لئے گئے ہیں۔اردو کے ابتدائی دور کے ناقدین نے ابن رشیق اورابو ہلال عسکری کے تنقیدی نظریات سے خاطرخواہ استفادہ کیا ہے،پھر مغربی تنقیدی افکار ونظریات نے اردو تنقید کو وسعت ،تازگی،معقولیت اور شگفتگی عطا کی ۔اسطرح اردو تنقید نے مختلف رنگ وپیرہن بدلے اور متعدد نوع کی تنقیدیں وجود میں آئیں۔

قاری صاحب نے گوکہ باضابطہ تنقید نگاری کا فرض انجام نہیں دیا مگر مختلف مواقع پر ضرورت کے پیش نظر آپ نے تنقیدی تحریرات لکھی ہیں جن سے ان کے تنقیدی تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ نظریۂ دوقرآنی کا مسئلہ ہو، یا خلافت معاویہ ویزید کی بحث،کلمہ طیبہ پر کئے جانے والے اعتراضات ہوں یا غلام محمد پرویز کی قرآنی تحریف ۔غرض جب جب بھی فتنہ نے سر ابھارا اور ضرورت محسوس ہوئی تو قاری صاحب نے مدلل اور مسکت جواب دیا ہے۔۱۳۷۹ھ کے آس پاس محمود عباسی صاحب کی رسوائے زمانہ کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' منظر عام پر آئی۔یہ کتاب مسلک اہل سنت والجماعت کے نقیب ''دارالعلوم دیوبند'' کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ایک انتہائی گمراہ کن اور بہر لحاظ غلط کتاب ہے۔بزرگان دیوبند بصیرت وتحقیق کی روشنی میں حضرت سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے موقف کو

برحق اور یزیدیوں کے موقف کو نفسانیت پر مبنی سمجھتے ہیں۔

جماعت دارالعلوم کی طرف سے اس کتاب سے تحریراً و تقریراً کھلی بیزاری کا اعلان کرنے کے باوجود بھی کچھ ناپاک ضمیر لوگ محض اپنی خودغرضی اور نام آوری کے لئے ''خلافت معاویہ ویزید'' جیسی بے ہودہ کتاب کا پروپیگنڈہ کرتے رہے تو قاری صاحب نے اسکی تردید میں ''شہید کربلا اور یزید'' لکھی۔ جو موقف امام حسین کی تائید میں علمی، فکری، تحقیقی اور مسلکی لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، اس تحریر کے بعد محمود عباسی کی کتاب کا پروپیگنڈہ بند ہوگیا دوسرے الفاظ میں اس باطل موقف کا خاتمہ ہی کردیا پیش ہے اس کتاب کا ایک تنقیدی/ادبی اقتباس:۔

''عباسی صاحب کا مطمح نظر کیونکہ یزید کو خلیفہ برحق بلکہ عمر ثانی دکھلا کر اس کا ذاتی اور سیاسی کردار بے عیب ظاہر کرنا تھا، تو اسکا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اسکے مد مقابل سیدنا حضرت حسینؓ کو جو اسکی بیعت کو اسکے فسق اور بے اعتدالی کی وجہ سے کسی طرح گوارہ نہیں فرماتے تھے، ذاتی اور سیاسی کردار کی لحاظ سے پست اور اخلاق واوصاف کے لحاظ سے معاذ اللہ داغدار ثابت کیا جاتا، ورنہ اس تقابل کے ہوتے ہوئے اگر وہ ذرا بھی حسین رضی اللہ عنہ کے مناقب کے بارے میں لچک ظاہر کرتے تو یزید کے دعوی کردہ تقوی وطہارت کی خیر نہ تھی/اسلئے انہوں نے اس میزان کے دو پلوں میں ان دو کو بٹھلا کر یزید کا پلا تو اخلاقی وعملی خوبیوں سے وزن دار بنا کر جھکا دیا اور حسین کا پلہ فضائل ومناقب اور اخلاقی وعملی خوبیوں سے خالی اور بے

وزن دکھلا کر اوپر اٹھا دیا، تاکہ امت کا وہ ذہن بدل
جائے جو ابتک اس کے برعکس قائم شدہ تھا''

(شہید کربلا اور یزید۔ مشمولہ تنقیحات حکیم الاسلام ۲/۲۲۴)

پروفیسر غلام جیلانی برق کے مضمون ''دوقرآن'' پر محققانہ تردیدی کلام:۔

۱۹۴۲ء میں پروفیسر غلام جیلانی برق صاحب نے ایک فتنہ کھڑا کر دیا، اور اپنے موقف کی تائید میں ایک کتاب '' دوقرآن'' کے نام سے لکھی ۔انہوں نے دوقرآن یعنی ایک ''علمی قرآن'' جو ہمارے سامنے ہے اور دوسرا ''عملی قرآن'' ہے ۔اس فتنہ نے بہت تیزی سے پھیلنا شروع کر دیا۔قاری صاحب نے اسکے جواب میں ''دونظریہ قرآن پر ایک نظر'' لکھکر ہمیشہ کے لئے اس فتنہ کا سد باب کر دیا۔پیش ہے اس تردیدی کلام کا ایک اقتباس:۔

''مصریوں کی سائنٹفک ترقیات ، بےنظیر باغات ،
خوشنما آبشار ، سرسبز کھیتیاں ، دلفریب سبزیاں
اسباب عیش ونشاط،فرعونی دماغ کے مجوزہ سر
بفلک مینارے جن کی مدد سے وہ آسمان کے
دروازوں سے قریب ہوکر موسیٰ علیہ السلام کے خدا
سے مقابلہ کا حوصلہ کر رہا تھا۔ان کے لئے کچھ بھی
کارآمد ثابت نہ ہوا ۔اور یہی ساری سائنٹفک
ترقیات فرعون اور فرعونیوں کے حق میں موجب
ہلاکت وتباہی بنی ۔ بالآخر نام اور کام اگر باقی رہا تو
حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کی سادگی وبے
تکلفی کا جسے برق صاحب خالص ملائیت قرار
دیتے ہیں''۔

(نظریہ دوقرآن پر ایک نظر۔ مشمولہ تنقیحات حکیم الاسلام ۲/۱۵۱)

اسلوب بیان:۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب جس طرح مذہبی عالم ہونے کی وجہ سے منفرد شخصیت ہیں اسی طرح ایک مصنف کی حیثیت سے بھی وہ ایک خاص طرز تحریر کے حامل ہیں۔ قاری صاحب کا اسلوب بیان ان کی طرز خاص ہے جس کو انہوں نے اپنے ادائے مطالب کا وسیلہ بنایا ہے۔

قاری صاحب نے اپنی کئی ایک مذہبی تصانیف کے علاوہ اسفار نامے اور اردو ماہنامہ ''دارالعلوم'' اور پندرہ روزہ ''میقات'' شائع کر کے اردو زبان وادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔

قاری صاحب کے نثری اسلوب کا جائزہ لینے سے قبل بہتر ہوگا کہ اسلوب کی تعریف ذکر کی جائے۔ اسلوب' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طریقہ' راستہ' مذہب' روش اور ڈھنگ کے ہیں۔

(اللسان العرب۔ ص ۴۷۲)

فارسی میں اس کے لئے ''سبک'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور انگریزی میں اسے ''اسٹائیل'' کہتے ہیں جس کے معنی طرز بیان یا طرز ادا کے ہیں۔ یعنی وہ ڈھنگ جس سے کوئی انشا پرداز شاعر اپنے افکار کو بیان کرتا ہے۔

اسلوب کی تعریف:۔

اسلوب کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علمائے ادب کی مختلف رائیں ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے اسلوب کی تعریف اس طرح سمجھائی ہے:

> '' کہ اسلوب کا کام اظہار' ابلاغ اور تاثر پیدا کرنا ہے' یہی وہ خوبی ہے جو عام لکھنے والوں اور صاحب طرز ادیبوں میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ بقدرِ حاجت اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ہر کوئی جانتا ہے۔ تاہم بنیادی چیز یہ ہے کہ بات قاری کے دل و دماغ میں اس طرح اتر جائے جیسے

خود اسی نے کہا ہو۔ اس کے لئے اسلوب میں
جہاں ایک انفرادیت کی ضرورت ہوتی ہے وہیں
دوسری طرف دل نشینی بھی کم اہمیت نہیں رکھتی۔
جب تک اسلوب بیان دل کش' دل نشین نہ ہوگا
تب تک ایک اچھا اسلوب وجود میں نہیں آسکتا' یہ
دل نشینی خود بخود پیدا نہیں ہوجاتی بلکہ اس کے لئے
محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے گویا وہ مصنف
کے ذہن کی گونج بعد میں ہے اور محنت اور مرصع
کاری کا طالب پہلے''۔

(دیدہ ودریافت۔ص:۱۱۲)

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی نے اسلوب کی تعریف یہ لکھی ہے کہ:

''اسلوب مصنف کا وہ طرز تحریر ہے جو دلکشی کے
ساتھ ساتھ امتیازی خصوصیات کا حامل ہو اور تقلید کو
چھوڑ کر اپنا راستہ الگ اختیار کرلے''۔

(خواجہ حسن نظامی حیات وادبی خدمات۔ص ۹۰۳)

صاحب طرز:۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہر فنکار جب اپنا فن پارہ پیش کرتا ہے تو اس کا طرز دوسروں سے مختلف ہوتا ہے چاہے وہ مصوری ہو یا نقاشی' ادب ہو یا موسیقی' ایک ہی تصویر کو جب مختلف مصور بناتے ہیں تو ہر تصویر میں تھوڑا بہت فرق ضرور پیدا ہوجاتا ہے اگرچہ ان سب تصاویر میں ایک ہی طرح کے رنگ و روغن استعمال کئے جائیں۔ یہی حال ادب کا ہے جب مصنف کوئی تخلیق پیش کرتا ہے تو چاہے وہی مضمون ہو یا الفاظ وہی ہوں جو اس سے پہلے یا اس کے ہم عصروں نے سینکڑوں یا ہزاروں بار استعال کئے ہوں یا اسی طرح جب اسی مضمون کو ان ہی الفاظ کے ذریعہ کوئی دوسرا شاعر اس طرح بیان کرتا ہے

کہ اس میں انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ انفرادیت ہے جس سے مصنف کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔

بہر حال اسلوب کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ منفرد ہو' پر اثر ہو اور مصنف کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہو۔ ادیب اپنی ادبی تخلیقات میں اپنی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ قاری محمد طیب صاحب کے ادبی کارناموں میں ان کی شخصیت اور ان کا انفرادی اسلوب بیان ہر جگہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ قاری صاحب کی عظمت کا بڑی حد تک انحصار ان کے ادبی اسلوب پر ہے۔ ان کا اسلوب دور جدید کی بنیادی اسالیب میں امتیازی شان رکھتا ہے اور اسلوب جدید کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔

قاری صاحب کے اسلوب نگارش کی خوبیاں:۔

ہم نے گذشتہ سطور میں قاری صاحب کے ارد و ادب میں ادبی و تنقیدی مقام کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ انکی مجموعی تصانیف کے پس منظر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ قاری صاحب کے اسلوب نگارش کی خوبیوں کی نشان دہی کریں۔ ہم نے یہ خوبیاں اور خصوصیات مطالعہ کے بعد سمجھی ہیں، اور یہ حرف آخر نہیں ہیں، ہر صاحب علم و عقل ان میں اضافہ کر سکتا ہے۔ قاری صاحب کے اسلوب نگارش کی ادبی اور تنقیدی خوبیوں کی ہم نشان دہی پچھلے سطور میں کر چکے ہیں ان کے علاوہ ایک خصوصیت یہ کہ آپ کے یہاں استدلال میں شدت اور قوت اسقدر ہے کہ اپنے موقف کی وضاحت میں دلائل عقلیہ اور نقلیہ جمع کر دیتے ہیں اور بحث کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے۔

قاری صاحب کی یہ خصوصیت تقریباً ہر تحریر میں نمایاں ہے لیکن ''معجزہ کیا ہے؟'' نامی کتاب کی ہر سطر ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے۔ قاری صاحب کی یہ معرکتہ الآراء تصانیف مین سے ہے جو اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے عوام و خواص دونوں طبقوں کیلئے انفرادی خصوصیت کی حامل ہیں۔

اس کتاب میں انتہائی مربوط اور دلچسپ انداز میں معجزوں کی حقیقت اور انبیاء علیھم السلام کے ہاتھوں پر ان کے ظہور کے وجوہ پر ایک جامع اور مدلل بحث کی گئی ہے۔

پیغمبران حق ان گم کردہ راہ قوموں کی راہبری اور راہنمائی کیلئے اس عالم میں تشریف لائے جو مسبب الاسباب اور اس کی مشیتوں سے انحراف کر کے صرف اسباب و عوارض کے جویا بن گئے تھے۔

ان کو اللہ کہا، کسی نے ثالث ثلاثہ کہا، کسی نے ابن اللہ کہا۔

تو خالق کی خصوصیت مخلوق میں مان رکھی تھیں اور مخلوق کی ذلیل خصوصیات کو بعض قوموں نے خالق میں تسلیم کر رکھا تھا آج بھی توراۃ میں لکھا ہوا موجود ہے کہ اللہ میاں کی کشتی اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) سے ہو پڑی تو اسرائیل نے اللہ میاں کو پچھاڑ دیا اور غالب آگئے۔ تو عجز وضعف اور درماندگی جو مخلوق کی صفات ہیں وہ خالق میں مان رکھی تھیں۔ آج بھی توریت میں یہ آیت موجود ہے کہ جب طوفان نوح آیا تو اللہ میاں کو اتنا صدمہ ہوا کہ اور تو کچھ نہ کر سکے رو پڑے اور اتنا روئے کہ آنکھیں دکھنے کو آگئیں اور فرشتے عیادت کے لئے گئے کہ اب مزاج کیسا ہے؟

(معجزہ کیا ہے؟ ص: ۱۵)

قاری صاحب کی تسہیل نگاری:-

قاری صاحب نے معجزات کے سلسلہ میں دقیق سے دقیق بحثوں کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنی تحریر کا مخاطب ایسے لوگوں کو بنایا ہے جو گویا علم سے کورے ہیں اور ان کی تفہیمی صلاحیت بھی انتہائی سطحی ہے۔ اسی بنیاد پر عقلی دلائل کے تحت ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو روزمرہ کے استعمالات کی ہیں۔ آپ نے ان سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں مثلاً واقعہ معراج کے منکرین کے سامنے آپ نے جدید سائنسی ترقیات کو پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ آج بھی دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس:

''یہ (معراج) طی ارض ہے جو کہ کرامت
تھی۔خرقِ عادت تھی؛ اس پر اگر کوئی اشکال کرے
کہ یہ کیسے ہوگیا؟ تو وہ بوئنگ(Boeing) ہوائی
جہاز میں بیٹھ کر کراچی سے ڈھاکہ چلا جائے' دو
ہزار میل کی مسافت ہے' اگر دو ہزار میل کی
مسافت آپ بیل گاڑی سے طے کریں تو کئی مہینے
لگیں گے اور موٹر میں طے کریں تو ممکن ہے کہ
پندرہ بیس دن لگ جائیں لیکن ہوائی جہاز نے دو
ہزار میل کی مسافت اڑھائی گھنٹے میں طے کردی۔
معلوم ہوا کہ سرعت سیر کی کوئی انتہا نہیں' جو
مسافت دس برس پہلے ہم چھ مہینے میں طے کرتے
تھے وہ چھ گھنٹے میں طے ہوئی اور چھ گھنٹے کے
بجائے اب جبکہ بوئنگ ہوائی جہاز آگیا تو وہ
اڑھائی گھنٹے میں طے ہوئی اور اب ایک اور ہوائی
جہاز کا اعلان کیا جا رہا ہے وہ ایک گھنٹے میں پندرہ
سو میل اڑان کرے گا تو اب دو ہزار میل سوا گھنٹے
کے اندر طے ہوجائیں گے''۔

(معجزہ کیا ہے؟ص:۲٦)

مخالف پر الزامی جوابات وسوالات:۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مخالف کو تحقیقی جوابات دینے کے ساتھ ساتھ فریق مخالف کے سوالات واعتراضات پر الزامی سوالات قائم کرتے ہیں جس سے فریق مخالف کے معتقدات کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے۔

آپ کی تصانیف میں سے ''شہید کربلا اور یزید'' اسی نوعیت کی کتاب ہے' دراصل یہ کتاب محمود عباسی کی رسوائے زمانہ کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ عباسی صاحب کی کتاب دارالعلوم دیوبند کے نقطۂ فکر کے لحاظ سے ایک انتہائی گمراہ کن اور بہر لحاظ غلط کتاب ہے' کتاب کی بحث کالبِ لباب یزید کو خلیفۂ برحق دکھلا کر سیدنا حسینؓ کو اس کے مقابلہ میں خروج کنندہ اور باغی ثابت کرنا ہے۔ بزرگان دارالعلوم دیوبند بصیرت وتحقیق کی روشنی میں حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کو برحق اور یزیدیوں کے موقف کو نفسانیت پرمبنی سمجھتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب نے ترجمان دارالعلوم کی حیثیت سے اس تحریر کا کامیاب تعاقب کیا۔ پیش خدمت ہے اس تحریر کا ایک اقتباس جس میں قاری صاحب نے عباسی صاحب کی تحقیق اور ریسرچ کی قلعی کھولی ہے لکھتے ہیں:

> ''یزید سے اگر فسق اٹھایا جاتا بشرطیکہ اٹھ سکتا ہوتو کوئی حرج نہ تھا' الٹا اسے خلفائے راشدین میں شمار کرادیا جانا تاریخی ریسرچ نہیں بلکہ تاریخ کے علی الرغم وہ ہی نظریاتی ریسرچ ہے۔ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی کوفہ یا متعلقہ واقعات کے سلسلہ میں اگر کسی پہلو کی کوئی خطاءِ اجتہادی ان کی طرف منسوب کردی جاتی تو ان کی شان عالی کے منافی نہ ہوتی' لیکن ان کی ذات اقدس کو حب جاہ و ہوس اقتدار سے متہم ٹھہرانا تاریخ نہیں بلکہ وہی ذہنی منصوبہ بندی ہے۔
>
> غرض یزید کی حمایت میں بے سدھ ہوکر حضرت امام ہمام کی مذمت پر اتر آنا نہ کوئی تاریخی ریسرچ ہے' نہ مذہبی اور نہ دینی خدمت بلکہ پرائی بدشگونی

میں اپنی ناک کاٹ لینے کے مترادف ہے' یقیناً
اسے معتدل طریق کار نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی فریق
مخالف کا رد کرتے کرتے خود اپنا بھی رد کر جائے۔
اس لئے سبائیت کی تردید تو بلاشبہ تاریخی خدمت
تھی مگر زور میں آکر سبائیت کی تائید کرنا نہ تردید
رہتی ہے نہ تائید۔

(شہید کربلا اور یزید : ص:۴۵)

تائید اور تردید میں فرق:۔

قاری صاحب نے مذکورہ اقتباس میں الزامی تحریر کے ضمن میں تردید اور تائید کا لطیف فرق بیان کیا ہے وہ یقیناً قاری صاحب کا ہی حصہ ہے۔اس کتاب میں آگے قاری صاحب نے ''صحابیت'' کی بلند تحقیق کی ہے' آپ ان کی تحقیق کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

''اس روایت کو سامنے رکھ کر عباسی صاحب کو اب
محض عمر کی وجہ سے حضرت حسینؓ کو صحابی تسلیم
کر لینے میں تأمل نہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ صرف
پانچ سال کے تھے' اب وہ اپنے لفظ ''صرف'' پر
نظر ثانی کریں جس کو حافظ ابن کثیر نے تو ذکر نہیں
کیا بلکہ **اونحوھا** کے لفظ سے اس سے زیادہ عمر
کی گنجائش دی ہے اور ادھر خطیب بغدادی نے
حضرت حسن کی عمر آٹھ سال کی ثابت کر کے اسے
رد کیا ہے۔اگر اس تاریخی ریسرچ کے زمرہ میں
خطیب کی یہ روایت سامنے آجاتی تو شاید عباسی
صاحب نہ لفظ ''صرف'' لکھنے کی جرأت کرتے اور

نہ شاید حضرت حسینؓ کی صحابیت میں کسی شک وشبہ
کو گنجائش دیتے۔ کیونکہ سات سال کی عمر میں ہر
ملک کے عرف میں شعور اور سمجھ کی عمر سمجھی جاتی ہے
جس میں بچہ خطاب کو بے تکلف سن اور سمجھ لیتا ہے
اور اسی لیے اس عمر سے بچہ پر تربیتی روک ٹوک
سخت کردی جاتی ہے اور اسے عواقب ونتائج دکھلا کر
ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔''

(شہید کربلا اور یزید :ص:۴۷)

آپکی تحریر میں ترتیب:۔

تیسری خصوصیت یہ کہ جب آپ کسی موضوع پر برجستہ لکھتے ہیں تب بھی موضوع کے مواد کی حسن ترتیب کا خاص لحاظ رکھتے ہیں، قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے اس پر مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ایک طویل عرصہ تک غور وخوض کیا ہے اور ایک لمبی مدت اس مواد کی ترتیب وتہذیب میں لگائی ہے۔

آپ کے اس اسلوب کے لئے ''سوانح قاسمی'' کے مقدمہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''مجتہدین کا رتبہ عام فقہاء اور محدثین سے نیابت
رسول میں اسی لئے بالاتر ہے کہ رسول شرائع اصلیہ
لاتے ہیں اور یہ مجتہدین ان میں سے شرائع وضعیہ
نکال کر ظاہر کردیتے ہیں، جس سے انبیاء کا دین
مفصل اور مدلل ہوکر ایک مرتب گلدستہ اور باغ و
بہار نظر آنے لگتا ہے جس میں ہر رنگ کے پھول
اپنی اپنی جگہ نصب اور کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔
بالکل اسی طرح مؤرخین اگر جزئیات معلومہ پیش

کرتے ہیں تو فقیہ فی التاریخ اصولی رنگ سے ان
جزئیات اصلیہ میں سے جزئیات فرعیہ نکال کر
تاریخ کے خالی گوشوں کو پر کردیتے ہیں جس سے
روایت اور راویون کے فقدان کا قرار واقعی تدارک
ہوجاتا ہے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اگر اس سوانح
کے روایتی مواد کے ساتھ مولانا کی درایت کا مواد
شامل نہ ہوتا تو یہ سوانح ''ناقص اور چند جزئیات''
میں محدود ہوکر رہ جاتی اور اصولی تو کسی طرح بھی
نہ بن سکتی جو اس کا واقعی مقام تھا''۔

(مقدمہ سوانح قاسمی ۔ص ۱۸۔ج ا)

مولانا گیلانی کی تحریر کو سند :-

یہ مذکورہ اقتباس مقدمہ سوانح قاسمی کا ہے جس کو آپ نے برجستہ اور بروقت لکھا تھا لیکن الفاظ کی ترتیب اور عبارت کا مفہوم بتاتا ہے کہ آپ نے برسوں اس موضوع سے متعلق سوچا اور غور وفکر کیا ہے۔ دراصل یہ تحریر سوانح قاسمی کے مصنف حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کے اسلوب تحریر سے متعلق ہے۔ مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی جو ضخیم ۳ جلدوں میں ناتمام ہمارے سامنے ہے صرف یہ صفحات کے رسالہ'' حالات قاسم'' مصنف مولانا یعقوب صاحب نانوتوی کی شرح میں لکھے ہیں اور فاضل موصوف نے بذات خود وضاحت فرمائی ہے کہ الامام قاسم صاحب سوانح کی ترتیب کے وقت صرف یہی چند صفحات میرے سامنے ہیں لیکن متن کو طول دینے کا فن مولانا گیلانی کے قلم کی بلائیں لیتا ہے۔ مولانا نے ان چند صفحات کو سینکڑوں صفحات میں پھیلا دیا۔

قاری صاحب مرحوم مذکورہ اقتباس میں مولانا گیلانی کے اسلوب تحریر کو سند پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں جس کے لئے انہوں نے ''شرائع اصلیہ'' اور'' شرائع وضعیہ'' جیسی اصطلاحیں استعمال کر کے'' فقہ'' کے باریک بحثوں کا سہارا لیا ہے۔ یہ قاری صاحب جیسے صاحب قلم کا ہی حصہ

ہوسکتا ہے کہ انہوں نے برجستہ تحریر کو بھی وقار اور سنجیدگی بخش دی۔

سوانح نگاری کی اہمیت وضرورت:۔

اسی برجستہ مقدمہ کا ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں آپ نے سوانح نگاری کی تاریخ اور اس کو قوم کا سرمایہ اور نوجوان نسل کے لئے مشعل راہ بتایا ہے لکھتے ہیں:

''دنیا میں مذہبی اور قومی مقتداؤں کی سوانح نگاری کا معمول قدیم سے چلا آرہا ہے اور ان میں بھی خصوصیت ہے ایسی ممتاز ومقتدر شخصیتوں کی سیرت وسوانح کا تحفظ اور بھی زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے جو اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے ساتھ کوئی خاص نصب العین اور نظریہ لے کر اٹھی ہوں' اور اپنی دعوت و رہنمائی سے کسی قوم کا مرکز ومدار قرار پائی ہوں۔ ایسی شخصیتوں کی زندگی کا دنیا کے سامنے پیش کیا جانا محض اس لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ زندہ رہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے زندگی بخش نصب العین سے قومیں زندہ رہیں یعنی ایک رہنمائے ملت کو مرنے کے بعد اس لئے زندہ نہیں رکھا جاتا کہ صرف اس کا نام باقی رہے بلکہ اس لئے کہ اس کا کام باقی رہے اور کام سے اس کی قوم کامیاب ہوکر باقی رہے' پھر ایسی شخصیت جبکہ کسی قوم کے ناہموار اور بگڑے ہوئے حالات میں سامنے آئے اور اپنی قریب المرگ قوم کو سہارا دے کر سنبھال لے جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ ایسی

شخصیت کو مدام باقی رکھنا درحقیقت اس کے اصلاحی
نقوش کو قائم رکھنا ہے"۔

(مقدمہ سوانح قاسمی۔ص:۱۔ج:۱)

قاری صاحب کے اس برجستہ مختصر اقتباس میں فن سوانح نگاری کی تاریخ، ضرورت اور اہمیت تفصیل کے ساتھ آ گئی ہے۔

موضوع سے پہلے اصول وکلیات کا بیان:-

چوتھی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے تمہیدی طور پر کچھ اصول وضوابط اور کلیات بیان کرتے ہیں۔ اور انہی اصول وکلیات کو مرکزی حیثیت دے کر پوری بحث کو پیش کرتے ہیں، آپ کے اس طرز کی وجہ سے ایک عام قاری بھی پوری بحث کو سمجھ لیتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس خصوصیت کی وجہ سے قاری صاحب چند مشہور مصنفین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپکا یہ اسلوب "مسئلہ قربانی پر ایک نظر" میں نمایاں ہے۔

اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

"مسئلہ کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے اور
یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اسی طرح تشریعی بھی
ہے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو
چیزوں سے ملا کر بنایا ہے ایک روح، ایک جسم۔
یعنی ہر چیز کی ایک صورت ہے۔ ایک اس کی
حقیت۔ ایک شئی کی ہئیت ہے اور ایک اس کی
ماہیت ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک اس کا ظاہر حصہ
ہے اور ایک باطنی، غرض تمام انسان، کل حیوانات،
نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں
اس کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن بھی

ہے اور ایک اس کی روح بھی ہے' اور ہر بدن میں
خدا تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔
جب حق تعالیٰ کی توجہ کائنات کی طاقتوں اور
بدن بنانے کی طرف متوجہ ہوئی تو یہی اصول مد
نظر تھا''۔

(مسئلہ قربانی پر ایک نظر: ص:۲)

روح کیلئے بدن ذریعہ :-

قاری صاحب نے اس اصول کو مرکزی حیثیت دے کر بات کو آگے بڑھایا ہے اور مثالوں سے ذہن نشین کرایا ہے' اسی سلسلہ کی ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمائیں:

''اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح
تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعہ
پہنچ سکتا ہے' اس عالم میں براہ راست روح کو متاثر
کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً اگر آپ روح پر
گرمی کا اثر کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے
لے جائیں گے' جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا اس
کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی اور ٹھنڈک پہنچانا
چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے یا اس پر
برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔ غرض ہر
تاثیر کیلئے بدن ذریعہ ہے بغیر بدن کے اثرات
نہیں پہنچ سکتے۔''

(مسئلہ قربانی پر ایک نظر: ص:۵)

سادہ اور دلنشیں اسلوب :-

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ جس کو بلا شبہ انفرادی خصوصیت کا نام دیا جاسکتا ہے کہ دقیق سے دقیق مضامین کو دل نشیں اور سادہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔

قاری اسکو پڑھکر حیرت واستعجاب کے عالم میں غوطہ لگاتا ہے اور ایک عام انسان بھی موضوع کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک مرتبہ پروفیسر ایس۔ ایم بھٹناگر' ہیڈ آف جغرافی ایم۔ ایس کالج غازی آباد نے قاری صاحب سے اسلامی رسم ورواج کے متعلق چند سوالات کئے تھے جن کا جواب انہیں ملا تو انہوں نے نہایت درجہ اطمینان اور تسلی کا اظہار کیا۔ پھر انہوں نے سوال کیا کہ قدیم زمانہ میں جبکہ نہ قطب تھا' نہ حدود اور سمتوں کا تعین کرنے کا کوئی اور سائنسی ذریعہ تو آج ہر ملک اور ہر شہر میں کعبۃ اللہ کا رخ کس طرح سے متعین کر کے مسجدیں اس کی سمت بنائی گئیں؟ کعبہ کی صحیح سمت پر مساجد کا رخ رکھنے میں کیا ذریعہ اختیار کیا گیا؟

ظاہر ہے پروفیسر کا یہ سوال انتہائی مشکل اور فلسفی کی دقیق بحث کا حصہ ہے لیکن قاری صاحب کے اسلوب کی سادگی اور تسہیل نگاری نے اس اہم موضوع کو بھی عام فہم بنادیا۔

اس اہم تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"ادھر جو عبادتیں مہینوں اور سال سے متعلق تھیں
اور ان کی ادائیگیوں میں مہینوں اور سالوں کی
مدتوں کا فاصلہ پڑتا تھا' ان میں نظام قمری سے کام
لیا' کیونکہ طبعی طور پر چاند کا کام دن اور رات بنانا
نہیں بلکہ مہینے اور سال بنانا ہے اور اس کی مختلف
الاوضاع نقل وحرکت سے مہینے ہی بن سکتے تھے'
جس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو چاند کا ظہور دن میں
ہوتا ہی نہیں صرف رات میں ہی ہوتا ہے' تو دن

اس کی گرفت کر بھی کیسے سکتا تھا' پھر رات کی حد
تک بھی وہ ہر رات میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے
گھٹ جانے کے آخری ہلالی دور میں کتنی ہی
راتیں اس کے دیدار سے بھی محروم رہتی ہیں
اور جن راتوں میں اس کا ظہور بھی ہوتا ہے تو وہ
یکسانیت کے ساتھ نہیں ہوتا' جس سے کوئی رات
بھی اپنی ظلمت و نورانیت بلکہ اپنے طول وعرض
کے لحاظ سے اصولاً یکساں نہیں بن سکتی تھی' اس
صورت میں اگر رات کا وجود چاند سے مان لیا
جائے تو رات بھی مکمل نہیں بن سکتی اور اس
تناسب سے کوئی دن بھی مکمل دن نہیں بن سکتا'
جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ کوئی نہ کوئی مہینہ مکمل ہوتا نہ
کوئی سال مکمل''۔

(سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ۔ص:۴)

چاند اور سورج کی گردش:۔

اس تحریری اقتباس میں موصوف نے چاند اور سورج کی گردش' ان کا گھٹنے بڑھنے اور دن و رات کے بنیادی مرکز کو بیان کیا ہے' علم فلسفہ میں یہ موضوع دقیق تر موضوع ہے' مگر موصوف کے اسلوب نے اس کو آسان تر کر دیا' اس بحث کا آخر بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں آپ نے عرب کو بنیاد بنا کر قبلہ کی سمت کو طے کیا ہے لکھتے ہیں:

''کیونکہ عرب جس ملک میں بھی پہنچے اپنی فلکیاتی
مہارت کے تحت یہ اصول ان کے سامنے تھا کہ
بعض ممالک مکہ کے بائیں جانب مشرق میں ہیں

اور بعض جانب مغرب میں ۔ بعض جنوب میں
واقع ہیں اور بعض شمال میں۔ اس لیے مشرقی ملکوں
میں پہنچ کر تو انہوں نے قبلہ کی سمت کیلئے مغرب کی
جانب کو متعین کرلیا اور مغرب کی جانب رخ
کر کے نمازیں ادا کیں۔ اور اسی طرز پر ان ممالک
میں مسجدیں تعمیر کیں اور مغربی ممالک میں پہنچ کر
اس کے برعکس مشرقی جانب کو سمت قبلہ قرار دے کر
نمازوں کا رخ جانب مشرق پھیر دیا اور اس رخ پر
مسجدیں تعمیر کیں۔

یہی صورتحال شمال و جنوب میں بھی سمجھ لی جائے
کہ کعبہ سے جانب شمال کے ممالک میں جانب
جنوب کو اور جنوبی ممالک میں جانب شمال کو سمت
قبلہ قرار دیا۔ پھر جو ممالک قبلہ سے ٹھیک مشرق و
مغرب یا شمال و جنوب میں نہ تھے بلکہ کچھ ادھر
ادھر ہٹے ہوئے شمال مشرق یا جنوب مشرق وغیرہ
میں تھے تو اصول مذکورہ کے تحت انہوں نے اسی
حد تک' ادھر ادھر مسجدوں کا رخ اور سمتِ قبلہ کو
متعین کرلیا''۔

(سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ۔ ص ۱۵)

علوم نانوتوی اور فلسفۂ ولی اللہ کی ترجمانی :-

چھٹی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں علوم نانوتوی اور فلسفۂ ولی اللہ کی ترجمانی ملتی ہے، آپکی ان تحریروں میں علوم نانوتوی اور فلسفۂ ولی اللہ سے مناسبت کا احساس شدید ہوتا ہے۔

آپ نے ان علوم کی دقیق اور غامض اصطلاحوں کو سہل الحصول بنا کر پیش کیا ہے۔ اگر اس سے بڑھ کر یہ بات کہی جائے تو ہم حق بجانب ہوں گے کہ آپ علوم نانوتوی اور فلسفۂ ولی اللہ کے مجدد ہیں۔ آپ کی کتاب "فلسفۂ نعمت ومصیبت" ہمارے تبصرہ کی گواہ ہے۔

موصوف کی کتاب "فسلفہ نعمت و مصیبت" سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں موصوف نے کائنات کے تکوینی تغیرات یعنی غیر اختیاری مصائب کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اب سوچو کہ اگر اس عالم کے حوادث وتغیرات یہی ہیں کہ وجودی چیز سے وجود چھنتا رہے اور وجودی آثار پر عدمی آفات گرتی رہیں۔ مثلاً صحت پر عدم صحت یعنی مرض کا ورود ہوتا ہے، راحت پر عدم راحت یعنی کلفت و اذیت کا ہجوم رہے، طمانیت قلب پر عدم طمانیت یعنی تشویشات کا توارد رہے، سلامتی پر شکستگی اور پامالی کی آفت رہے، علم پر جہل کی، عدل پر ظلم کی، وجدان رزق پر فقدان رزق کی، جمع مال پر تفریق کی، جاہ وعزت پر ذلت و مسکنت کی، خوشحالی پر بدحالی کی اور زندگی پر موت کی یورش ہوتی رہے یعنی اصول پر اضداد کا تسلط ہوتا رہے، نیز عالم النفس کی طرح عالم آفاق میں مثلاً پیداوار پر خشک سالی اور قحط کی آفات پڑتے رہنا، صاف ستھری ہوا پر سمیت دوڑتے رہنا، جس سے فضاء فاسد ہوکر وبائیں پھیلتی رہیں، امن و سکون پر اضطرابات و زلازل کا ہجوم ہوتے رہنا وغیرہ اور اسی کا نام تغیر ہوا اور یہی تغیر اس عالم کی

تمام حقیقت بھی ہو تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ عالم
کے رہتے ہوئے یہ تغیرات اس میں نہ ہونے
چاہئیں۔ کہ یہی تغیرات تو اس عالم کی ذات و
ذاتیات ہیں''۔

(فلسفۂ نعمت و مصیبت۔ ص: ۳۰)

کائنات کے تکوینی تغیرات کے راز:۔

یہ اقتباس قاری صاحب کی اس تحریر کا ہے جس میں آپ نے کائنات کے تکوینی تغیرات اور غیر اختیاری مصائب پیش آنے کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے یعنی یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کائنات میں تکوینی تغیرات کی حکمت اور رسم کیا ہے؟ اور یہ حقیقت ہے کہ اسرار و رموز اور حکمتوں کو بیان کرنا یہ مستقل فن ہے جس کے مدون اول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ آپ نے اس فن کی تکمیل کے لئے حجۃ اللہ البالغہ جیسی بے نظیر کتاب لکھی اور اس فن کے مدون ثانی قاری صاحب موصوف کے دادا حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ہیں۔ آپ کی آب حیات اور قبلہ نما جیسی کتابیں اسی موضوع پر ہیں۔ ظاہر ہے دادا کے اثرات نسبی طور پر پوتے میں منتقل ہونا لازمی امر ہے اور ہم تیسرے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ ایک طویل عرصہ حضرت قاری صاحب حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس سے وابستہ رہے ہیں جن کی بنیاد پر آپ علوم ولی اللّٰہی کے بھی شارح مانے جاتے ہیں۔ اس طرح آپ کی تحریروں میں مذکورہ دونوں شخصیتوں کے علوم کا حسین سنگم نظر آتا ہے' ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ فرمائیں جس میں آپ نے بڑی شدت سے ثابت کیا ہے کہ عدمی آفات بغیر ایجاد خداوندی ظاہر نہیں ہو سکتیں۔

''لیکن ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگرچہ
ان عدمی شرور و آفات کا سلسلہ ہماری ہی اندرونی
بنیادوں سے چلتا ہے' کہیں باہر سے لا کر خواہ مخواہ
مسلط نہیں کر دیا جاتا مگر پھر بھی ان آفات کا ظہور

عدم محض سے نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے
ساتھ وجود نہ لگ جائے' اور وجود کا لگنا بغیر مرضی و
ارادہ حضرت واجب الوجود جل وعلا نہیں ہوسکتا
اس لئے بالفاظ دیگر دعویٰ کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان
عدمی آفات کا ظہور بغیر حق تعالیٰ کے فعل وتصرف
اور ایجاد وتخلیق کے ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ
باوجود منشاء شرور و نقائص ہونے کے از خود اپنی
شرور کو نمایاں کرنے کی بھی اہلیت وقوت نہیں رکھتا
کیونکہ کسی خاصیت کو ابھارنا یا کسی تصور کو اچھالنا
اس لئے عدم محض کا کام نہیں جو خود لاشئی محض ہے'
یہ کام تو شئی کا ہوسکتا ہے جو ہست ہو نیست نہ ہو' نہ
کہ لاشئی کا جو سرے ہی سے ہست نہ ہو محض
نیست ہو اور ظاہر ہے کہ شئی یا ہست بجز وجود کے
اور کیا ہے! کہ خود بھی ہست ہے اور دوسرے
معدومات کو اپنے اتصال سے ہست بنادیتا ہے''۔

(فلسفہ نعمت ومصیبت۔ ص:۵۵)

آپکی تحریروں میں دعوت فکر:۔

ساتویں خصوصیت یہ کہ آپ فریق مخالف کو مدلل اور مسکت جوابات دینے کے بعد آخر میں دعوت فکر دیتے ہیں کہ آپ کے اس موقف کی وجہ سے ملت کو کتنا نقصان ہوا اور اسکے آئندہ کیا کیا نقصانات سامنے آسکتے ہیں مثال کے طور پر جب آپ نے ''شہید کربلا اور یزید'' لکھی جس کا مختصر خلاصہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ آپ نے اس کے آخر میں شیعہ حضرات کو دعوت فکر دی، لکھتے ہیں:۔

''آخر میں ایک آخری گذارش یہ ہے کہ عباسی

صاحب کی اس کتاب سے یقیناً حضرات شیعہ کو
دکھ پہنچا ہے اور قدرتاً پہنچنا چاہئے تھا لیکن اس میں
انکے لئے جہاں دکھ کا سامان موجود ہے
وہیں عبرت کا سامان بھی مہیا ہے اور وہ یہ کہ جب
کسی کے معتقد فیہ کو بدعنوانی کے ساتھ برا بھلا کہا
جاتا ہے تو معتقدین کے دلوں پر کیا کچھ گذرتی
ہے۔ شیعہ حضرات اس سے عبرت پکڑیں کہ عباسی
صاحب نے حضرت حسین رضی اللہ تعالٰی کی شان
میں جو کچھ بھی کلمات کہے ہیں وہ یقیناً اس سے
بہت کم اور ہلکے ہیں جو حضرات شیعہ حضرات صحابہ
کرام خصوصاً شیخین کے بارے میں استعمال
کرتے ہیں لیکن اس پر یہ شیعہ بل بلا اٹھے، اور وہ
اس سے اندازہ کر لیں جب وہ حضرات شیخین
اور دوسرے حضرات صحابہ کرام کی نسبت اور بدگو
یاں اور بدتہذبی کے ساتھ سب وشتم کرتے ہیں تو
سنیوں کے دلوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ اگر ان کے
نزدیک عباسی صاحب کا یہ اقدام جو انہوں نے
حضرت حسینؓ کے بارے میں کیا خلاف تہذیب
اور دل آزار ہے تو انہیں سوچ لینا چاہئے کہ وہ خود
تہذیب سے انتہائی گرا ہوا اور سب وشتم پر مشتمل
دل آزار رویہ سنیوں کے مقتداؤں کے بارے میں
رکھتے ہیں اور اسے مذہب بھی سمجھتے ہیں سنیوں کے

لئے کس درجہ دل آزار اور دکھ دینے والا ہے اگر
عباسی صاحب کا رویہ قابل ملامت وانسداد ہے تو
شیعہ حضرات کی یہ سب وشتم کی روش کیوں قابل
انسداد نہیں؟''۔

(شہید کربلا اور یزید۔مشمولہ تنقیحات حکیم الاسلام ۲/۳۵۷)

جس طرح موصوف نے اپنی کتاب ''حضرات صحابہؓ کا مقام'' کے آخر میں اس طرح دعوت فکر دی ہے:

''میں نے اس لئے کہا کہ آج وہی یہود و نصاریٰ
جو جوتیوں کے نیچے تھے آج وہ آپ کو نصیحت
کررہے ہیں' اتنا انقلاب پیدا ہوگیا۔ کیا تھے ہم
اور کیا ہوگئے۔ اس حالت کو بدلنے کی ضرورت
ہے اور اس کی پہلی بنیاد تعلیم و تربیت ہے کہ علماء
ربانی سے تعلیم پائیں' تدریس کے ذریعہ قرآن و
سنت کا علم حاصل کریں' اس پر عمل کرنے کی
ٹریننگ حاصل کریں۔ اپنا ذوق اور فہم حاصل کریں
ان کی صحبت و معیت میں رہ کر رنگ پیدا کریں۔
صبغة الله ومن احسن من الله صبغة'
اللہ کا رنگ اپنے اندر داخل کریں' محض کتاب پڑھ
لینا کافی نہیں ہے۔ اس رنگ کو بھی لینا ضروری ہے
کہ قلب کا راستہ بھی صحیح ہو وہ بغیر مجاہدہ و ریاضت
کے درست نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت ہے۔

(حضرات صحابہؓ کا مقام: ص ۴۰)

آپکی تحریر میں احتیاط:-

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ آپ اپنی تحریر میں دینی مقتدا اور پیشوائے مسلک کی شان میں بیجا نازیبا کلمات استعمال نہیں کرتے ہیں اور تحریر کے آخر میں معذرت کرتے ہیں کہ اگر کہیں کوئی بات غیر مہذب لکھ دی گئی ہے تو اسکے لئے معافی چاہتا ہوں۔

اس کی ایک مثال موصوف کی کتاب ''سورۂ فیل میں پرویزی تحریف'' کے آخر میں اس طرح ہے:

> ''اس تحریر میں چونکہ رویہ مناظرانہ اور بحث و تمحیص میں کبھی غیرت ایمانی سے اور کبھی سبقت قلمی سے انداز بیان اور طرز تخاطب میں تجاوز بھی ہوجاتا ہے اس لئے اگر کوئی لفظ پرویز صاحب کی شان سے گرا ہوا یا ناگوار خاطر قلم سے نکلا ہو تو میں مخلصانہ طور پر معافی کا خواستگار ہوں' مجھے ان کی ذات سے کوئی پرخاش نہیں ہے' ہاں دین اور کتاب وسنت کے بارے میں ان کی یا کسی آزاد کی آزادی اور آزاد روشی اور اس کے متعدی اثرات تکلیف دہ ضرور ہیں اور ان سے صدمہ وقلق ضرور ہوتا ہے' معاملہ اگر محض دنیا کا ہو تو اس کا بہر حال ایک اختتام ہے لیکن ان امور میں سابقہ آخرت سے ہے اور وہاں پہنچ کر عقیدہ وعمل ہی کا حساب پیش کرنا ہے''۔

(سورۂ فیل میں پرویزی تحریف۔ص:٦٠)

مولانا احمد رضا صاحب کا استفتاء:-

۱۳۲۴ھ میں مولانا احمد رضا صاحب بریلوی نے نہ معلوم کس کے ایماء یا کس جذبہ کے تحت اس وقت کے جید علماء ہند کے خلاف ایک غلط استفتاء مرتب کیا اور علماء عرب سے فتویٰ حاصل کیا اور اس کو ہندوستان میں شہرت دینی چاہی' مگر جوں ہی اس کا علم علماء ربانیین کو ہوا انہوں نے صحیح صورتحال علمائے عرب کے سامنے رکھی جس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے فتویٰ سے رجوع کیا اور اعلان کیا کہ جن علماء کے متعلق دھوکہ دے کر ہم سے پہلے فتویٰ حاصل کیا گیا تھا وہ مخلص' متبع سنت اور ہندوستان میں کتاب وسنت کے سب سے بڑے معلم ہیں۔

ادھر ایک مستفتی نے پھر ''حسام الحرمین'' کے حوالے سے حجۃ الاسم حضرت مولانا نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷)' امام ربانی حضرت گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) شارح ابوداؤد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (متوفی ۱۳۴۶ھ) اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ) قدس اسرارھم کے سلسلہ میں پوچھا تھا کہ ان حضرات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

یہ استفتاء دارالافتاء سے ہوتا ہوا' قاری محمد طیب صاحب کی خدمت میں پیش ہوا' آپ نے قلم برداشتہ' ان سوالات کے جوابات تحریر فرمادیئے اور جوابات کے آخر میں علماء بریلی کے اکابر سے اس طرح معذرت کی:

''اس مضمون کے مقدمہ میں کچھ عرض کیا گیا ہے۔
وہ بیان واقعہ اور پس منظر کے اظہار کے طور پر ہے
کہ اس کے بغیر ان مسائل کے نشوونما کی تاریخ
سامنے نہیں آسکتی تھی' اور سائل کی تشفی بھی نہیں
ہوسکتی تھی جس نے سوال ہی تاریخی انداز پر کیا تھا۔
مضمون کے خاتمہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ
دلسوزی اور اظہار درد کے طور پر عرض کیا گیا ہے' نہ
طعن وتشنیع مقصود ہے نہ الجھنا یا الجھانا' اور نہ ہی

مناظرانہ بحثوں یا ''ردّوقدح'' کا سلسلہ چھیڑنا
پیش نظر ہے بلکہ نتیجہ بحث کے ساتھ صرف اپنے
دل کی دردمندانہ آواز سنانا ہے۔**واللہ علی
مانقول وکیل۔**
اس پر بھی اگر کوئی لفظ یا عنوان حضرات بریلی یا ان
کے بزرگوں کے خلافِ شان آ گیا ہو تو میں بصدق
دل اس کی معافی چاہتا ہوں' نیت میں اس قسم کا
کوئی نزعہ نہیں ہے''۔

(غلط فہمیوں کا ازالہ ۔ص:۳۱)

مسلک سے وابستگی :-

نویں خصوصیت یہ ہے کہ آپکی تحریروں میں مسلک سے وفاداری ووابستگی ،علماء سلف کی قدر دانی اور انکے لئے عذر خواہی ، اکابر امت سے استناد اور ان پر اعتماد اور مشاہیر اسلام کے علمی وعملی کارناموں کی روشنی میں اجتہاد اور انکے علمی وثقافتی ورثہ سے فراخ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ استفادہ، اسلام کے ماضی سے خوش گمانی اور حال و مستقبل کی طرف سے امید پروری کے ساتھ فکر مندی بھی پائی جاتی ہے۔

آپ کی اس خصوصیت کے سلسلہ میں آپ کی بے نظیر تصنیف ''علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' مکمل پیش کی جاسکتی ہے جس کی ایک ایک سطر سے مسلک کی وابستگی اور علمائے سلف کی قدر دانی کی داستانیں وابستہ ہیں۔ ہر ہر لفظ اکابر امت سے استناد اور ان پر اعتماد کے سلسلہ میں دلیل ہے۔آپ کی یہ پوری تحریر مشاہیر اسلام کے علمی وعملی کارناموں اور ان کے علمی وثقافتی ورثہ کی امین ہے۔آپ جہاں اپنے ماضی سے خوش نظر آتے ہیں وہیں مستقبل کی طرف سے امید پروری کے ساتھ فکر مند بھی ہیں۔اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ایسے ہی ان شعبوں کی مقدس شخصیتوں کی طرف

بھی ان کا رجوع اور ادب و احترام یکساں ہے
جب کہ ان میں سے ہر ہر شخصیت کسی نہ کسی جہت
سے ذات اقدس نبوت سے وابستہ اور نور نبوت
سے مستفید ہے۔ اس لئے علمائے دیوبند کے
محدث ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے وہ فقہ سے
کنارہ کش ہوں یا فقیہ ہونے کا مطلب یہ نہ ہوگا
کہ وہ حدیث سے یکسو ہوں، اصولی ہونے کا یہ
مطلب نہ ہوگا کہ وہ صوفی کو حقارت کی نگاہ سے
دیکھیں جیسا کہ ان کے صوفی ہونے کے یہ معنی نہ
ہوں گے کہ وہ متکلم کو کم رتبہ سمجھنے لگیں، جبکہ یہ ہمہ
نوع شخصیتیں کسی نہ کسی جہت سے خلفاء نبوی اور
آثار نبوت میں سے ہیں جیسا کہ صحابہ میں ہر رنگ
اور ہر طبقہ کے افراد جمع تھے مگر ایک دوسرے کی
عظمت و محبت اور ادب و احترام میں بھی انتہائی
مقام پر تھے۔ اس لئے امت کے اہل علم وفضل
افراد میں افضل ترین، مقبول ترین اور اعلیٰ ترین
افراد وہی سمجھے گئے ہیں جن میں ان تمام شعبہ
ہائے دین کے اجتماع سے جامعیت کی شان پیدا
ہوگئی ہو اور وہ بیک دم قرآن و حدیث، فقہ و اصول،
تصوف و کلام، روایت و درایت، پھر راہ اخلاق وعمل
کے مقامات، فقر و امارت، زہد و مدنیت، عبادت و
خدمت، خلوت پسندی و جلوت آرائی، بوریہ نشینی و

حکمرانی کے ملے جلے احوال و کیفیات سے سرفراز
ہوئے ہوں جیسا کہ حضرات صحابہ کی پاکیزہ زندگی
اسی جامعیت کا نکھرا ہوا نمونہ تھی' اور بعد میں بھی
ان کے نقش قدم پر قدم بقدم چلنے والی ذوات سے
امت کبھی خالی نہیں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی
شخصیت پر غلبہ خاص فن یا خاص شعبہ کا رہا ہو اور وہ
اسی شعبہ اور فن کے انتساب سے دنیا میں متعارف
ہوئے ہوں تو یہ جامعیت کے منافی نہیں۔''

(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور ان کا مسلکی مزاج: ص: ۶۵)

قاری صاحب کی تصانیف کی تعداد:-

ہم گذشتہ صفحات میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ قاری صاحب کی تصانیف واقعاتی ہیں، ہر کتاب کسی ناگریز ضرورت کے پیش نظر معرض تحریر میں آئی ہے۔ ایسا کم ہوا ہے کہ خود قاری صاحب کے ذہن نے کوئی علمی موضوع منتخب کیا ہو اور اس پر غور وفکر کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہو بلکہ اکثر ہوتا یہ رہا ہے کہ کسی نے ان سے علمی و مذہبی سوالات کئے یا ان کے گرد و پیش کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی یا اسلامی حلقوں میں کسی فتنہ نے سر اٹھایا اور اس کے دفعیہ کی ایک عالم دین کی حیثیت سے ان پر ذمہ داری عائد ہوئی اور انہوں نے قلم اٹھایا اور مختصر جواب یا مضمون کے بجائے ایک مستقل کتاب لکھدی اس کے علاوہ قاری صاحب کی بہت سی تقریروں کو بھی لوگوں نے مستقل کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے، ابھی چند دنوں پہلے مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے حضرت قاری صاحب کی تمام تحریروں، خواہ مستقل تصنیف ہو یا مضمون، تقریظ ہو یا خطوط سب کو جمع کیا ہے اور وہ سب ۱۳ ر ضخیم جلدوں میں مرتب ہوئی ہیں اس میں مجموعی رسالوں کی تعداد ۱۳۸ ر ہے۔

ان تیرہ جلدوں میں سے سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ہم تیرہ جلدوں میں پیش کی گئیں ۱۳۸ تحریروں کے نام لکھتے ہیں۔

۱۔ حدیث رسول کا قرآنی معیار

۲۔ معیار حق

۳۔ حضرت صحابہ کا مقام

۴۔ میلاد النبی کی شرعی حیثیت

۵۔ مسئلہ تقدیر

۶۔ معجزہ کیا ہے؟

۷۔ علم غیب

۸۔ اجتہاد اور تقلید

۹۔ شرعی پردہ

۱۰۔ تصویر اسلام کے آئینہ میں

۱۱۔ نسب اور اسلام

۱۲۔ راکٹ اور اسلام

۱۳۔ چاند سورج وغیرہ کی گردش

۱۴۔ کلمہ طیبہ قرآن وسنت کی روشنی میں

۱۵۔ شہید کربلا اور یزید

۱۶۔ اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں

۱۷۔ سورۂ فیل میں پرویزی تحریف

۱۸۔ بریلوی حضرات کی طرف سے پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ

۱۹۔ نظریۂ دوقرآن پر ایک نظر

۲۰۔ عرب اسرائیل جنگ کا ثمرۂ تلخ

۲۱۔ حقیقت مذہب وسائنس

۲۲۔دارالعلوم کا ایک فتویٰ اور اس کی حقیقت

۲۳۔حضرت تھانوی کی ایک عبارت کی توضیح

۲۴۔کلمات طیبہ

۲۵۔تحریک وتبلیغ کی کامیابی

۲۶۔مسئلہ قربانی پر ایک نظر

۲۷۔عالم برزخ

۲۸۔مسلم پرسنل لاء کے شرعی اصول

۲۹۔اردو زبان کی شرعی حیثیت

۳۰۔دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اصول ومسلک

۳۱۔آزادئ ہند کا خاموش رہنما دارالعلوم دیوبند

۳۲۔فہم قرآن اور تعلیم مذہب کے دو بنیادی اصول

۳۳۔دینی دعوت کے قرآنی اصول

۳۴۔غلاف کعبہ اور غلاف قرآن

۳۵۔سمت قبلہ معلوم کرنے کا اسلامی طریقہ

۳۶۔بانیٔ دارالعلوم دیوبند

۳۷۔اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

۳۸۔علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج

۳۹۔حضرت نانوتوی کی آب حیات

۴۰۔عالمی مذہب

۴۱۔اسلام اور عالمی امن واخوت

۴۲۔اسلام کا اخلاقی نظام

۴۳۔اسلام اور سائنس

۴۴۔ داڑھی کی شرعی حیثیت

۴۵۔ عالم انسانیت کا مکمل قانون اسلام

۴۶۔ اسلام کے دو امتیازی پہلو

۴۷۔ جامعیت اور اجتماعیت

۴۸۔ اسلام اور فرقہ واریت

۴۹۔ اسلام میں حج کی اہمیت

۵۰۔ نکاح کی حقیقت

۵۱۔ اسلامی تہذیب وتمدن (التشبہ فی الاسلام)

۵۲۔ اسلام اور مغربی تہذیب

۵۳۔ فلسفۂ نماز

۵۴۔ نکاح وطلاق عقل وشرع کی روشنی میں

۵۵۔ انسانیت کا امتیاز

۵۶۔ فلسفۂ نعمت ومصیبت مکمل

۵۷۔ فطری حکومت

۵۸۔ حفظان زندگی اور عجائباتِ برزخ

۵۹۔ آفتاب نبوت اول ودوم

۶۰۔ شان رسالت

۶۱۔ سیرت قربانی

۶۲۔ سیرت رحمۃ للعالمین

۶۳۔ خاتم النبیین

۶۴۔ پیغام حیات

۶۵۔ فضائل یوم جمعہ

۶۶۔تحفۂ مومن

۶۷خطبۂ صدارت جمعیۃ العلماء مرادآباد

۶۸۔خطبہ صدارت مسلم پرسنل لاء (اجلاس اول)

۶۹۔مسلمان اور شرک

۷۰۔یادِ حق

۷۱۔وداع النبی ﷺ

۷۲۔خطبۂ استقبالیہ صد سالہ اجلاس دارالعلوم

۷۳۔وعظ یوسفی

۷۴۔مقام نبوت اور اس کے آثار و مقاصد

۷۵۔حکمت قاسمیہ

۷۶۔بقائے باہم کا سیکولرزم

۷۷۔عیدالفطر اور اجتماعیتِ کبری

۷۸۔آستانۂ خداوندی اور کاشانۂ نبوی میں چند دن

۷۹۔رسالۃ الماجد

۸۰۔نماز اور حج

۸۱۔تعمیر ملت اور تنظیم امت

۸۲۔مراقبہ ذات بحث

۸۳۔جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم اور اتحاد کا ایک پیغام

۸۴۔علمی سوالات

۸۵۔یاد ایام

۸۶۔تاسیس دارالعلوم دیوبند

۸۷۔پچاس مثال شخصیات

۸۸۔مشاہیر امت

۸۹۔یاد خلیل

۹۰۔حیات انور

۹۱۔مولانا سید حسین احمد مدنی

۹۲۔مضمون علامہ شبیر عثمانی

۹۳۔آہ! احمد غریب

۹۴۔مختصر تاریخ دارلعلوم دیو بند

۹۵۔دارالعلوم دیو بند ایک نظر میں

۹۶۔روایات الطیب

۹۷۔علماء ہند کی شاندار تاریخ کا ایک ورق

۹۸۔علامہ کی یاد (علامہ بلیاوی)

۹۹۔ایک جامع شخصیت (مولانا مدنی)

۱۰۰۔مضمون مفتی شفیع صاحب

۱۰۱۔مفتی عزیز الرحمان عثمانی

۱۰۲ ملک معظم شاہ فیصل مرحوم

۱۰۳۔سفر نامہ برما

۱۰۴۔سفر نامہ مقامات مقدسہ

۱۰۵۔مکتوب حجاز

۱۰۶۔دیار مقدس سے واپسی پر

۱۰۷۔سیر کشمیر

۱۰۸۔سفر نامہ افغانستان

۱۰۹۔سفر حج کے یادگار تاثرات

۱۱۰

۱۱۲۔سفرنامہ یورپ

۱۱۳۔عرفان عارف

۱۱۴۔جنوب شباب

۱۱۵۔جذباب الم

۱۱۶۔نعت نبی اکرم

۱۱۷۔آنکھ کی کہانی

۱۱۸۔ارمغان اجلاس صد سالہ

۱۱۹۔دعائے نامہ تہنیت شمامہ

۱۲۰۔مقدمہ فتاوی دارالعلوم دیوبند

۱۲۱۔مقدمہ سوانح قاسمی

۱۲۲۔مقدمۂ انوار قاسمی

۱۲۳۔مقدمہ الجمیعہ شیخ الاسلام نمبر

۱۲۴۔مقدمہ اخلاق وآداب

۱۲۵۔مقدمہ چہل حدیث

۱۲۶۔مقدمہ نقش دوام

۱۲۷۔مقدمہ انوارالباری

۱۲۸۔مقدمہ ادب المفرد

۱۲۹۔مقدمہ سیرت مبارکہ

۱۳۰۔مقدمہ مکتوبات شیخ الاسلام

۱۳۱۔مقدمہ تفسیر کشف الرحمٰن

۱۳۲۔موضح القرآن

۱۳۳۔مقدمہ حیات الصحابہ

۱۳۴۔مقدمہ العجالۃ النافعہ

۱۳۵۔مقدمہ فیض الباری

۱۳۶۔مقدمہ زجاجۃ المصابیح

۱۳۷۔مقدمہ اخلاق وآداب

۱۳۸۔مجالس حکیم الاسلام

قاری صاحب بحیثیت خطیب :-

حضرت قاری صاحب نے اہتمام اور درس و تدریس کے علاوہ تبلیغی و اصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں، جو نا قابل فراموش ہیں، آپ کو فن خطابت اور تقریر میں ید طولیٰ اور خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی اور زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں عوامی جلسوں میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں۔اہم سے اہم مسائل پر دو تین گھنٹے مسلسل اور بے تکلف تقریر کرنے اور ٹھوس علمی مواد پیش کرنے میں آپ کو کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔حقائق و اسرار شریعت کھولنا اور تخلیق و ایجاد مضامین آپ کا خاص حصہ تھا۔جسے آپ کے اکابر و اساتذہ بھی مسلمہ تسلیم کرتے تھے۔تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص تسلی حاصل کرتا تھا، ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو۔ان کی رواں دواں اور دلکش تقریر جب علم کے گہرے سمندر سے گزرتی تھی تو لہروں کا سکوت قابل دید ہوتا تھا۔حضرت قاری صاحب اپنے ذوق تقریر کے بارے میں خود ہی رقمطراز ہیں۔

> ''اور تحریر وتقریر میں مجھے دلچسپی لڑکپن سے تھی اسے
> بڑھانے اور ترقی دینے نیز اس لائن پر سفر کرنے
> میں میرے اکابر پیش پیش رہتے تھے''۔

حضرت قاری صاحب کے ساتھ ان کے اساتذہ کا کیا معاملہ تھا، اس سلسلہ میں قاری صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ملتان کے سفر کے دوران حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نے ایک جلسہ میں تقریر کرائی اور میرا حال یہ تھا کہ کپڑے بھیگ چکے تھے اور میں نے ستر پوشی کے لئے ایک بڑا

کمبل اپنے بدن پر لپیٹ رکھا تھا' نہ سر پر ٹوپی تھی اور نہ پیر میں جوتا' حضرت علامہ نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ:

''یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں مستقبل کے ایک بہت بڑے مقرر ہیں۔ ہرگز یہ خیال نہ کیجئے کہ فقیروں کی طرح کمبل پوش ہیں تو ان کے پاس کچھ نہیں بلکہ یہ سمجھئے کہ اس گدڑی میں لعل بھی مخفی ہے۔

(ماہنامہ دارالعلوم' بحوالہ مظلوم شخصیت ۲۵۲/۔)

اس طرح ابتداء ہوئی حضرت قاری صاحب تقریر کی۔ اس کے بعد آپ نے پوری زندگی اس میدان کے نوک و پلک سنوارنے میں گزار دیئے اور دنیا کے تینوں براعظم آپ کی تقریروں سے مستفید ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تعلیمی مسائل پر جو کانفرنس بلائی تھی' قاری صاحب کی تقریر کے بعد مولانا آزاد نے تحسین فرمائی۔ عالم اسلام کے مشہور محقق اور ماہنامہ بینات کے مدیر مولانا یوسف صاحب بنوری لکھتے ہیں کہ:

''اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے۔ زبان ایسی شستہ اور صاف اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا کتاب سامنے رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں' حقائق و واقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے۔ شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معروفت وہبیہ کا طوفان اُمڈ آیا ہے''

(ماہنامہ بینات کراچی۔ بحوالہ مظلوم شخصیت ۲۵۶/۲۔)

علیگڑھ یونیورسٹی جو ہندوستان میں علم جدید کا مرکز اور منبع ہے اور دارالعلوم دیوبند سے ان کو نظریاتی تقابل بھی رہا۔ اس میں آپ نے بعض انتہائی بلند اور وقیع عنوانات پر تقاریر کیں۔ آپ کے بیان اور اسلوب بیان سے بڑے بڑے پروفیسر انگشت بدنداں رہ گئے اور ان میں احساس اجاگر ہوا کہ حقیقی علم کیا ہے اور جسے ہم نے علم کا نام دے رکھا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ علی گڑھ یونیورسٹی میں کی گئی چند تقاریر طباعت سے بھی آراستہ ہوئی ہیں۔ آپ کی تقاریر کی تعداد ہزاروں میں ہے لیکن کچھ قلم بند تقاریر بازار میں دستیاب ہیں جو صرف دس ضخیم جلدوں میں ہیں۔

قاری صاحب کی نثری تصانیف کا جائزہ:۔

ہم نے قاری صاحب کی تصانیف کی فہرست پیش کی ہے جن کی تعداد ۱۳۸ ہوتی ہے ان میں شعری مجموعات بھی ہیں۔ ان کا جائزہ تو ان شاءاللہ پانچویں باب ''شعروادب'' میں پیش کریں گے۔ یہاں صرف نثری تصانیف کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام تصانیف کا جائزہ پیش نہیں کیا جاسکتا اسلئے ہم چند اہم کتابوں کے جائزہ پر اکتفاء کرتے ہیں ہماری کوشش یہ رہے گی کہ مختصراً اس کتاب کے پس منظر کو بھی بیان کریں۔

اجتہاد اور تقلید:۔

ہندوستان میں تقلید اور عدم تقلید کی بحث ایک صدی سے چلی آرہی ہے۔ اور اس موضوع پر تقریباً سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ہمارے علم کے مطابق ہندوستان کے تمام ہی بڑے علماء نے اس موضوع پر اپنی رائیں پیش کی ہیں۔

قاری محمد طیب صاحب نے ''جمعیۃ الاحناف'' مئوائمہ' الہ آباد کے اجلاس عام منعقدہ ۱۵۔تا ۱۷ شوال ۱۳۶۲ھ کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبہ پیش فرمایا۔ جو بعد میں ''خطبۂ صدارت جمعیۃ الاحناف'' کے نام سے شائع ہوا۔ اسی خطبہ صدارت پر نظر ثانی فرما کر بعد میں اسے ''اجتہاد اور تقلید'' کا نام دیا گیا۔

قاری صاحب نے اپنی اس کتاب میں فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور دکھتی ہوئی رگ پر بڑے

ماہرانہ انداز میں نشتر لگائے ہیں جس کو تقلید شخصی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے آپ نے محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اجتہاد مشروع ہے، اجتہادیات پر عمل بھی مشروع ہے۔ ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کرانا بھی مشروع ۔ اور اس مجموعہ کا نام رکھنا بھی شرعی بات ہے۔ اس کے بعد آپ نے بتایا ہے کہ اجتہادیات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید کرنا بھی ناگریز اور ضروری ہو جاتا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اجتہادی مسئلوں میں دورائیوں یا اس سے زیادہ کا ہونا فطری اور قدرتی بات ہے اور دائرہ شرع میں داخل ہے تو ایسے اختلافی مسائل میں تقلید شخصی بھی ضروری ہے۔

قاری صاحب نے اس موضوع پر اپنے نکتہ آفریں دماغ سے کام لے کر راویت و درایت کی روشنی میں اتنی لطیف بحث کی ہے کہ عقل اس سے حاصل شدہ نتائج کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے ۔ اب تک اس مسئلہ پر اردو میں بہت کم ایسی کتابیں وجود میں آئی ہے جو اپنی متکلمانہ انداز بیان میں روایات و آیات قرآنی سے ایسے لطیف نقطہ پیدا کرتی ہے۔

پیش خدمت ہے اس اہم کتاب کا اقتباس :-

'' اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان
حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعہ لوگوں کے
دین کی حفاظت کی ورنہ ایک طرف سے ملک کا
جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر و
خیال پر اس درجہ قید و بند عائد کر چکا تھا کہ آبائی
رسوم کو اسلام اور انہی کی کورانہ تقلید کو پیروی
اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں گرفتار تھا'
جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و
محدثات رچ گئی تھیں۔
اور دوسری طرف ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور
اس سے پیدا شدہ آزاد خیالی کے سبب فکر و خیال کی

وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہد مطلق ہونے
کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی
عقلیں دماغوں پر اس درجہ مسلط ہوچکی تھیں کہ
مذہبی نقل و روایت کے رد وقبول کا معیار ہی یہ
عقلیں رہ گئیں تھیں۔''

(اجتہاد اور تقلید۔ص :۳۵)

قاری صاحب نے اپنے اس اقتباس میں سلجھی اور منجھی ہوئی زبان استعمال کی ہے۔اس تحریر کا لفظ بلفظ عام فہم ہے بعض الفاظ کو دقیق کہا جاسکتا ہے لیکن ان کے بغیر مفہوم کی ادائیگی ناممکن ہے۔

علم غیب :۔

ہندوستان میں ایک طبقہ ہے جو آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کا قائل ہے۔اس مسئلہ پر چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔قاری صاحب نے بھی اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے ''علم غیب'' لکھی۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ علم غیب جو کسی کا دیا ہوا نہ ہو بلکہ خود بخود ہو وہ صرف اللہ کی صفت ہے۔مخلوق میں اگر کسی کو غیب کی بات کا علم ہو تو وہ اللہ کا دیا ہوا ہے،خود بخود حاصل ہوا نہیں ہے۔

قاری صاحب نے اپنے دعوی کو متعدد آیتوں سے مدلل ومبرھن کیا ہے، الفاظ قرآنی سے ایسے حکیمانہ نکتے اور الفاظ کی معنوی وسعت کو ظاہر کرتے ہوئے اس کے حقیقی مقصود کو اس طرح واضح کیا ہے کہ دل استنباط واستدلال سے قطعی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے۔آیات کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے آیت کے ایک ایک لفظ اور آیات کے انداز بیان سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی اور اس کے متعلق ہر ہر شبہ کا حل اور ذہنی خلجان کو دور کر دیا ہے اور تمام شرک آمیز تصورات کا قلع قمع کر دیا ہے۔

اس کتاب کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

'' رسول پاک کے لئے اس قسم کے علم کا دعوی

رکھنے والے اپنے دعوے میں مخلص ہوں اور بزعم
خود محبت رسول میں گرفتار ہوکر خوش
اعتقادیوں سے ہی وہ یہ دعویٰ کرتے ہوں سوان کی
نیت اور جذبہ پر حملہ مقصود نہیں، مگر یہ گزارش ضرور
ہے کہ یہ دعویٰ خواہ کتنا ہی جوش عقیدت و عظمت
اور ولولۂ شوق و محبت سے کیا گیا ہو مگر ہم مسلمان
صرف عقائد و احکام ہی میں آسمانی ہدایات کے
پابند نہیں بنائے گئے بلکہ عشق و محبت کے جذبات
اور اظہار عقیدت و محبت میں بھی شرعی حدود و قیود
کے پابند کئے گئے ہیں۔

کیونکہ ہم سے عقلی محبت مطلوب ہے جس کا نام
ایمانی ہے، طبعی محبت مطلوب نہیں جو غیر اختیاری
اور بے شعور محبت ہے، اول کا تعلق عقل و شعور سے
ہے اور ثانی کا جذبات سے، بحالتِ صحت شعور و
آداب سے بے نیاز اور بالاتر ہونے لگیں اور اپنے
کو عارف باللہ اور علی بصیرۃٍ بنانے کی جگہ بے شعور
اور جذباتی ثابت کرنے لگیں۔ یا بہ تکلف جذبات
عشق کی آڑ لے کر تمام شرعی حدود و قیود اور تہذیب
نفس کی تمام دینی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں''۔

(علم غیب: ۱۵)

قاری صاحب نے اپنی اس پوری تصنیف میں منفرد اسلوب کو کافی حد تک باقی رکھا ہے' زبان علمی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ لئے ہوئے ہے۔ بقول امام مرتضیٰ نقوی' انشاء پرداز کو چاہیئے کہ

وہ اپنی نظر میں ایسے جملے استعمال نہ کرے جس میں تعقید ہو۔ جملے کے اس ٹکڑے پر زیادہ زور ڈالنا چاہیئے جو جملہ کا جزو اعظم ہو تا کہ پڑھنے والے کو سمجھنے کیلئے ذہنی مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ قاری صاحب کے اسلوب کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ ان کے جملوں میں تعقید نہیں ہوتی اور ان کے مختصر جملے فوراً قاری کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ان کو پڑھنے کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔

اسلام کا اخلاقی نظام :-

ایک پادری نے رڑکی شہر سے قاری صاحب کو خط لکھا جس میں اس نے اسلام پر کچھ اعتراضات کئے، اور اسلام کے اخلاقی نظام کو اپنا نشانہ بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام سے عیسائیت کا نظام اخلاق کہیں بہتر اور برتر ہے، اس خط میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور اکرم ﷺ کے نکاح پر تھا۔

اس خط کے جواب میں آپ نے یہ کتاب لکھی۔ قاری صاحب نے اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے موجودہ بائبل کو نا قابل اعتبار قرار دیتے ہوئے، انہیں نا قابل شکست دلائل سے اسکو محرف ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد اخلاق اسلام پر متعدد آیات سے مثالیں پیش کی ہیں اور ان سے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کئے ہیں جہاں تک عام اہل علم کی نگاہ نہیں جاتی۔

اس کتاب سے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس طرح ہزار ہا صوفیاء ہندوستان میں نظر پڑیں گے جنہوں نے اخلاقی خانقاہوں اور تربیت گاہوں کا نظام قائم کر کے ہندوستان کے طول و عرض میں اسلامی اخلاق پھیلائے اور لوگوں کو ان اخلاق سے دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ پھر ان بزرگوں کی جدوجہد اور سعی کا دائرہ اخلاق کے صرف عملی پہلو تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ امت کے ان حکماء نے اخلاقی تربیت کے ساتھ علمی طور پر ان اخلاق کی

حقائق بھی کھولیں، ان کا تجزیہ کر کے ان کے معنوی
درجات و مراتب بھی واضح کئے۔ ان کے اسباب و
آثار پر بھی روشنی ڈالی اور انہیں حاصل کرنے کے
نہایت جامع اور سہل طریقے بھی بتلائے۔ ان
لوگوں کو ٹرینڈ بھی کیا جس سے اخلاق نے اسلام
میں ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرلی جس کا
نام تصوف ہوا اور اس کے تحت اخلاقیوں کی ایک
عظیم جماعت نمایاں ہوئی جس کا نام صوفیاء ہوا۔

(اسلام کا اخلاقی نظام۔ ص:۴۲)

یہ پورا اقتباس ادبی پیرایہ اور اسلوب کی اعلیٰ مثال ہے، اس اقتباس کی سطر سطر جدید اسلوب کی مثال بننے کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک علمی بحث کو جو اخلاق یعنی فن تصوف سے متعلق ہے۔ آپ نے خوش اسلوبی سے تاریخی رنگ دے دیا۔ قاری ہر سطر پر یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کوئی خالص علمی تحریر نہیں ہے بلکہ تاریخی زاویہ سے گفتگو کی گئی ہے، اس کو صرف اور صرف ''صاحب طرز ادیب'' کا رنگ اور انداز ہی کہا جاسکتا ہے۔

تعلیمات اسلامی اور مسیحی اقدام:-

اس کتاب میں عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات کا اسلام کی تعلیمات سے موازنہ کر کے اسلام کی حقانیت اور اسکی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں:-

اس کتاب میں بنی اسرائیل کی تاریخ اور انسانیت کے خلاف انکی سازشوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ قوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہی سے اسلام کے خلاف

سازشوں میں مصروف رہی ہے۔ جس کی وجہ ان کا بغض وعناد اور کینہ ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کس طرح قاری صاحب تصنیف کے میدان میں امت مسلمہ کے کارناموں کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''قلم کو دیکھو تو کثرتِ تصانیف (بقول زرقانی صاحب مواہب) اس امت کی خصوصیت ہے۔ کتب خانے آباد ہی ان کی تصانیف سے ہیں' کسی علم اور فن کو نہ چھوڑا کہ اس میں بے شمار ذخیرے جمع نہ کیے ہوں۔ خلافت عباسیہ کے دور میں عراق کے عظیم الشان کتب خانے خلافت اندلس میں اسپین کے کتنے ہی مکتبے' حجاز اور روم کی لائبریریاں' مصر کے بے شمار ذخیرے' ہندوستان کے ہزارہا کتب خانے اور دوسرے محروسہ ہائے اسلامیہ کے سینکڑوں علمی خزانے باوجودیکہ تباہ بھی ہوئے دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھے' جلائے بھی گئے' کروڑہا کتابیں' کیڑوں کی نذر بھی ہوئیں' عیسائی حکومتوں نے اپنی پوری طاقتوں سے پچاس پچاس برس کی مدت ان کے مٹانے اور نذر آتش کرانے میں صرف بھی کی (جیسا کہ اندلس میں ہوا) فتنۂ تاتار میں بغداد کا علمی ذخیرہ دجلہ میں ہی بہایا گیا جس سے کئی دن اس کا پانی رکا رہا اور جب چلا تو گاڑھی روشنائی بن گیا اور مہینوں دواتوں میں

استعمال کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اس پر بھی
جو ذخیرے آج موجود ہیں اور اب بھی علمائے
اسلام کی جانکاہیوں سے جو ہزارہا تصانیف
منصۂ شہود پر آتی جارہی ہیں وہ اس مقدار میں
ہیں کہ یورپ اور ایشیاء کے مطابع چھاپتے
چھاپتے تھک گئے۔ مصر کی سلطنت طبع کرتی کرتی
تنگ آگئی ہے مگر ابھی مصنفات کا عشرِ عشیر بھی
پریس کے میدان میں نہیں پہنچ سکا ہے۔''

(تعلیمات اسلامی اور مسیحی اقدام۔ص:۳۵)

قاری صاحب نے مذکورہ اقتباس میں مسلمانوں کے علمی ذخیرہ کے تذکرہ کے بعد تاریخ کے دلخراش حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان حالات کو یاد کیا جائے تو حساس دل انسان کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

قاری صاحب نے کتاب کی ابتداء اس طرح کی ہے:

''یہود کی موجود نام نہاد حکومت سے (جو مقام
اسرائیل ۱۹۴۶ میں عربوں کے جگر فلسطین میں قائم
کی گئی ہے) بعض حضرات کو یہ خلجان دامن گیر
ہے کہ وہ قرآن حکیم کی تصریحات کے خلاف ہے
اس لئے انہیں بمقتضائے ایمان یہ تشویش ہے کہ
آخر خدائی دعوؤں کے خلاف یہ کیسے ہوگیا اور
اسرائیل کس طرح قائم ہوگیا؟''

(اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں۔ص:۱)

حکومت اسرائیل کا قیام:۔

اس ابتدائیہ ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تحریر میں سب سے زیادہ نظر اس مسئلہ پر ہے کہ قرآن میں ان کی ذلت کے اعلان کے باوجود ان کی حکومت کا قیام کیسے ہوا؟ یہود کا مغضوب وملعون ہونا دو ہزار سال کا مشاہدہ ہے اور تاریخ ہر زمانہ میں ان کی ملعونیت ومغضوبیت پر مہر تصدیق ثبت کرتی رہی ہے اور یہود کے لئے لعنت وذلت کا اعلان قرآن کے علاوہ ان کی اپنی مقدس کتاب ''مہر سیاہ نبی کی کتاب'' میں بھی ہے۔

قاری صاحب نے ان کے اقتدار کی حقیقت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھایا ہے۔

ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''ایک عرصہ سے دنیا میں خلائی فتوحات کا غلغلہ ہے
اور حالیہ تجربات نے یہ چیز ثابت کردی ہے کہ
حضرت انسان واقعی بڑی چیز ہے لیکن مذہب و
سائنس کے دائرہ کار اور حدود سے لاعلمی، طغیانی علوم
میں ناپختگی اور مذہب سے دوری یا کم علمی کی وجہ سے
بہت سے مسلمان احساس کمتری، مرعوبیت اور شکوک
وشبہات کا شکار ہو چکے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی کہ
اصولی طور پر یہ عرض کیا جائے کہ سائنس اور مذہب
کی کیا حقیقت ہے، ان کا آپس میں کیا تعلق ہے''

(حقیقت مذہب وسائنس۔ص:۱)

قاری صاحب نے اپنی اس تقریر میں عام مسلمانوں کی احساس کمتری اور مرعوبیت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ نے معتبر احادیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ سائنس اور مذہب میں ضد نہیں ہے بلکہ آج جن چیزوں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے واضح کر دیا تھا۔

اصول دعوت اسلام :-

اس کتاب کا اصل نام ''دینی دعوت کے قرآنی اصول'' ہے اس کتاب میں سورہ نحل کی آیت ''ادعو االی سبیل ربك'' سے دس اصول دعوت اخذ کر کے ایک ایک اُصولِ قرآنی پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا اصل تعلق ان لوگوں سے ہے جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا۔ہم اس کتاب کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے قاری صاحب کی دین پر گہری نگاہ اور حالات پر انکی نظر کا اندازہ ہوتا ہے:۔

> ''تبلیغ اسلام کے معنی پشتینی (نسبی) مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچادینے اورانہیں وابستہ کرنے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضۂ تبلیغ اداہوگیایا ارباب تبلیغ فرائض دعوت سے سبکدوش ہو گئے ۔مجھے اس انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت اور افادیت سے اگر چہ انکار نہیں لیکن فریضہ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصول تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا ۔یہ جزوی تبلیغ تذکیرواصلاح وغیرہ کے عنوانات سے یاد کی جاسکتی ہے مگر عرف شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عرف شریعت میں تبلیغ در حقیقت اسلام پہنچانے اوراسلامی برادری کو وسیع کرنے کو کہا گیا ہے اسلئے تبلیغ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے اسلام کا پیغام پہنچانے کا نام ہے''۔

(دینی دعوت کے قرآنی اصول رص:۹)

سائنس اور اسلام:-

یہ کتاب اصل میں وہ معرکۃ الآراء تقریر ہے جو حضرت قاری صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہاں اساتذہ اور طلبہ کے سامنے کی تھی، اس میں بتایا گیا ہے اور بڑی بصیرت کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ سائنس کا اسلام کے ساتھ کوئی ٹکراؤ نہیں۔ بلکہ سائنس اسلام کی حقانیت کو اور زیادہ علمی رنگ میں نکھار دیتی ہے۔

التشبہ فی الاسلام:-

اس کتاب کا دوسرا نام ''اسلامی تہذیب وتمدن'' بھی ہے۔ اس کتاب میں پہلے اسلامی خدوخال واضح کئے گئے ہیں اور پھر بڑے محققانہ انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام دنیا کی دوسری تہذیبوں اور قوموں کے ساتھ مشابہت سے کیوں منع کرتا ہے۔

اسلام نے بوڑھوں کو کالے خضاب کے علاوہ چند مواقع سے' منع کیا ہے۔ اس ممانعت کی وجہ قاری صاحب نے نوجوان کے ساتھ تشبہ کو بتایا ہے:

> ''یہی وجہ ہے کہ ایک صنف رجال ہی میں باہم بوڑھوں کا جوانوں سے تشبہ کرنا مثلاً اپنے شیب (سفید بالوں کا اکھاڑنا) جوانوں کے سے شوخ لباس پہننا' ان کی سی شوخی و آزادی برتنا' ان کی طرح لہو ولعب میں وقت گزارنا شرعاً ناپسندیدہ قرار پایا کیونکہ یہ حد مشیخت (بڑھاپا) کو (جس سے خاص اغراض متعلق نہیں) توڑ کر حد شباب میں قدم رکھنا ہے اور گویا خیر سے شر کی طرف آنا ہے۔ ہاں اگر جوان بوڑھوں سے تشبہ کریں تو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھنا ہے' پس

یہ تشبہ ایسا ہوگا جیسے ایک فاسق کسی صالح کے
ساتھ تشبہ کر کے حد فسق کو توڑ ڈالے' یا کوئی کافر
مسلم سے تشبہ بالخیر مطلوب ہے''۔

(التشبہ فی الاسلام۔ص:۲۵)

اسلامی تمدن جس کی بنیاد سادگی' زہد وقناعت' تدین وخدا پرستی اور سنن نبوت پر قائم تھی جبکہ ہماری سیاہ کاریوں کی بدولت شوکت وقوت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو شوکت پرست طبیعتوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا اور ٹھیک اس کے مقابل وہ انگریزی تمدن جس کا منشاء کوئی طریق نبوت اور خلق ربانی نہیں بلکہ اس کی بنیاد تلذذ و تعیش اور نفس پروری وتن آسانی پر قائم کی گئی ہے۔ ہماری زندگی کا حصہ بن گئی۔

مذکورہ تحریر میں قاری صاحب نے دوسری قوموں کے ساتھ تشبہات کو بیان کر کے ان کے منفی اثرات کو واضح کیا ہے۔ اور اسی طرح اصناف میں تشبہات کی قباحت کو مدلل کیا ہے۔

نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر:-

۱۹۴۲ء میں پروفیسر غلام جیلانی صاحب برق نے ایک کتاب ''دو قرآن'' لکھی تھی۔اس کی کچھ تفصیل ''تنقیدی ادب'' کے تحت دے چکے ہیں۔ قاری صاحب نے اس کا علمی اعلیٰ جواب دیا اور بتایا کہ قرآن دو نہیں، ایک ہی ہے اور یہ اپنے زمانۂ نزول سے لیکر آج تک جوں کا توں ہے۔

اس پر مکمل بحث مع اقتباسات پہلے گزر چکا ہے۔

روداد سفر افغانستان:-

ہندوستان اور افغانستان کا تعلق تاریخی حیثیت رکھتا ہے ۔دارالعلوم دیوبند میں شروع ہی سے افغانستانی طلبہ زیر تعلیم رہے۔ چنانچہ ۱۲۸۳ھ جو دارالعلوم کا پہلا سال ہے اس میں بھی ہندوستان کے طلبہ کے دوش بدوش افغانستانی طلباء بھی نظر آتے ہیں۔اس تعلق کی وجہ سے دارالعلوم ہمیشہ افغانستان کے ساتھ ہمدردانہ وابستگی کا اظہار کرتا رہا ہے۔

جب محمد ظاہر شاہ تخت نشیں ہوا تو مجلس عاملہ نے طے کیا کہ حضرت قاری صاحب ان کو

مبارک باد دینے کے لئے افغانستان کا سفر کریں۔ چنانچہ آپ نے ۱۳۵۸ھ میں یہ سفر کیا حامد الانصاری غازی رفیقِ سفر تھے۔ کابل پہنچنے پر وزیر خارجہ سردار علی محمد خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حضرت قاری صاحب نے فارسی تقریر میں دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد صدر اعظم سردار محمد ہاشم خاں صاحب سے ملاقات ہوئی اور امیر افغانستان سے ملاقات ہوئی۔ قاری صاحب نے فارسی تقریر کے بعد چند سطور بنام ہدیہ اخلاق با جازت پڑھ کر سنائیں تو شاہ افغانستان نے اس کو کھڑے ہو کر سنا۔

اس سفر کے نتائج میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ اسلامی مرکزوں میں تعلیمی ربط و تعلق کا قیام ہے۔ اگر اس سے دانشمندانہ طریق پر کام لیا جائے علمی ترقی کے سلسلہ میں عالم اسلام کیلئے مستقبل میں اہم مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ کابل سے واپسی پر صدر اعظم نے وداعی ملاقات کرتے ہوئے اپنی حکومت کی جانب سے دارالعلوم کیلئے پچاس ہزار روپے افغانی کے عطیے سے مطلع فرمایا۔ صدر اعظم کے خاص الفاظ یہ تھے:۔

> ''آپ الحمدللہ مستغنی ہیں اور دارالعلوم کا مدار توکل پر ہے اسے خدا کے واسطے کسی کی حاجت نہیں لیکن بہرحال حکومت کا فریضہ تھا کہ وہ کم ازکم دارالعلوم کے معاملہ میں اپنے فرائض کو پہچانے، اعلیٰ حضرت نے جو کچھ کمک (تعاون) دارالعلوم کے لئے منظور فرمائی ہے وہ دارالعلوم کی شان سے کم ہے، مگر دنیا کے موجودہ حالات میں افغانستان کی ذمہ داریاں جو اہمیت رکھتی ہیں ان کا آپ کو بھی علم ہے''۔

(تاریخ دارالعلوم ۱/۲۹۹)

اس شاہانہ عطیہ کے وصول ہونے پر دارالعلوم نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔

قاری صاحب کی نثری تصانیف میں ممتاز تصنیف:-

قاری صاحب کی ہر کتاب اپنے مواد' اپنی معلومات' اپنے دلائل و براہین' استنباط مسائل و استخراج نتائج' حکیمانہ نکتہ آفرینیوں' پرشوکت اور مرعوب کن کلامی مباحث کے لحاظ سے اپنا ایک خاص امتیاز اور مقام رکھتی ہے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ دائرہ معلومات میں بہت سی ایسی باتیں ضرور آگئیں ہیں جن پر اب تک ان کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں' ہر کتاب قاری صاحب کی مخصوص طرز وتحریر کے ساتھ عالمانہ' محققانہ مباحث' زبان و بیان کی رعنائیوں اور دل آویزیوں سے آراستہ وپیراستہ ہے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود جو مقام ومرتبہ آپ کی تصنیف '' علمائے دیوبند کا دینی رخ اور ان کا مسلکی مزاج'' کو حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

مسلک دیوبند کیا ہے؟:-

اس تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء کے مسلک اور دینی رخ کے بارے میں وقتاً فوقتاً استفسارات' موصول ہوتے تھے اور قاری صاحب ان کے جوابات بھی دیتے تھے جن میں اجمالاً مسلک کی نشاندہی کر دیتے تھے۔ سوالات بھی اجمالی ہوتے تھے اور جوابات بھی اجمالی لیکن اس سلسلہ میں ایک مفصل استفساری تحریر موصول ہوئی جس میں علمائے دیوبند کے مسلک اور دینی ذوق کو انضباط کے ساتھ تفصیلی طور پر لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی اور سوالات میں مختلف تحقیق طلب پہلو سامنے رکھے گئے تھے۔ سوالات کے ضروری اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

'' میں ایک سیدھا سادھا مسلمان ہوں' نیک نیتی
کے ساتھ صحیح اسلام پر جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔
دینیات کا کوئی خاص علم نہیں رکھتا' نماز' روزہ' کی
حد تک کچھ مسائل ضرور معلوم ہیں۔
آگے لکھتا ہے: علمائے دیوبند کیا ہیں؟ اور کیا کہنا

چاہتے ہیں؟ آیا یہ کوئی نیا فرقہ ہے جسے وقت نے
پیدا کردیا ہے؟ یا وہ کوئی پرانہ فرقہ ہے جس کی
اصل کچھ اوپر سے ملتی ہے اور ہے تو کونسا ہے؟ آیا
وہ اہل سنت والجماعت ہیں یا کچھ اور ہیں؟ اور اگر
اہل سنت والجماعت ہی ہیں تو سنی حنفی ہونے کے
دوسرے دعویداروں کے ہجوم میں ان کی کیا پوزیشن
ہے؟ اور ان میں اور دوسرے مدعیوں میں کیا فرق
ہے؟ اور پھر ان کے اعتقادات کی نوعیت کا وہ کونسا
امتیازی نقطہ ہے جو ان میں اور ان سے اختلاف
رکھنے والوں میں حدِ فاصل ہے"

(مسلک علمائے دیوبند۔ص:۲)

بہر حال اس درد بھری تحریر کے بعد قاری صاحب نے قلم اٹھایا اور مسلک کی مکمل مدلل وضاحت اور اپنے اکابر اور اسلاف کے مزاج کو خوب خوب بیان کیا۔

کتاب کی خوبیاں:۔

قاری صاحب کی اس کتاب میں قوت استدلال، زور بیان اور منطقی انداز کے ساتھ سادگی اور پرکاری ہے، ان کا اسلوب سادہ اور زبان سہل ہے۔ موضوع کی نزاکتوں پر ان کی گرفت مکمل اور شائستگی و شستگی پر عبور ہے، گنجلک اور الجھی ہوئی عبارتوں اور جملوں کا ان کے یہاں گزر نہیں وہ بڑے سہل انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور ان سب خوبیوں کے ساتھ اپنے موضوع کو سمیٹ لینے اور موضوع کے اطراف و جوانب پر ان کی نگاہ ہے۔

اچھی تحریر وہی کہلاتی ہے جو اپنے قاری کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرے اور ایسی کیفیت سے دوچار کرے کہ جس وقت وہ تحریر پڑھی جارہی ہو پھر کسی دوسری تحریر کا خیال بھی ذہن میں نہ آئے۔ قاری صاحب کی اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ موضوع کے خشک سے خشک ہونے کے

باوجود ان کے قلم کی روانی اور بہاؤ میں کمی نہیں آئی' وہ یکساں رفتار سے ہر ہر سطر پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ پڑھنے والا چند لمحوں کے لئے بھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

اردو محاورات اور ضرب الامثال کے استعمال سے بھی تحریروں میں آب بڑھتی ہے اور روزمرہ کی گفتگو کو بھی حسب موقع لانے سے تحریر کا حسن دوبالا ہوتا ہے۔ قاری صاحب نے اپنی اس کتاب میں اس کا بھی اہتمام فرمایا۔ شاید انہی بنیادوں پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قاری صاحب کی یہ تحریر زندہ تحریر ہے اور اپنے موضوع کی ندرت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی شاہکار ہے۔ گذشتہ اوراق میں قاری حضرات اسی بے نظیر کتاب کے اقتباسات سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان اقتباسات کے یہاں دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

قاری صاحب کی تصانیف اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ:۔

اردو زبان و ادب کے ساتھ المیہ کہیئے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر مذاق کہ اردو ادب صرف اور صرف ان موضوعات کا نام دیا لکھا جاتا ہے جن کا تعلق حقیقت سے دور تخیلات کی دنیا سے ہے گویا ذہنی تفریح کا دوسرا نام اردو ادب ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی پیدائش اور نشو ونما مذہبی لوگوں کے یہاں ہوئی ہے اردو کو ارتقائی منزلوں سے گزارنے میں جو حصہ علماء اور ارباب مدارس نے کیا ہے اس کی نظیر مشکل ہے۔

بعد کے حالات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا' حقیقت سے دور اردو زبان و ادب کو تخیلات اور افسانے کی زبان سمجھ لیا گیا۔ قاری صاحب مرحوم نے اس نظریہ کی تردید کی اور اپنی تصانیف کے ذریعہ یہ بتایا کہ اردو زبان پر مذہب نے بھی شفقت کا ہاتھ رکھا ہے۔ انہوں نے تخیلات اور افسانوں سے نکال کر اردو ادب کو تحقیقی زبان بنانے کی کوشش کی ہے اور آپ نے تقریباً ۱۳۸ تحریریں اپنے قلم سے دے کر اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔

قاری صاحب کی کتابوں کے ذریعہ وہ لوگ بھی اردو ادب کی حلاوتوں کو محسوس کریں گے جن کی طبیعت حقیقت پسند واقع ہوئی ہے اور وہ طبقہ تو یقیناً استفادہ کرے گا جن کا مشغلہ اردو زبان سے وابستہ ہے۔

اردو ادب کے سلسلہ میں قاری صاحب کی خدمات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے نثر کے علاوہ نظم میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ پانچویں باب میں آپ محسوس کریں گے کہ قاری صاحب نے غزل سے ہٹ کر نظم کو میدان عمل کیلئے منتخب کیا اور اتنا اضافہ کیا کہ برسوں اردو ادب ان پر فخر کرتا رہے گا۔

ہم عصر ادباء میں قاری صاحب کا مقام:-

مولانا منظور نعمانی، مولانا سعید اکبرآبادی، مولانا علی میاں ندوی جیسے ادباء حضرت قاری صاحب کے ہم عصر ہیں، لیکن قاری صاحب کو ان میں امتیاز حاصل ہے کہ قاری صاحب نے اپنی تحریروں کو صرف اور صرف علمی اور مذہبی رنگ دیا ہے۔ حالات حاضرہ اور صحافت جیسے موضوعات سے اپنے قلم کو دور رکھا ہے۔

دوسرا امتیاز یہ ہے کہ قاری صاحب اپنے ہم عصروں میں ایک اچھے انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر اور نظم گو بھی ہیں۔ یہ ایسا امتیاز ہے جس میں آپ کا کوئی ہم عصر شریک نہیں ہے۔

☆☆☆

باب پنجم

شعروادب

باب پنجم: شعروادب

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ (متوفی ۱۹۸۳ء) ایک متجر عالم تھے، مثل خطیب، متقی وپرہیز گارشخصیت اورمہتمم دارالعلوم کی حیثیت سے پورے ہندوپاک میں مقبول ومشہور تھے یہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے مختلف حلقوں میں نہایت قدرومنزلت اورعزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ایک فقیہ کی حیثیت سے حضرت کی تحریریں نازک مسائل میں ان نکات کوتلاش کرلاتی ہیں جوآپ کی ذہانت اورعلمی گہرائی پرشاہد ہیں اورآپ کی تحریریں علمی حلقوں میں اپنی بصیرت افزاء نکتہ آفرینیوں کی بناء پرایک منفرداوروقیع مقام حاصل کرچکی ہیں۔

ایک عالم کی حیثیت سے حضرت کامنصب جس عظمت سے ہمکنار ہے اس کا اندازہ ہم نشینوں اورخوشہ چینوں کوحضرت کے اس استحضاراورقوت تفہیم سے ہوچکا ہے جوعلمی مذاکروں اورمجالس میں طالبان علم کی آسودگی واطمینان کاباعث بنتا ہے۔

لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کومعلوم ہوگی کہ وہ مذہبیات کے علاوہ شعروادب سے بھی خصوصی دل چسپی رکھتے تھے اورایک بلند پایہ شاعر تھے۔

ادبی ماحول:-

ہم باب اول میں حضرت قاری صاحب کے خاندانی حالات پرتفصیل سے بحث کرچکے ہیں۔حضرت قاری صاحب کی پرورش وپرداخت خالص علمی ودینی ماحول میں ہوئی ان کے دادا حضرت مولانا قاسم نانوتوی (متوفی/۱۲۹۷ھ) دارالعلوم دیوبند کے بانی اورہندوستان کے مشہورعالم دین،فقیہ اورمردِمجاہد تھے۔

ان کے والدمحترم حافظ محمداحمدصاحب بھی مشہورعالم دین اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے زمام اہتمام کوپورے/۳۵ سال تک سنبھالا اس طرح پوراگھرانہ خالص علمی ودینی تھا، جہاں مذہبیات کے علاوہ عربی، وفارسی اوراردوشعروادب کا چرچارہتاتھا ایسے خوشگوارعلمی وادبی ماحول نے قاری محمد

طیب کے فطری ذوق شاعری پر گہرا اثر ڈالا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچپن ہی سے خوبصورت اور اچھے اشعار کہنے لگے۔

شاعری اظہار مافی الضمیر اور ترسیل وابلاغ کا موثر ذریعہ:۔

شعر کی اثر آفرینی اور کارفرمائی کا مشاہدہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے خواہ بزم نوحہ وماتم کی نوا سنجی ہو یا محفل عیش ونشاط کی زمزمہ خوانی ، یادربار سلاطین کی قصیدہ نگاری ہر موقع پر شاعری کی ساحرانہ قوتوں نے اپنا لوہا منوایا ہے، ہر کلام کی طرح شعر بھی اپنے مضامین اور مشمولات کے اعتبار سے خیر اور شر کے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اسی کو زبان رسالت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

الشعر کلام حسنہ کحسن الکلام وقبیحہ کقبیہ

یعنی شعر بھی ایک کلام ہے اچھا ہے تو اچھا اور برا ہے۔تو برا۔

(السنن الکبری۔ ۲۹۱/۲۳ حدیث نمبر ۹۴۴۸)

شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت ،حضرت علی بن ابی طالب، اور عبداللہ بن رواحہ کی پاکیزہ شاعری نے اسلامی علوم ومعارف کے اندر اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے مولانا روم کی مثنوی ،شیخ سعدی کے اخلاقی منظومات، شیخ فرید الدین عطار کا پندنامہ آج بھی وعظ وتذکیر میں اپنا خاص اثر اور خاص مقام رکھتا ہے۔

مولانا حالی کی مسدس ، علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی سیدھی سادھی نظمیں اپنا خاص اثر رکھتی ہیں۔ملک کی آزادی میں انقلابی نظموں اور حریت پسندانہ ترانوں نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا اعتراف ہر انصاف پسند کو ہے۔

فنون لطیفہ میں شاعری کا مقام:۔

فنون لطیفہ میں شاعری کے اختیار کی وجہ یہ بھی ہے اس میں تحقیقی زبان کے استعمال کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے۔گرچہ لفظ لسانی سطح پر اپنے مخصوص لغوی،عوامی، مقامی ،اور سماجی معنوں میں ہی موجود ہوتے ہیں، مگر اظہار کی وسعت ان حدوں سے پرے معانی کے ان گوہروں کو تلاش کر لیتی ہے،

جن کی چمک سے فن کے جذبے میں موجزن حرارتوں کے لمس سے لطف ہونے کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور اکثر لفظ اپنے متعینہ حدود سے آزاد ہو کر مختلف الجہات معانی کی سرحدوں کو چھونے لگتے ہیں ۔اس طرح ایک بظاہر عام سا لفظ شعر میں ڈھل کر ایک جہانِ معانی کو سمیٹ لیتا ہے اور فکر ونظر، خیال وجذبہ، لفظ ومعانی کے درمیان ایک ربط پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اس طرح فکر وآہنگ کے ایسے تاثر ڈھل جاتے ہیں کہ فن پارے سے گزر کر بھی قاری فن پارے اور فن کے حوالے سے فنکار کے ساتھ رہتا ہے پیشکش کے طریقے کی یہی کامیابی فن کو مقبول اور فن کار کو صاحب اسلوب بنا دیتی ہے مگر اس مقام تک پہنچنے کے لئے جن وہبی صلاحیتوں کے ساتھ جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ بہت کم یاب ہے۔

فکر کی روانی:۔

اس صدی کے اردو شاعروں نے ادب کو زندگی کی سچائیوں سے روشناس کرایا ہے اور گل وبلبل کی نغمہ سنجیوں، عشق ومحبت کی کہانیوں اور ہجر وفراق کی آہ وزاریوں سے گزر کر ان کے تخیل کی بلند پروازیاں زندگی کی دھوپ چھاؤں کے بیان میں معروف ہیں۔ بھٹکتے ہوئے انسانوں اور کرب زدہ ماحول کا بیان ان کا موضوع سخن ہے، زندگی کے نت نئے تقاضوں اور مطالبوں کو انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد بنایا آج جہاں کہیں اردو شاعر موجود ہے وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ناواقف اور بے خبر نہیں ہے۔اس کی شاعری آپ بیتی کے ماحول سے نکل جگ بیتی کی دنیا میں قدم رکھ چکی ہے، وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں زبان کی سلاست ،فکر کی روانی 'سچائی کی مہک ، اسلوب کی انفرادیت ،بات کہنے کا سلیقہ ،مشاہدے کی گہرائی سماج اور معاشرے کی ناہمواریوں ،ظلم وجور کی الم ناک صداقتیں ،سچ اور جھوٹ کی کشمکش موجود ہے۔

دارالعلوم اور شعری منظر نامہ:۔

اردو کی اساس میں دارالعلوم دیوبند کا لہو بھی شامل ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاضت کرنے والوں کو حاشیے میں بھی جگہ نہیں ملتی جب کہ ملاعبت کرنے والے متن میں اعلیٰ مقام اور تاریخ ادبیات اردو میں قابل فخر قرار پاتے ہیں ،اردو زبان کے لسانی اور فکری سرمائے میں جو اضافے مدارس خصوصاً دارالعلوم دیوبند نے کیے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں مگر تاریخ اردو میں دارالعلوم کا نام ونشان تک نہیں ہے۔حقانی القاسمی لکھتے ہے۔

''اردو زبان کے لسانی اورفکری سرمائے میں
جواضافے ارباب مدارس نے کئے ہیں ، وہ
اظہرمن الشمس ہیں مگراس کے باوجوداردو کی تاریخ
میں دلی، لکھنؤ جیسے دبستانوں کاذکرتوملتاہے
مگردیوبندکا ذکرشامل نہیں ہوتا، جب کہ اردوزبان
وادب کے فروغ اورارتقاء میں بنیادی اوراہم
کردار دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما، ندوۃ المصنفین
اوردارالمصنفین جیسے اداروں کا رہاہے''۔

(دارالعلوم دیوبندادبی شناخت نامہ/۴۷)

اسی منظرکونسیم اختر شاہ قیصر کے پیرائے اسلوب میں دیکھیں رقمطراز ہیں:

''دیوبندآسمانِ شاعری پرلکھا ایک جگمگاتا اورروشن
نام ہے اس شہرنے ارباب علم وکمال اورصاحب
فکروفن افرادکی ایک ایسی جماعت تیار کی ہے جس
کے نغموں کی مہک اورغزلوں کی صداقت اپنی الگ
پہچان اورشناخت رکھتی ہے'' (شناسا/۱۲)

اردوادب کے سلسلے میں دارالعلوم کی خدمات:۔

دارالعلوم دیوبند نے اردوکوبین الاقوامی زبان بنانے میں اہم کرداراداکیاہے جس کا اعتراف پروفیسرہمایوں کبیربھی کرتے ہیں۔تاریخ دارالعلوم دیوبند کے حاشیہ میں ایک واقعہ اس تعلق سے الجمعیۃ ،دہلی/۱۸جون/۱۹۵۵ء کے حوالے سے درج کیا گیاہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی دارالعلوم آئے تھے۔وہ کہتے ہیں۔

''جب میں بخارا پہنچاجووسط اشیاء کااہم مقام

ہے تو وہاں ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی
جنہوں نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے
میں اردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت
ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور دراز، اتنی
صاف اردو ان کو کیوں کر آئی ہوگی، میرے
دریافت کرنے پر انہوں نے بتلایا کہ یہ
دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے اور ہم بھی نہیں
بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو بولتا
اور سمجھتا ہے، انہوں نے نہایت اخلاق ومحبت
سے میرے ہندو ہونے کے باوجود مجھے اپنے
ہاں مہمان ٹھہرایا اور میرے اعزاز میں ایک
شاندار پارٹی دی، جس کی یہ خصوصیت کبھی نہ
بھولوں گا کہ اس میں جس نے بھی تقریر کی وہ
میری خاطر سے اردو میں کی۔"

(تاریخ دارالعلوم دیوبند:اص/ج:۳۶۵)

حضرت تھانویؒ کا فتویٰ:-

اس ادارہ کے فارغین فضلاء نے اردو کی خدمات انجام دیں۔چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے رسالہ "النور" رمضان/۱۳۴۰ھ میں لکھا تھا: کہ

"اردو کی خدمت حسب استطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

(رسالہ النور رمضان ۱۳۴۰ھ تھانہ بھون)

کابل کی پہلی اردو یونیورسیٹی:۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے عملی طور پر اردو کے فروغ میں حصہ لیا، شاید بہتوں کو علم نہ ہو کہ کابل افغانستان میں پہلی اردو یونیورسٹی مولانا عبیداللہ سندھی کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی جس کی پوری تفصیل یونیورسٹی کے پہلے منتظم ظفر حسن بیگ نے اپنی آپ بیتی میں لکھی ہے کہ:

''قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے صرف قانونی سیاسی
کارروائی کرنے کے فیصلے کے سلسلہ میں دوسرا کام
یہ کیا کہ افغانی گورنمنٹ سے کابل میں ایک
ہندوستانی اردو یونیورسٹی بنانے کے لئے چارٹر مانگا
اور اس یورنیورسیٹی کا نظام نامہ تیار کر کے سردار محمود
بیگ طرزی، وزیر خارجہ افغانستان کو دیا۔ اس نے
وعدہ کیا کہ وہ افغانی گورنمنٹ اور امیر صاحب سے
اس کی منظوری لے گا''

(سہ ماہی دیوان شمارہ ۳۔۴ پٹنہ)

دارالعلوم کا تدریسی میڈیم:۔

چنانچہ یہ ادارہ قائم ہوا اور اس کا ذریعہ تعلیم اردو زبان قرار پایا۔ آج اس یونیورسٹی کا ذکر صرف تذکروں میں ہے اور اب یونیورسٹی کی جگہ کابل یونیورسٹی قائم ہوگئی ہے۔ جس کا شمار ایشیاء کے چند اہم عصری جامعات میں ہوتا ہے۔ اس کی تمام تفصیلات افغانستان کے مشہور محقق اور دانشور پروفیسر عبدالخالق رشید نے اپنے مضمون ''افغانستان میں اردو کی پہلی یونیورسٹی'' میں درج کی ہے۔

اکابر دارالعلوم کا ادبی ذوق:۔

اکابر دیوبند خصوصاً وہ علماء جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی، ان کا ادبی ذوق بہت

بلند تھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل حقانی القاسمی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائے۔

''دیوبند کے جن اکابر نے عربی مدرسہ قائم کیا ان میں بیشتر کا ادبی ذوق نہایت بالیدہ تھا اور شعروسخن سے ان کی گہری وابستگی تھی مولانا ذوالفقار علی دیوبندی عربی اردو کے ممتاز ادیب وشاعر تھے تو وہیں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اردو فارسی کے ممتاز شاعر جن کی مشہور تاریخی نظم ''قصہ غم دین'' آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔ مولانا یعقوب صاحب بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا تخلص گمنام تھا بیاض یعقوبی سے ان کے مختلف لسانی تخلیقی تجربے کی گواہی ملتی ہے۔ انہوں نے غالب، مومن، ذوق، صہبائی اور آزردہ کی آنکھیں دیکھی تھیں، خواجہ میر درد، شیخ ابراہیم ذوق، اور مرزا محمد رفیع سودا، ان کے محبوب شعراء میں سے تھے مولانا قاسم نانوتوی تو خیر شعروشاعری میں بلند قامت تھے ہی، ان کے علاوہ دیوبند کے اکابر شعروسخن کا بہت ہی اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان لوگوں نے اردو شاعری کو امکانات عطا کئے، معنویات، موضوعات اور لفظیات کی سطح پر جتنے اضافے دیوبند نے کئے ہیں شاید کہیں اور ممکن بھی تھے۔'' (ادبی شناخت نامہ ص/۵۰)

دیوبند کے شعری منظرنامے پر مولانا قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، ناطق گلاؤٹھی،

تاجور نجیب آبادی کے نام نمایاں ہیں کہ ان افراد نے بہت سی نسلوں کی تخلیقی اور شعری تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ان کے علاوہ مولانا عامر عثمانی ، پروفیسر تنویر احمد علوی ،ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کاکوری، انوار الحسن انور شیرکوٹی، فرحت قادری ، مولانا مناظر احسن گیلانی ،یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

انہی میں ہمارے قاری محمد طیب صاحب کی بھی شخصیت ہے۔

شاعری کا آغاز:-

ہم نے اوپر قاری صاحب کے خاندان کا علمی اور ادبی جائزہ پیش کیا تھا ساتھ ہی دارالعلوم دیوبند کا ادبی منظرنامہ کی جھلکیاں بھی قارئین کے سامنے رکھی تھیں، قاری صاحب کی پرورش انہی دو ماحولوں میں ہوئی ،ظاہر ہے طبیعت نے اس اثر کو قبول کیا قاری صاحب نے پہلا شعر کب کہا ؟اس سلسلہ میں کوئی حتمی بات تو نہیں کہی جاسکتی ،البتہ اتنا ضرور ہے کہ قاری صاحب نے بچپن سے ہی طبع آزمائی شروع کردی تھی چنانچہ اسلم رمزی لکھتے ہیں:

''حضرت کا صنف شعر سے دلچسپی کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے جاری تھا۔''

(پیش لفظ عرفان عارف،ص/۷)

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن خدابخش لائبریری پٹنہ لکھتے ہیں:

''مولانا قاری محمد طیب صاحب نے شعروشاعری کا فطری ذوق پایا تھا ، اس بناء پر وہ زمانہ طالب علمی میں گرچہ درسی کتابوں کے مطالعہ میں رہے ،تاہم وقتاً فوقتاً شعرگوئی بھی کرلیا کرتے تھے۔''

(مضمون مشمولہ،مظلوم شخصیت ۳/۳۴۴)

تخلص:-

قاری صاحب کا تخلص ''عارف'' مشہور ہے اور ابتدائی دور کا کلام آپ نے اسی تخلص سے تخلیق

فرمایا ہے۔تاہم آپ کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے یہاں تخلص اور اس کے استعمال کے لئے کبھی کوئی التزام نہیں رہا۔آپ کا بعض کلام آپ کے نام ''طیب'' سے منسوب ہے اور کہیں کہیں بغیر تخلص کے بھی نظم ملتی ہے۔اس سلسلہ میں اسلم رمزی لکھتے ہیں:

''جس کی وجہ بظاہر یہی ہو سکتی ہے کہ شعر گوئی کو کبھی آپ نے مقصدی اہمیت نہیں دی مگر چونکہ لفظ ''عارف'' بطور تخلص ذہنی طور پر متعین رہا ہے۔اس لئے عرفان کی اضافت اس لفظ کے ساتھ جہاں معنوی لحاظ سے اپنے مصداق کی طرف مشبہ ہے وہیں لفظاً بھی صاحب کلام کے تخلص پر دال ہے۔''

(پیش لفظ عرفان عارف ص/۸)

اردو شاعری میں قاری صاحب کی قد آوری:-

اس سے پہلے کہ ہم قاری صاحب کی شاعری پہ تفصیلی نگاہ ڈالیں کہ آپ کس پایہ کے شاعر ہیں ، کتنے اچھے شاعر ہیں اور اس میدان میں آپ کا کیا مقام ہے؟اس لئے مناسب ہوگا کہ چند مستند اور معتبر شاعر وادیب کے تأثرات بیان کئے جائیں اور دیکھا جائے کہ انہوں نے ان کی شاعری کے بارے میں کیا کہا ہے۔

اکبرالہ آبادی کا تاثر:-

حضرت اکبرالہ آبادی نے ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ ''پانی کی روانی'' کے عنوان سے کیا تھا، قاری صاحب نے اس نظم کو پڑھ کر اس کی پیروی میں ایک دوسری نظم ''اسلام کی روانی'' کے عنوان سے کہی جو رسالہ القاسم/۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔اکبرالہ آبادی اس نظم کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام ایک خط میں اپنا تاثر اس طرح پیش کیا

''مولانا طیب کی نظم ''روانی اسلام'' نظر سے
گزری، ماشاء اللہ صلی علی، جزاک اللہ نقاش نقش
ثانی بہتر کشد ز اول خاکسار اکبر الہ آبادی۔

(مشمولہ مظلوم شخصیت ۳/۳۴۶)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا تأثر:-

قاری صاحب کی ایک آنکھ کا آپریشن ۱۹/ جنوری ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا اور پھر کچھ دنوں بعد دوسری آنکھ کا آپریشن ہوا، انہوں نے اس موقع پر بستر پر لیٹے لیٹے ایک طویل نظم کہی جو نہایت معرکتہ الأراء نظم ہے، اس نظم میں آنکھ سے متعلق بہت سے حقائق، فوائد اور کیفیات نہایت بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہیں، حکمت وعبرت کی باتیں کہیں گئی ہیں سبق حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے خالق حقیقی کا شکرادا کیا گیا ہے ہسپتال کے ڈاکٹر کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے، جب یہ نظم چھپی تو اہل علم نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تعریف کی ۔اردو زبان کے مشہور انشاء پرداز اور ادیب مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس نظم کو پڑھ کر اپنے تأثرات کا اظہار اس طرح کیا

حضرت محترم السلام علیکم

''آنکھ کی کہانی'' آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی
پڑھ ڈالی، سبحان اللہ ماشاء اللہ مجھے علم نہ تھا کہ آپ
کو شعروادب میں اس درجہ قدرت حاصل ہے،
ذالک فضل اللہ۔

کیا کیا قافیئے نکالے ہیں ، کیسے کیسے مضمون
باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے
چھوٹ گئے ،نہ کہیں جھول ،نہ اتنی طویل نظم میں
کہیں آورد، بس آمد ہی ،آمد، خوش دماغ تو بحیثیت
ایک سچے قاسم زادے آپ تھے ہی ، اب معلوم

ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اس درجہ میں

ہیں۔ماشاءاللہ۔

دعا گوودعاجو

عبدالماجد ۱۵/ دسمبر ۱۹۶۴ء

(عرفان عارف)

مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر کا تأثر:۔

مسٹر افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان برائے ہند نے بھی ''آنکھ کی کہانی'' والی نظم پڑھی تو وہ نہایت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے تأثرات کو اس طرح بیان کیا' لکھتے ہیں:

''شعر کی سادگی، تخیل کی پرواز اور خلوص کی بہتات
تمام ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کی ذات سے نہایت
آسانی سے منسوب ہوگئی ہیں۔آپ کی روحانی
عظمت کا کون قائل نہیں ہے، یہ مثنوی آپ کے ملکۂ
شاعری کا لوہا ہم جیسے کافروں سے بھی منواتی ہے۔
بہت ظلم ہوگا اگر آپ اپنے مشاغل میں صنف
شعر کی طرف توجہ نہ دے سکیں اس ملک
(ہندوستان) میں جہاں اسلام کو آپ کی ذات
بابرکات سے تقویت پہنچی ہے وہاں اردو بھی منت
پزیر شانہ ہے۔

(مشمولہ مظلوم شخصیت ۳/ ۳۴۷)

قاری صاحب کی شاعری خود اپنی نظر میں:۔

قاری صاحب نے شاید ہی کسی تحریر میں اپنی شاعری پر تبصرہ کیا ہو، لیکن قاری صاحب کے

منظوم کلام کے علاوہ قاری صاحب کا ایک قلمی مسوّدہ بھی ہے، جس کو دوسرے الفاظ میں کشمیر کا منظوم سفرنامہ بھی کہا جاسکتا ہے یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے اوراس کا ایک فوٹو مفتی سعید الظفر صاحب معین المدرسین دارالعلوم دیوبند کے پاس ہے اور وہ اس کو تالیقات کے ساتھ شائع کر رہے ہیں ۔اس کے پیش لفظ میں قاری صاحب نے اپنی شاعری کے سلسلہ میں ان الفاظ میں تبصرہ پیش کیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

''یہ واقعہ ہے کہ میں نہ شاعر ہوں نہ کسی شاعر کا تلمیذ ،اور نہ ہی شاعری میرا مشغلہ ہے، اوراور نہ شاعری کے ماحول میں زندگی گزری لیکن زمانۂ طالب علمی ہی سے یہ عارضہ ضرور لگا رہا کہ غیر معمولی واقعات بالخصوص خاص حوادث کے پیش آنے پر جذبات وتاثرات کی ترجمانی کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کرتی رہتی تھی، کشمیر کے قدرتی مناظر، ان کی موزونیت اور ساتھ ہی اہل کشمیر کے حالات وکیفیات سامنے آنے پر پرانا روگ خود بخود ہی ابھر آیا اور جذبات وتاثرات نے محض طبعزاد طریق پر شعر کا لباس پہن لیا۔''

(مسوّدہ سیر کشمیر ص:۱۔۲)

قاری صاحب کے مذکورہ تبصرے کا ابتدائی حصہ کسرنفسی اور تواضع پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے، کیونکہ باب اول اوردوم میں تفصیل سے قاری صاحب کے خاندانی حالات پر بحث کر چکے ہیں۔

آپ کے استاذ:۔

قاری صاحب نے شاعری کے لئے کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے ؟ کس سے اصلاح لی؟ اس سلسلہ میں آپ کے تقریباً سبھی تذکرہ نگار خاموش ہیں البتہ آپ نے خود وضاحت فرمائی ہے

کہ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ کسی
شاعر کا تلمیذ''

(مسوّدہ ''سیر کشمیر'' ص:۱)

قاری صاحب کے لئے ان کا خاندانی ماحول اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کا ادبی ماحول ہی استاذ بن گیا۔ مزید یہ کہ قاری صاحب کے دور طالب علمی کے تقریباً تمام ہی اساتذہ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اساتذہ کی طرف سے علوم اسلامی کے علاوہ یہ فن بھی قاری صاحب کی طرف منتقل ہوا۔

قاری صاحب کی شخصیت کے انہیں داخلی اور خارجی مؤثرات نے ان کی زندگی میں سوز و گداز پیدا کر دیا تھا، جس کا لازمی نتیجہ انفعال ہوتا ہے اور یہی انفعالی کیفیات جب الفاظ، تعبیر، کنایہ، رمز و استعارے کے پیکر میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو شعر ہو جاتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے قاری صاحب کی شاعری کا مطالعہ ہمیں ان کی داخلیت تک پہنچاتا ہے۔

قاری صاحب کا کلام اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں ہے لیکن کلام کی بنیادی خصوصیات ہر زبان میں یک ہی نظر آتی ہیں جس سے اس حقیقت کا اندازہ بہت واضح طور پر ہو جاتا ہے کہ ان تینوں زبانوں پر آپ کو مضبوط دستگاہ حاصل ہے اور مضامین کی آمد و روانی کلامِ اردو کی طرح عربی و فارسی میں بھی حیرت انگیز طور پر یکساں ہے، لیکن ہم پہلے اردو شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اردو شاعری:-

اردو شاعری میں حضرت قاری صاحب نے نظم، مرثیہ، قصیدہ، قطعات، نعت، اور حمد تقریبا ہر صنف میں طبع آزمائی فرمائی ہے، لیکن صنف غزل سے آپ کو دلچسپی نہیں رہی ہے اور اردو کی دیگر صنفوں خصوصاً نظم کو آپ نے بہت ابھارا' غزل سے آپ کو کیوں دلچسپی نہیں رہی؟ سنئے اسلم رمزی کے الفاظ میں:

" آپ کی شاعری شوقِ شعر گوئی کے بجائے
واقعات وحادثات کے ذہنی تاثیر حقیقی جذبات اور
تبادر ذہنی پر مبنی ہے ان تمام نظموں کے محرکات
جماعت دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنے
والے اہم واقعات وتقریبات یا حادثات ہیں ،
جن سے متاثر ہوکر جذبات نے جامع شعر اختیار
کیا یہی وجہ ہے ان کے تمام اشعار میں مقفع اور پر
کاری کے بجائے سادگی و سلاست اور خلوص
وجذبات ہیں ، یہی ان اشعار کی سب سے بڑی
خصوصیت اور دل کشی ہے ، اور یہی بنیاد حضرت مد
ظلہ العالی کی صنف غزل سے عدم دل چسپی کی ہے
جس کی تعبیرات محض نزاکت تخیل اور ندرتِ اظہار
وبیان ہے۔"

(عرفان عارف :ص ۸)

صنفِ غزل سے دوری:۔

لیکن صنف غزل سے عدم دلچسپی کے باوجود آپ کو اس صنف میں دستگاہ حاصل تھی ، اس کا اندازہ آپ کے متعدد قصائد کے ابتدائی اشعار سے ہوتا ہے ، ادب اردو کے باکمال افراد کی زندگی کا مطالعہ توجہ دلاتا ہے کہ ہر انسان نے دنیائے ادب کے اصناف سخن میں سے اپنی طبیعت کے موافق صنف کا انتخاب کیا ہے اور اسی کو انہوں نے اپنی محنت کا محور قرار دیا ہے۔ لیکن ان اساتذہ ادب کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کو دیگر اصناف میں دسترس حاصل نہیں تھی ۔ یہ نظریہ یقیناً ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی' کسی بھی ادبی انسان کی ادبیات پر تبصرہ سے پہلے اس کے اردگرد کے ماحول' اس کا طبعی وفطری رجحان اور خود اس کے مشغلہ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ ہمارا یہ تجزیہ

اس کے ادبی رخ کو متعین کرنے میں مددگار ہوگا۔ مثال کے طور پر ادبیات میں سے غزل کا اہم مقام ہے اور تقریباً ہر دور کے شعراء نے اس صنف میں کمال پیدا کرنے کی خوب خوب کوشش کی ہے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رومانیت غزل کا لازمی جز ہے جب تک گل وبلبل کی داستان نہ چھیڑی جائے غنچے ڈھالنے کی بات نہ کی جائے' محبوب سے محبت اور اس کے حسن و جمال کی تعریف نہ کی جائے اشعار کو غزل کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

علامہ اقبالؒ نے داغ دہلوی کا دامن پکڑا' ان سے اصلاح لی اور ان کے نقش قدم پر چلنے لگے لیکن طویل زمانے تک داغ کا ساتھ نہ دے سکے اور آخر انہوں نے طبیعت کے ذوق کے مطابق اشعار کہے۔ وجہ یہی ہے کہ داغ کی طبیعت میں رومانیت ہے' اقبال کی طبیعت رومانیت پسند نہیں بلکہ حقیقت پسند واقع ہوئی ہے چنانچہ وہ داغ کی روش سے ہٹ کر اپنی طبیعت کے مطابق چلنے لگے۔ ان کے اس مزاج نے ان کو ایک اسلامی فکر اور اسلامی فلسفہ کا شاعر بنادیا۔

یہی بات قاری صاحب کے سلسلہ میں کہی جاسکتی ہے' ان کے خاندانی ماحول اور اردگرد کے اسلامی ماحول نے ان کی طبیعت میں رومانیت کو جنم لینے نہیں دیا اور انہوں نے صنف غزل سے منہ موڑ کر نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ قاری صاحب کی شاعری کو مکمل طور پر سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کیلئے ان مجموعوں خصوصاً مجموعہ کلام ''عرفان عارف'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، عرفان عارف کے مطالعہ کے بعد یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حضرت حکیم الاسلام کی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں ، اگر چہ ان میں متنوع مضامین پائے جاتے ہیں ، لیکن بنیادی طور پر وہ اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہیں ، حمد الٰہی 'نعت نبوی ﷺ کے علاوہ شخصی مدائح ، مراثی ، تاریخی حکایات ، ذاتی واقعات ، غرض کہ کسی بھی انداز سے انہیں کچھ کہنا ہو وہ شعر موزوں کر لیتے ہیں اور نعت وعقیدہ کی صحت وسلامتی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں اور نا ہی فکر اور مسلکی عقائد سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں مذہبی ، فکری ، ومسلکی تمام ہی مناظر کو پیش نظر رکھکر شعر کہنا ید طولیٰ کے بغیر ممکن نہیں ، تاہم یہاں قاری صاحب کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں تا کہ آپ کو اندازہ ہو کہ ان کے یہاں کیسی زبان کیسے کیسے مضامین اور کیسے کیسے قافیے وردیف کس خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں

ب سے پہلے اس حمد کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو بچوں کو یاد کرانے کے لئے کہی گئی ہے۔

خدا کی ذات میں ہے ہر بڑائی
پہونچ سکتی نہیں اس تک برائی
غنا ہے اس کی شانِ کبریا ئی
نہیں محتاجگی کو واں رسائی
کمالا ت اس کے سب در یوزہ گر ہیں
جمالات اس کے سب زیر اثر ہیں
بری ہر وہم وقیل قال سے ہے
بری ہر مثل وہ تمثال سے ہے
جہانِ عرش و کرسی اور افلاک
جہانِ غیب وشاہد اس کی املاک
عطاؤ جود کی ہے اس کی کیا بات
ہے توحید ورسالت اس کی سوغات
عطیہ رحمتِ مُہداۃ اس کا
ہدیہ علم وادراکات اس کا
نبی ہوں یا ولی مجبور ہیں واں
مہ ومہتاب سب مزدور ہیں واں
ہر اک ذرہ میں جلوہ اس کا پیدا
ہر اک پیکر سے نور اس کا ہویدا

(عرفان عارف ص ۲۵)

غالبؔ کا ادب اور اقبالؔ کی فکر:۔

شمالی ہندستان میں شعروادب کے جو دبستان ادب وجود میں آئے ان میں ادبی طور پر غالب

اور فکری طور پر اقبال حاوی رہے بعد میں ان دونوں کے حسین امتزاج نے شاعری کے ایک نئے روپ کو جنم دیا اس کے علمبرداروں نے بالخصوص ان حضرات کو اپنے حصار میں قید کر لیا، جن کی طبیعت ادب پرور اور فکر اسلامی مزاج کی حامل تھی، ایسے شعراء کی طویل ترین فہرست ہے، ان کی خاص خوبی یہ رہی کہ انھوں نے غزل اور نظم کو اس کے لغوی معنی کی تیور سے نکال کر حالتِ حاضرہ سے ہم آہنگ کیا، انہوں نے اپنی شاعری میں احوال کو قلم بند کر کے انہیں مستقبل کے ادباء و مفکرین کے حوالے کر دیا جس کی روشنی میں وہ ماضی کی تاریخ بآسانی مرتب کر سکتے ہیں، اس طریقہ پر ایسے حضرات کی شاعری زندہ جاوید رہی قاری صاحب کی شاعری کا مطالعہ کر کے قاری کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی کہ مرحوم بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو فکرِ اسلامی کا علمبردار ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اقبالؔ ایک اسلامی اور فلسفی شاعر ہے اس کی حقیقت پسند طبیعت نے اپنے استاذ داغؔ دہلوی کی روش سے ہٹ کر اشعار موزوں کیے ہیں' جو اسلامی فلسفہ کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔ اقبال کی پوری زندگی اور جدوجہد کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرقی یعنی اسلامی تہذیب' مغربی تہذیب سے اعلیٰ ہے۔ دنیا میں چین وسکون اور آخرت کے انعامات ان ہی اسلامی خطوط پر ہیں۔ اقبال نے اپنے اس فکری نظریہ کو انتہائی شدت کے ساتھ پیش کیا' جس کے نتیجہ میں شاعر مشرق جیسے عظیم لقب سے نوازا گیا۔ اقبال کے فکری نظریہ کے لئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

قوم مذہب سے ہے' مذہب جو نہیں' تم بھی نہیں
جذبہ باہم جو نہیں' محفل انجم بھی نہیں

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ان اشعار میں اقبال کے فکر کی ایک ہلکی جھلک ہے ورنہ اقبال کے نظریات اس کی پوری

شاعری میں منتشر ہیں' قاری صاحب کی طبیعت بھی چونکہ حقیقت پسند تھی' تخیل اور رومانی دنیا سے آپ کو قطعاً تعلق نہیں تھا' تو آپ نے بھی اقبال کی فکر کو اپنایا' بلکہ یہ بات کہیں تو حق بجانب ہوگی کہ قاری صاحب نے فکر اقبال کے ساتھ فکر ولی اللہ کو پیش کر کے اقبال کی فکر کو اوج کمال تک پہنچا دیا' اس طویل مقالہ کے آخر تک ہر ہر شعر ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہے۔

شمالی ہندوستان نے غالبؔ کے ادب کو بھی قبول کیا اور اس کو سراہا ہے' غالبؔ کا ادب ایک وسیع عنوان ہے جس کے مختلف پہلو ہیں' اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ غالبؔ کو صوفی شاعر کہا گیا ہے۔ یعنی اس کی شاعری میں تصوف کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

آہ ! کو چاہیئے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میرے خیال میں غالبؔ نے ان جیسے اشعار میں رومانیت سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے تصوف کے باریک مسائل کو چھیڑا ہے۔ لیکن ایک قاری کے لئے یہ بات باعث حیرت ہوگی کہ غالبؔ کا تصوف ادھورا ہے' اس میں پختگی نہیں ہے ان کی شاعری میں یقیناً مذہبی رجحانات موجود ہیں لیکن وہ مذہب کی صحیح کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے۔ غالب کی شاعری کے اس پہلو کو اگر ''ادب غالبؔ'' کا نام دیا جائے تو میرے خیال میں بیجا نہ ہو۔ غالبؔ کے اسی ادب کو شمالی ہند کے شعراء نے اپنایا اور اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ چونکہ قاری صاحب کا تعلق بھی شمالی ہند سے ہے' آپ نے بھی اس ادب کو قبول کیا لیکن دونوں میں واضح فرق یہ ہے کہ قاری صاحب کا تصوف پختہ ہے' ان کا خاندان علمی اور مذہبی ہے' پہلے اور دوسرے باب کی تفصیل کے مطابق قاری صاحب کا خاندان ایک زمانہ تک مسند تصوف پر رونق افروز رہا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود بہر حال قاری صاحب نے ابتداء میں غالب کے ادب سے ہی استفادہ کیا ہے گرچہ بعد میں اس کی تصحیح کی ہے ہمارا یہ نظریہ اس باب میں پیش کئے گئے اشعار میں جابجا جھلکتا نظر آئے گا۔ مثلاً بارگاہِ نبوت میں نذرانہ عقیدت کے بطور ان کے

نعتیہ اشعار کو ملاحظہ کیجئے جس سے ان کے فکر کی بالیدگی کا اندازہ ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں، ڈربن (جنوبی افریقہ) کے ایک مشاعرہ نعت میں ۳/اگست ۱۹۶۳ء کو پڑھی گئی نعت۔

جہانِ ذکر اوصاف وکمالات
فدائے ذکر والائے محمد
بیاض روز مہر وماہ وانجمن
نثار زلف سودائے محمد
ازل سے تاابد ایام دنیا
نثارِ لیل اسرائے محمد
اگر ہے سرّ حق دنیامیں ظاہر
تو مظہر ذات والائے محمد
اگر ہو علم ربانی مصوّر
تو ہو وہ نقش زیبائے محمد
مجسم ہو اگر اخلاق الٰہی
تو بن جائے سراپائے محمد
کمالات بشر ہیں ختم ان پر
تو ہے پھر کون ہم تائے محمد
بلندی آسمانوں کی مسلم
تھے اسراء میں تہِ پائے محمد
طواف تن کو کعبہ بس ہے لیکن
مطاف روح ہے جائے محمد
عروج قاسمی کی انتہاء ہے
کہ خاکِ کفِ پائے محمد

(عرفان عارف ص ۳۰)

ایک دوسری نعت کے چند اشعار سے لطف اٹھایئے۔

تو ہے وہ نقطہ انوار فیضان خداوندی
کہ جس سے نور ساماں ہے فضائے بزم امکانی
بنے اگلے نبی تجھ سے ہوئے پچھلے ولی تم سے
تیرے ہی فیض سے ارزاں ہوئی شاہوں کو سلطانی
مقاماتِ عروج روح تم سے ہیں نہ تم ان سے
ہے سورج خود سے روشن اور شعاعیں اس سے نورانی
نبوت ہی نہیں ختم نبوت کے ہو تم حامل
ستارے انبیاء ہیں اور تم ہو مہر نورانی

(عرفان عارف ص۳۲)

معیارِ ادب :-

قاری صاحب کی درج ذیل نعت تو بہت ہی مشہور ہوئی اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ بات کہی جائے تو حق بجانب ہوگی کہ یہ نعت اردو ادب میں شاید ممتاز مقام رکھتی ہے جیسے اشعار صرف نعت تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان کی قرآنی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں، ایسے ہی انتہائی سادہ مگر دل کش انداز میں نعت کے ان اشعار پر داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا جس میں عشق حقیقی کی تصویر کشی بھی ہے۔

نبی اکرم شفیع اعظم دکھے دلوں کا پیام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو
شکستہ کشتی ہے تیز دھارا نظر سے روپوش ہے کنارا
نہیں ہے کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام لے لو
عجیب مشکل میں کارواں ہے نہ کوئی جادہ نہ پاسباں ہے
بشکل رہزن چھپے ہیں رہزن اٹھو ذرا انتقام لے لو
قدم قدم پہ ہے خوف رہزن زمین بھی دشمن فلک بھی دشمن

زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن تم ہی محبت سے کام لے لو
کبھی تقاضہ وفا کا ہم سے کبھی مذاق جفا ہے ہم سے
تمام دنیا خفا ہے ہم سے خبر تو خیر الانام لے لو
یہ کیسی منزل پہ آگے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا تمام اپنے غلام لے لو
یہ دل میں ارماں ہے اپنے طیب مزار اقدس پہ جا کے ایک دن
سناؤں ان کو پیام دل کا کہوں میں ان سے سلام لے لو

اسلام کی روانی:-

حمد اور نعت کے بعد ہم نظم کی طرف چلتے ہیں جو قاری صاحب کی خاص صنف ہے:
سب سے پہلے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس کو پڑھ کر حضرت اکبر الہ آبادی نے داد دی تھی یعنی ''اسلام کی روانی'' دیکھئے یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

چلا ارضِ بطحا سے اک بحرِ ذاخر
کہ تھا جس کی موجوں کا اول نہ آخر
وہ توحید لے بجاتا ہوا
سرودِ حجازی میں گاتا ہوا
وہ جنگل میں منگل مناتا ہوا
وہ شہروں میں شادی رچاتا ہوا
پہاڑوں پہ نعرے لگاتا ہوا
سمندر میں طوفان اٹھاتا ہوا
ضلالت کے پیڑوں کو ڈھاتا ہوا
زمانہ میں اُدہم مچاتا ہوا
محیط زمین پر وہ چھاتا ہوا

خباثت کی وسعت گھٹاتا ہوا
صداقت کے جھنڈے اُڑا تا ہوا
وہ باطل کو نیچا دکھاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑواتا ہوا
خدا سے ہر اک کو ملاتا ہوا
اسی کی عبادات سکھاتا ہوا
حضور اس کے سب کو جھکاتا ہوا
جہالت کی رسمیں مٹاتا ہوا
معارف کے ایواں اٹھاتا ہوا
اذانیں زمین پر دلاتا ہوا
شیاطین کو دھکے لگاتا ہوا
معاصی کو آنکھیں دِکھاتا ہوا
گناہوں کی گردن دَباتا ہوا
وہ نیکوں کو مژدے سناتاہوا
شریروں کو ہر سو ڈراتا ہوا
وہ گرتوں کو بڑھ کر اٹھاتا ہوا
کہیں ڈوبتوں کو تراتا ہوا
و ہ غیروں کو اپنا بناتا ہوا
لگن اک نئی سی لگاتاہوا
وہ آنکھوں سے آنکھیں لڑاتا ہوا
دلوں کے ہر اک کے سماتا ہوا
وہ ایوان کسریٰ ہلاتا ہوا

علم رومیوں کے گراتا ہوا
چراغ ہدایت جلاتا ہوا
اور آتشکدوں کو بجھاتا ہوا
تمدن کی بیخیں جماتا ہوا
مہذب جہاں کو بناتا ہوا
دلوں کو وہ ہمت دلاتا ہوا
وہ روحوں کی قوت بڑھاتا ہوا
دروس حقائق پڑھاتا ہوا
خرافات یوناں بھلاتا ہوا
صدفہائے علمی بہاتا ہوا
گہرہائے عرفاں لٹاتا ہوا

(عرفان عارف ص۱۱۵)

قاری صاحب کی شاعری کے اجزائے ترکیبی:-

قاری صاحب بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور نظم بھی اکہری، بندش کی چستی زبان کی سلاست اور محاورہ بندی ان کی نظم کے اجزائے ترکیبی ہیں، قاری صاحب کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے پر اس میں نظم کی مانوس اور متعارف روایت کی پابندی اور اپنی روایت کی پاسداری نمایاں محسوس ہوتی ہے، ہم کھل کر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ نہ ان کے کلام میں تعقید ہے نہ ابہام، نیز جو کچھ ہے ان کا اپنا ہے، کسی کی نقل اور تقلید نہیں ہے

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یہ کیسی دھوم ہے باغ جہاں میں آج اے ہمدم
گلوں سے بلبل نالاں گلے ملتی ہے کیوں پیہم
خوشی میں کیوں ترانے گا رہی ہیں قمریاں باہم

برستا ہے یہاں پر ابر رحمت آج کیوں چھم چھم
ہوئے جاتے ہیں گل جامے سے باہر شادمانی سے
ہوئی جاتی ہے بلبل مست اپنی نغمہ خوانی سے
خرام ناز سے باد بہاری آج آتی ہے
بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لاتی ہے
چمن میں ہر طرف سے یہ مبارک باد آتی ہے
مبارک ہو بہار بے خزاں گلشن میں آتی ہے
پلادے ایک ساغر ساقی رنگیں بیاں مجھ کو
تری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھ کو
بتادے عالم اسرار کے راز نہاں مجھ کو
پلادے وہ مئے عرفاں کہ کر دے بے نشاں مجھ کو
مضامین کا چلا ہے دل سے اک قلزم رواں ہو کر
مرے عجز بیاں نے سر اٹھایا آسماں ہو کر
تخیل کے ہے سینے میں مضامین کی فراوانی
تصور کے خزانے میں ہے تصدیقوں کی ارزانی

(نظم مشمولہ مظلوم شخصیت ۳/۳۵۰)

ابتدائی کلام:-

قاری صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں "کوثر العلوم" کے عنوان سے طویل نظم کہی ہے، مذکور اشعار اسی نظم کے ہیں، اس میں اکابر دارالعلوم دیوبند کی خدمات بیان کی گئی ہیں اور مسلمانوں کے انقلابات کی طرف اشارہ کر کے انہیں دین اور تعلیم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

یہ نظم اگر چہ زمانہ طالب علمی میں کہی گئی ہے تاہم اس میں جتنا زور بیان سلاست وروانی، منظر

کشی اور خوبصورت اسلوب نظر آتا ہے، اس کو پڑھ کر ایک اچھے قادر الکلام اور استاذ شاعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

شاعر آگے چل کر مسلمانوں کی ترقی اور اس کے زوال کی داستان پیش کر رہا ہے اور اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ عرب جیسی وحشی قوم نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی اور رہبر تسلیم کرلیا اور ان کی تعلیمات پر عمل کیا تو اللہ نے شاہوں کے تاج ان کے قدموں میں ڈال دیئے اور زندگی کے ہر میدان کی رہنمائی انہی کے حق میں رکھی، اور جب تعلیمات سے منہ موڑا تو نامرادی اور ناکامی ان کے حق میں آئی، دیکھئے اس تاریخی واقعہ کو کس خوبصورت دلچسپ پیرائے زبان میں بیان کیا گیا ہے، اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

عرب کے وحشیوں کو وہ بتائی رہ تمدن کی
کہ یورپ کے مہذب خوشہ و چینی کر گئے ان کی
وہ وحشی قوم جو کل تک کہ خود گمراہ پھرتی تھی
بنی ہے رہنما اللہ اکبر آج عالم کی
غرض اس قوم پر وہ وہ ہوئے الطاف رحمانی
شتر بانی کے بدلے میں ملی ان کو جہاں بانی
دل وجاں سے رہے جب تک کہ تم اسلام پر شیدا
سروں تھا تمہارے نیرِ اقبال کا سایہ
مگر مذہب کی پابندی سے جوں ہی تم نے منہ موڑا
تو پھر اقبال نے بھی دوسری جانب کا رخ بدلا
نہ کی جب قدر اس کے نور کی کچھ اہل مشرق نے
طلوع آفتاب ہونے لگا آخر کو مغرب سے
عزیزو تم کہاں پھرتے ہو یوں حیران اور ششدر
ہے ٹھانی تم نے دل میں کیا بھروسہ ہے تمہیں کس پر

ترقی ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں غیروں کے برتے پر
نہ پہنچائے گا کیا اسلام معراج ترقی پر
تلاش آبِ حیوان میں کہاں جا کر بھٹکتے ہو
وہ ہے ریگ رواں جس کو کہ تم پانی سمجھتے ہو
کمائی دولت دنیائے دوں بد خواہ دیں ہو کر
ڈسے گی یہ ترقی تم کو مار آستیں ہو کر
عبث تم چھوڑ کر اسلام کو پھرتے ہو یوں دردر
اگر دنیا ہی ہاتھ آئی تو تف ہے اس ترقی پر
نہ لی تم نے صفت غیروں سے پابندیٔ مذہب کی
اسی کو چھوڑ بیٹھے بات تھی جو اصل مطلب کی
تمہارے دل کو بھائی ہے ادا غیروں کے مشرب کی
چھوا عقرب کو لیکن کی نہ پروا نیش عقرب کی
ستم ہے نور کو اندھیر ظلمت کی ضیاء سمجھے
پڑیں پتھر اس اوندھی عقل پر سمجھے تو کیا سمجھے
تمہاری عقل کا یہ پھیر ہے سوچو تو تم اتنا
زمانہ کب یہ کہتا ہے کہ مذہب چھوڑ دو اپنا
سلف نے وہ کئے تھے عزت وجاہ حشم پیدا
کہ یورپ خواب میں بھی اس ترقی کو نہ دیکھے گا
نئی تہذیب کی ان کو ذرا بو تک نہ پہنچی تھی
ذرا سوچو تو پھر کیسے ترقی ان کو حاصل تھی
اطاعت کیا نہ کرتے تھے سلاطین زماں ان کی
نہ تھی کیا کرسی اقبال اشک آسماں ان کی
ہمیشہ راہ پر رہتا تھا کیوں سارا جہاں ان کی

فرشتے چومتے تھے کیوں زمین آستاں ان کی
سبب یہ تھا کہ وہ اسلام کے ، اسلام تھا ان کا،
بجز مذہب کی خدمت کے نہ کوئی کام تھا ان کا

(نظم مشمولہ مظلوم شخصیت ۳/۳۵۲)

قاری صاحب کا ادبی مقام:-

ایک جدید انگریزی نقاد کے نزدیک اعلی شاعری میں تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہے وہ ہیں ،موسیقیت ،معنویت ،اور اشاریت ،ان تینوں میں سے اشاریت کا ہونا ازبس لازمی ہے۔

ذوق کا ایک شعر ہے:

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب
پُل بنا ، چاہ بنا ، مسجد وتالاب بنا

یہ شعر چونکہ اشاریت سے خالی ہے اسلئے اسے عمدہ شعرنہیں کہا جا سکتا اسکے برعکس غالب کے اس شعر کو لیجئے!

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں تیرا راہ گزر یاد آیا

اس شعر میں جو اشاریت ہے،اس کی وجہ سے سحر ہلال کا نمونہ بن گیا ہے۔

قاری صاحب کے اشعار ان تینوں کسوٹیوں پر پورے اترتے ہیں ، دوسرے الفاظ میں ان میں موسیقیت اشاریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے،مثال کے طور کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میؤوں کے اور پھلوں کے خزانے بھرے ہوئے
رنگین گلوں کے ڈھیر بہر جالگے ہوئے
سبزے کا مخملیں بہر خطہ فرش سے
رنگینیوں کا روئے زمین پر یہ عرش ہے
ہر ہر شجر ہے پھولوں کے آنچل میں اک دلہن

ہے عجلۂ عروس ہر اک تختۂ چمن
سڑکوں پہ ہیں دو رُویہ صنوبر جمے ہوئے
یا سَر وقد ہیں سرو کے پودے کھڑے ہوئے
جن منظروں کی راہ بھی ہو منظرِ جمیل
ان منظروں کا کیا ہی ملے گا کہیں مثیل
بنگلے کنارِ آب میں باغات میں نہاں
ہے جنتوں میں تحتہا الانہار کا سماں

(سیر کشمیر، ص : ۲۷)

''سیر کشمیر'' کے ان چند اشعاروں میں موسیقیت اور اشاریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

منظوم سفر نامہ:-

حضرت قاری صاحبؒ نے اوائل جون ۱۹۷۳ء میں کشمیر کا سفر کیا تھا اس سفر میں آپ کے رفقاء سفر تھے حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیو بند اور قاری عبد الرحمٰن صاحب سابق امام جامع مسجد سہارنپور

(سیر کشمیر، ص :۱)

اس طویل سفر کے دوران بہت سارے خطابات فرمائے۔ بے شمار دعوتوں میں شرکت کی اور دنیا کی جنت کے نظاروں سے خوب خوب استفادہ کیا' قاری صاحب نے اس پورے سفر کو منظوم کیا ہے' اس کو بلا خوف تردید منظوم سفر نامہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ابھی یہ سفر نامہ مخطوطہ کی شکل میں ہے' اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاری صاحب کے کلام میں بلا کی برجستگی اور اصابت رائے کی مضبوطی پائی جاتی ہے، بات فیصلہ کن کہنے کے عادی ہیں کہ قاری حیرت واستعجاب کے عالم میں غوطہ زن ہو جاتا ہے، ''سیر کشمیر'' میں ایک جگہ آپ نے قوم کے زوال کا سبب قومی تہذیب کا فقدان بتایا ہے، حضرت کے اشعار ملاحظہ فرمائیں اور داد دیں۔

کشمیر آج دوہری مصیبت کا ہے شکار
ظاہر میں انتشار ہے ، باطن میں دل فگار
جب دل بدل گئے تو بدلنا وطن کا کیا ؟
من ہی خراب ہوں تو سنورنا ہر تن کا کیا؟
تہذیب کہنہ جس پہ تھی اخلاق کی بنا
جب مٹ گئی تو قوم کی ہی مٹ گئی بنا
تہذیب اگر مٹے تو مٹنا ہے قوم کا
یہ موت ہے نہ یہ کہ یہ غلبہ ہے قوم کا
آفت نہیں ہے یہ کہ زمین ہاتھ میں نہ ہو
آفت ہے یہ کہ ملت حق ساتھ میں نہ ہو
کشمیر سب کا سب بھی اگر ہاتھ ہی میں ہو
کیافائدہ جو ملت دین ہاتھ میں نہ ہو
چھن جائے اگر وطن تو بگڑتا ہے جزو خاص
جس کے بگاڑ کا ہے اِسی جُز سے اختصاص
لیکن اگر تباہ ہو انسانی اک گروہ
بگڑے گا اُس سے سارے بنی نوع کا شِکوہ
عالم کے حق میں مرکز عالَم ہے آدمی
جیسا کوئی ہو آدمی ویسی ہی خادمی
معیار کا راس میں ہے تہذیب کی روش
اس سے ہی ہے سکون بھی اس سے ہی ہے خلش
تہذیب حق ہی میں ہے نبی نوع کا سکون
تہذیب نوع ہے مرکزِ تشویش اور زبُون

تہذیب حق سے راہِ الٰہی میں ہے جہاد
تہذیب نَو سے راہ خلائق میں ہے فساد
تہذیب نَو ہی کا ہے یہ پھیلا ہوا افساد
کل بحروبر بھی قوم ووطن بھی ہیں سب بباد
اس کی نمائشوں میں ہیں اس درجہ سب غریق
آتا ہی کچھ نظر میں نہیں دوسرا طریق

(سیر کشمیر' ص :۲۴)

قاری صاحب کی شاعری میں فکری عنصر:-

قاری صاحب نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ دور روایتی شاعری کا دور تھا، اکثر لوگ دیدۂ ودل کی بات کہنے کے بجائے گل وبلبل کی داستان کا نئے بچھانے اور غنچے ڈھالنے کی بات کیا کرتے تھے لیکن قاری صاحب نے فکر کو ہمراز بنایا اور اپنی شاعری کی بنیادی فکر نوجوان نسل کی تربیت اور صالح معاشرے کی تعمیر وتشکیل کو قرار دیا' اگر اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تبصرہ کیا جائے تو حق بجانب ہوگا کہ قاری صاحب نے عمر اور تجربہ کے عروج کے ساتھ جو کلام کہا ہے وہ بلا تردد نوجوان نسل کی کامیابی اور صالح معاشرے کی تشکیل کے لئے درخشاں نقوش ہیں' قاری صاحب میں یہ فکری عنصر فطری ہے''سیر کشمیر''میں آپ کی یہ فکر جا بجا جھلکتی ہے' ملاحظہ فرمائیں:

اس کو ہی پھر سے زندہ کریں قوم کا امین
جزوی مفاد چھوڑ دیں مقصد کا ہوں رہین
لے کر اسی کو پھر سے چلیں قوم کا خواص
قائم کریں دیانت باطن سے اختصاص
عیش فزوں میں لائیں بہر حال اعتدال
راہِ عمل میں پیش کریں علم کا جمال
اصلاح قوم کے لیے سب ہو کے مستعد

اک متحد نظام پہ ہو جائیں متحد
باہم ہو اختلاف فروعات میں اگر
سب متحد اصول کی حد تک رہیں مگر
اس میں کبھی بنائے نہ جائیں حَکَم عوام
یہ گھر میں بیٹھکر ہے فقط رہبروں کا کام
تنقید وتبصرہ سے نکھرجائے بات جب
اسٹیج پر عوام کا ہوسامنے وہ تب
اعلاء دین قوم کا ہو مطمح نظر
گو اس کے تحت قوم ووطن پر بھی ہو نظر

(سیرکشمیر، ص :۲۵)

قاری صاحب کی شاعری کی انفرادیت:-

قاری صاحب روایت اور انفرادیت کاایک محیرالعقول امتزاج ہیں ، ان کے یہاں ان تمام شعراء کا سلیقہ پایا جاتا ہے، جو ولی سے لے کر اقبال تک ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا رنگ ہے اپنی آواز ہے، وہ کسی دوسرے کے نہیں، اپنے دماغ سے سوچتے ہیں اوران کے سوچنے کا ڈھنگ اتنا انفرادی ہے کہ ان کی نظم ہزاروں نظموں کے ہجوم میں پہچانی جاتی ہے، اکثر ایک شک اور لطیف طنز ان کے اشعار کی دلکشی کودوبالا کرتا ہے، مثال کے طور پر :

مگر اس سے مقدم اپنی اولاد کی ہے اصلاح
اسی میں ہے بقائے دین اور اس کی تیز رو چالی
ہے پہلی شرط اس کی یہ کہ آباء خود بھی ہوں صالح
کہ نسلیں کرتی آتیں ہیں سرا آباء کی نقالی
نہوں جب تک کہ مادر اور پدر کر دار میں محتاط
توقع کیاکہ ذریات کاکردار ہو عالی

جو صالح بن کے عالم ہوں اور عالم بن کے ہوں عارف
اور ان سے پھر چلے اغیار تک یہ دولت عالی
یہ اصلاحی ترانہ ہے کہ جس کا کیف ہے کردار
نہ ہو وہ پھر تو بے کیفی کی ہے اک رسم قوالی
جو ظاہر کے عمل کی بود بھی نابوُد صورت ہو
تو پھر اصلاح ہے اک قصہ گوئی اور محتال
جو عمل نابود، علم اندر کتب اور ہوں کتب سر پر
تو عمال نہ ہوگی بلکہ خرباری وحمالی
نہ خرمن جائے انسان اور نہ حمالی اور قلی صورت
یہ کردار نہیں ہے، بار برداری وجمالی
رہے انسان انسان کی صورت وسیرت سے ہو انسان
بشر ورنہ نگلنے اوراگلنے کی ہے اک نالی
اگر کھائے، پیئے، سوئے، بڑھا کرنسل مرجائے
تو کیا یہ آدمیت ہے؟ کہ اس کے حق میں ہے گالی
بشر وہ ہے کہ عفت ہو، عبادت ہو، ریاضت
بحق خلق خدمت ہو نہ شر جولی واکالی

(سیر کشمیر، ص :۳۲)

آپ کی شاعری میں ''زبان روزمرہ'' کا استعمال:-

ایک نظم گو کے لئے سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہوتا ہے نظم کی اپنی زبان ہوتی ہے غزل کی اپنی، نظم کی زبان جتنی سلیس اور ڈھلی ہوئی ہوگی، اتنا ہی نظم کا جادو سر چڑھ کر بولے گا، اس کے برعکس، اگر وہ ثقیل اور غیر مانوس ہوگی، نظم گو طلسم باندھے میں ناکام رہے گا، قاری صاحب نظم کی زبان سے کما حقہ واقف ہیں، انہوں نے اکثر وبیشتر نظمیں اس زبان میں لکھی ہیں، جسے ''روزمرہ'' کہا جاتا ہے، اور جس میں خاص وعام اہل زبان تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

اکبر آلہ آبادی کی پیروی:-

قاری صاحب کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت اکبرالہ آبادی کی شاعری سے زیادہ متاثر تھے، اس وجہ سے ''عرفان عارف'' میں کئی نظمیں ایسی ملتی ہیں جو حضرت اکبرآلہ بادی کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی زمین اوراسی بحر میں قافیہ اورردیف بدل کر کہی گئی ہیں۔مثال کے طور پر اکبرالہ آبادی نے ایک قطعہ کہا ہے۔

دنیا نے کہا کہ کیسے چپکوں | عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں
چندا نے کہا کہاں سماؤں | کالج نے کہا توند ہوں میں

قاری صاحب نے اس قطعہ سے متاثر ہوکراسی زمین میں اوراسی بحر میں ایک دوسری نظر کہی ،جس میں مذہبی رنگ پیدا کر دیا ہے اور نظم کو بھی بڑا دلچسپ بنا دیا ہے، نظم ملاحظہ ہو۔

عصیاں نے کہا کدھر سے آؤں | شہوت نے کہا کہ راہ ہوں میں
فتنے نے کہا کہاں پہ اتروں؟ | غصے نے کہا پناہ ہوں میں
ذلت نے کہا کہ کیسے تاکوں | نخوت نے کہا نگاہ ہوں میں
دولت نے کہا کھپوں کہاں میں | بولی یہ ہوس کہ چاہ ہوں میں
شیطان نے کہا جموں میں کیونکر | عورت نے کہا نباہ ہوں میں
طغیان نے کہا مرا سہارا | دولت نے کہا کہ شاہ ہوں میں
ایمان نے کہا، بچوں میں کیوں کر | نیکی نے کہا سپاہ ہوں میں
فطرت نے کہا کہاں ہے عزت | تعلیم بڑھی کہ جاہ ہوں میں
عزت نے کہا کہاں سے ابھروں | بولا یہ عمل کہ راہ ہوں میں
ملت نے کہا کہ میں ہوں بدحال | کوشش نے کہا رفاہ ہوں میں

(عرفان عارف :ص ۱۱۷)

لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی نے ایک دوسری جگہ کہا تھا:

ایک ہی کام سب کو کرنے ہے　　یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج وراحت کی　　وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

اکبر جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ قدرے واضح نہیں ہے، قاری صاحب نے اسی زمین اوراسی بحر میں مزید اشعار کہے ہیں، جن کو بلاخوف تردید تتمہ کہا جاسکتا ہے۔

رہ گیا عزو جاہ کا جھگڑا　　یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
اب رہی بحث رنج وراحت کی　　وہ فقط وقت کا گزرنا ہے
قابل ذکر بھی نہیں خورد و نوش　　یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے
مقصدزندگی ہے طاعت حق　　نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے

(عرفان عارف :ص۱۲)

قاری صاحب دبستان نظم کے بانی:-

قاری صاحب نے نظم کوایک نئی جہت عطا کی ہے۔بلاشبہ ان کا شماراُن شعراء میں کیا جاسکتا ہے جووقتاً فو قتاً عُروسِ نظم کوسنوارنے کے لئے پیداہوئے ہیں۔اورجنہیں زمانۂ حال سے کہیں زیادہ زمانۂ مستقبل کا شاعر کہاجاتا ہے۔قاری صاحب نے ایک نئے دبستان کی داغ بیل ڈالی ہے انہوں نے اپنے ہم عصروں کے لئے نئی راہیں کھولی ہیں۔

حجاب مرد ہے غضِّ بصر شرمیلی آنکھوں سے　　زمانہ محفلوں سے مخفلوں سے رُوکشی باصبر تمثالی
نہ مل سکتی ہے مردوں کوسکینت بدنگاہی سے　　نہ زن کا ہے سکون بے پردگی آزاداَحوالی
حجاب طبقہ نسواں سے رکھی ابتداء اس کی　　اُنہی کی گود ہے پہلی معلم تربیت والی
اگر پہلاہی کالج ابتداء سے کج ادانکلے　　توکیاپائیں گے وسط وانتہایہ رتبۂ عالی
حیاء ان کی ہے تہذیب وتمدّن پارسائی ہے　　اسی میں ہے نہاں ان کے ہراک پہلوکی خوش حالی
اسی تہذیب حق کااک بڑاعنصر ہے یہ پردہ　　اسی پردہ میں ہے''رازِدروں'' کی پاک احوالی
وہ اس تہذیب حق کوپوری قوت سے کریں برپا　　نہ ہوخوفِ ملامت اورنہ حارج اس میں بدقالی

حسد سے بدکلامی ہوتو عزت میں نہیں حارج   کہ اس کے ڈر سے دائی چھوڑ بیٹھے دعوت عالی
یہ حاسد ہی کی ذلت ہے اور ہے محسود کی عزت   اور عزت وہ کہ جو تھی انبیاء کی سنت عالی

(جنون شباب ص۴۲۔۴۳)

کلام کی سلاست :-

رابندرناتھ ٹیگور نے ایک مرتبہ کہا تھا، آرکسٹرا کی مدد سے کسی دُھن کو پیش کرنا عظیم آرٹ نہیں کہلاتا۔ مزا تو جب ہے کہ صرف ایک ساز کی مدد سے کوئی ایسی دُھن پیش کی جائے جیسے سن کر سامع مبہوت رہ جائے قاری صاحب کے کلام کی سلاست اس بات کی شاہد ہے کہ انہیں صرف ایک ساز کی مدد سے دُھن پیش کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ عام طور پر بھاری بھرکم تراکیب یا عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتے، وہ اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ نظم اس نازک آبگینے کی طرح ہے جسے ایک سخت یا نامناسب لفظ بھی ناقابل تلافی ٹھیس پہنچا سکتا ہے۔ لب ولہجہ نہایت شائستہ ہو۔ سوقیانہ پن سے احتراز کیا جائے اگر مختصر ترین الفاظ میں اچھی نظم کہی جائے تو اس کا ہر شعر نشتر کی طرح دل میں اثر کرتا چلا جاتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کے والد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب علیہ الرحمۃ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند کی سعی سے جب دارالعلوم کا ماہانہ چندہ ڈھائی سو سے پانچ سو روپیہ ہوگیا اور آپ حیدرآباد سے دیوبند پہونچے تو اداء تہنیت اور تشکر کے لئے دارالعلوم میں ایک عظیم جلسہ منعقد ہوا جس میں حضرت قاری صاحب نے نظم پیش فرمائی اس کے چند اشعار:

بہارِ قاسم خیرات کی گل افشانی   ہے دیکھ دیکھ کے ازرنگ چمن نے چیں مانی
ہے فضل مبدأ فیاض سے یہ دو چشمہ   کہ جس کے سامنے آب حیات ہے پانی
نسیم فیض خدا سے ہے یہ وہ تازہ چمن   کہ جس کے آگے بہارِ ارم ہے کھسیانی
ہوتی ہے دیکھ کے اس باغ دیں کی رونق کو   چمن طراز بہشتِ بریں کو حیرانی
وہ لعل اُگلتے ہیں اس بوستاں کے نغمہ سرا   ہے جن کے سامنے اک خار لعل پیکانی
علوم دین کے طالب یہاں جو آتے ہیں   غذائے روح سے ہوتی ہے ان کی مہمانی

جہاں میں علم کے چشمے ہیں اور بھی جاری
مگر دکھائے تو اس کا ہمیں کوئی ثانی

نہ مصر میں ہے نہ یونان میں نہ ایراں میں
حدیث پاک کی ہے جو یہاں درخشانی

خدا کو کیوں نہ ہو محبوب وہ چمن میں زمزمہ سنج
حبیب حق کی حدیثوں کی ہو گل افشانی

یہاں سے جاتے ہیں ہو کر مہذب الاخلاق
ہزاروں سید و مرزاء و شیخ و افغانی

رہے جہاں میں جاری یہ چشمۂ قاسم
بقا پذیر ہے جب تک یہ باغ امکانی

(عرفان عارف : ص۔۱۶۵)

قاری صاحب کی شاعری میں ترتیب خیالات:-

قاری صاحب کو بات کہنے کا سلیقہ ہے اور ان کے کلام میں ترتیب خیال بھی ہے جو قطعہ بند غزل یا تسلسل غزل میں ہوتا ہے، اور ان کے جذبات وخیالات ایک ہی نہج پر بہتے ہیں، اس وجہ سے بھی اشعار میں تسلسل پیدا ہوتا ہے۔

سنی ہوگی مثل "رازدروں پردہ" کی سب نے
مگر رازدروں سے ذہن تقریباً ہیں سب خالی

اگر اس راز کی توضیح کی جائے تو حق یہ ہے
کہ یہ رازِ دروں امن وسکونِ دل ہے ہر حالی

اسی امن دلی میں خرمی کا راز ہے پنہاں
سکونِ دل سرورِ کل ہے امن دل ہے خوشحالی

رہِ دنیا کی ہر منزل کا مقصد ہے سکونِ دل
نہ حاصل ہو سکوں گر، زندگانی ہے تبہ حالی

ترقی کی بھی سب راہیں سکون دل میں ہیں مضمر
پراگندہ دلی میں ہے تنزل کی زباں حالی

سکون دل ہو عنقا اور دل جمعی کا میدان تنگ
تو میدان ترقی بھی پڑا رہ جائے گا خالی

سکون وامن دل پنہاں ہے دل کی پارسائی میں
جو تقوائے درونی ہے نبورِ وحی ارسالی

(جنون شباب۔ص : ۳۹۔۴۰)

قاری صاحب کا شاعرانہ تخیل:-

قاری صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ان کے حواس خمسہ ہمیشہ بیدار رہتے ہیں اور انہوں نے اپنی

نظراور عقل دونوں سے حیات وکائنات کا مشاہدہ کیا، کائنات کے اسرار ورموز تک رسائی کی کوشش کی اوراپنی اختراعی، اکتشافی قوتوں سے ایک نئے زاویہ نظر کی تشکیل کی اور بالکل جداگانہ طرز کے شعر کہے۔ شاعری میں فکروفن کے بلند مقامات طے کئے اور کبھی تخلیق کو مضمحل اوراحساس کو منجمد نہیں ہونے دیا۔ ان کی تخلیق میں جو رفعت اور بلند پروازی ہے، وہ کتنوں کو نصیب ہوئی ہے۔

قاری صاحب کی قوت مشاہدہ اورعرفانی بصیرت نے ان کی تخلیق کے رنگ کو دوسروں سے ممتاز کردیا ہے ان کا تخلیقی زاویہ مختلف ہے اور سوچ کا انداز بھی الگ ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اے زدوعالم ربودہ اے غفلت بے خبر
آنکھ دیجاتی ہے انسان کو پئے دیدونظر
دل عطا ہوتا ہے، تا ہوا امتیاز خیر وشر
عقل دیتے ہیں کہ تا ممتاز ہوں سود و ضرر
عبرتیں پیش نظر ہیں آنکھ صرف دیدکر
عقل سے پہچان دل کو کشتہ امید کر

اشک پیہم سرد کرسکتے ہیں نارِ رنج وغم — چیخ کربھی اورخموشی سے بھی روسکتے ہیں ہم
دردکی شدت مگر درماں سے بھی ہوتی ہے کم — اورسبکدل بھی بناسکتی ہے ہم کوچشم نم
فکر درماں کر مداوائے دل ناکام کر
بیٹھ مت رہ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر

کرب کے مٹنے کا زخمِ دردکے ابرام کا — توسمجھتاہے کہ درماں نام ہے آرام کا
کرنظارہ دہرکے اک انقلاب عام کا — دیکھ آنکھوں سے پلٹنا چرخِ نیلی فام کا
دردہی ہے آج درماں اورٹھنڈک سوز ہے
بے خودی ہی آج اک عقلِ ادب آموز ہے

(عرفان عارف : ص۔۱۶۷)

آپ کا طرحی کلام:-

قاری صاحب کے کلام میں فی البدیہہ طرحی کلام بھی ہے، جو آپ کے قادرالکلام ہونے پر شاہد ہے۔۹/ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ کو انبٹہ ضلع سہارنپور کے ایک سفر میں کسی دوکان پر ایک شعر پر نظر پڑی جس کا ردیف قافیہ تھا "ایمان نہیں تو کچھ بھی نہیں" اس پر اسی وقت اشعار موزوں کئے چند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہو مُوٗ میاں سب اپنی جگہ — اور قامت زیبا اپنی جگہ
اعضا کا تناسب اپنی جگہ — پر آن نہیں تو کچھ بھی نہیں
صورت بھی ہو اور رنگ بھی ہو — اور صاف بدن بے زنگ بھی ہو
پھر پیلتنی کا ڈھنگ بھی ہو — پر جان نہیں تو کچھ بھی نہیں
گو عشق بھی ہو اور یار بھی ہو — اور عشق دروں خوددار بھی ہو
پھر قرب بھی ہو دل دار بھی ہو — ارمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
الفاظ بھی چست اور خوب سہی — تقریر بھی سمع نواز سہی
پر اپنی درونی فطرت کا — رُجحان نہیں کچھ بھی نہیں

(سیر کشمیر: ص۔۶۲)

واقعاتی شاعری:-

قاری صاحب کا فکر وفن کچھ بالکل ہی جداگانہ ہے، نہ انہوں نے کسی کی نقل کی، نہ ان کی نقل کوئی کرسکتا ہے، ان کا اپنا ایک انداز ہے۔اپنی دُھن اور اپنا مزاج ہے۔باتوں باتوں میں دنیا کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرڈالتے ہیں۔ایک ستمگر کو بھری محفل میں ستمگر کہہ کر ہی ان کے دل کو تسلی ہوتی ہے میں نے دیکھا ہے قاری صاحب نظم کہتے ہیں کسی بڑے حادثے، کسی المناک سانحے، کسی ظلم ناروا، کسی دل ہلا دینے والے واقعہ کے زیر اثر یا اپنے اکابر کی مدح وسرا اور خیر مقدم میں۔سماجی ہیجان، دنیا کے ستم، انصاف کا خون اور انسانیت کی کمی دیکھ کر وہ تلملا اٹھتے ہیں اور اپنے دل کی دھڑکنوں کا جب کوئی

علاج نظر نہیں آتا تو نظم کہنے بیٹھ جاتے ہیں تا کہ کسی طرح تو رات کٹے!

قاری صاحب کی نظموں میں آپ ''گل وبلبل ''تو پائیں گے اور گیسو شانہ کا ذکر بھی ملے گا اور بہار وخزاں کا تذکرہ بھی۔مگران کے گل وبلبل، بہار وخزاں، گیسو وشانہ اور ساغر وساقی کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔پورے طور سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں ان کی نظموں کی تہہ تک پہنچنا ہوگا جس طرح موتی نکالنے کے لئے سمندر کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے۔مگران کی نظموں کو سمجھنے کے لئے زیادہ دماغ پر زور دینے کی بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ ان کی غزلوں میں بڑی سادگی ہوتی ہے۔الفاظ بہت عام فہم ہوتے ہیں، ہلکے پھلکے اشاروں میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔

قاری صاحب کی شاعری میں درد:-

ان کے یہاں درد بھی ملتا ہے اور اس کے اظہار کا طریقہ بھی منفرد ہے ملاحظہ فرمائیں اپنی اہلیہ کی وفات پر کہے گئے اشعار میں سے چند اشعار:

اے ساٹھ سالہ مونسِ جاں تو نہیں جب آج — ہونا مرا بھی خاک ہی ہوگا ترے بغیر
اے مونس حیات اگر تو نہیں حیات — جینا ہے پھر تو موت سے بدتر ترے بغیر
اے شمع بزم تجھ سے ہے خالی اگر یہ بزم — اندھیر ہے چمکتی یہ دنیا ترے بغیر
اے گل بہار جب نہیں گلشن میں سیر گل — رنگ خزاں ہے روئے گلستاں ترے بغیر
گل ہی نہیں تو سیر چمن کا ہے گل چراغ — سیر چمن نہیں تو چمن کیا ترے بغیر
مالی بھی ہے، چمن بھی ہے ، باد بہار بھی — روحِ بہار پر نہیں ملتی ترے بغیر
طرز سخن ہر ایک کے دل کو جو موہ لے — مسحور کن کلام کہاں اب ترے بغیر
وہ ترے دردِ پاک کے اوراق اور صُحُف — ان کا ورق ورق ہے پریشاں ترے بغیر
کوئی بھی ہندوپاک کا ایسا نہیں مقام — جس میں سفر کی گشت ہوئی ہو ترے بغیر
طوفان تھا غموں کا دلوں میں چھپا ہوا — اُبھرا، مگر ابھر نہ سکا کچھ ترے بغیر
اب تو نہیں تو لطف نہیں زندگی میں کچھ — جب تو نہیں تو کون ہو مونس ترے بغیر

(جذبات الم ص ۲۷-۲۸-۲۹)

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قاری صاحب کی شاعری واقعاتی ہے، آپ کسی حادثہ یا واقعہ سے متاثر ہوتے ہیں اور دل ہلکا کرنے کے لئے اس واقعہ کی نقشہ کشی ، اس کی دوا اور امت مسلمہ کو درپیش خطرات سے آگاہ کردیتے ہیں

اسلم رمزی صاحب لکھتے ہیں۔

> ''آپ کی شاعری ، شوق شعرگوئی کے بجائے
> واقعات وحادثات پر ذہنی تأثر حقیقی جذبات اور تبادر
> ذہنی پرمبنی ہے ان تمام نظموں کے محرکات جماعت
> دیوبند یا اپنے خاندان میں پیش آنے والے اہم
> واقعات وتقریبات یا حادثات ہیں جن سے
> متأثر ہوکر جذبات نے جامۂ شعر اختیار کرلیا ہے''

(مقدمہ عرفان عارف : ص:۸)

مرثیہ گوئی:-

مرثیہ گوئی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انسان کو خوشی اور غم کے احساسات قدرت نے جب سے بخشے ہیں میں سمجھتا ہوں مرثیہ کی ابتداء بھی وہیں سے ہوئی ہے۔ البتہ اتنی بات تو حق بجانب ہے کہ انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں مرثیہ گوئی مستقل صنف یا اصطلاح نہیں تھی، ہر انسان اپنے دکھ درد کا اظہار اپنے شعور اور علم کے مطابق کرتا تھا۔ اس کے لئے ان کے پاس خاص الفاظ نہیں تھے، دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ مرثیہ نظم کی صورت میں نہیں تھا بلکہ اس کی ابتدائی صورت نثری تھی، بہت بعد میں مرثیہ کی شکل منظوم ہوئی ہے۔

تاریخ کے اوراق پلٹیں تو عرب کا معاشرہ، ماحول، مرثیہ گوئی کی نشاندہی کرتا ہے اور تقریباً اتنی ہی مدت فارسی زبان میں مرثیہ گوئی کی رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو زبان بہت بعد کی زبان ہے، لیکن اردو ادب میں نظم کی سب سے قدیم صنف، جس کا اب تک پتہ لگا ہے، مرثیہ ہے۔ دکن کی طرح شمالی ہند میں بھی اردو شاعری کی تاریخ مرثیہ سے شروع ہوتی ہے۔

مرثیہ گوئی میں واقعہ کربلا:-

یہ سچ ہے کہ اردو میں مرثیہ گوئی شروع ہونے سے کہیں پہلے عربی اور فارسی میں واقعہ کربلا کے متعلق سیکڑوں مرثیے کہے جاچکے تھے۔مگر اردو مرثیے کو ان سے صرف دور کا تعلق ہے۔عربی، فارسی اور اردو مرثیوں میں اگر کوئی چیز مشترک ہے تو وہ صرف مرثیے کا بنیادی موضوع ہے اور اسی اشتراک موضوع کے باعث بعض جزئیات میں اشتراک نظر آتا ہے۔

اردو مرثیے میں وہ وسعت و جامعیت ہے کہ اس کے سامنے شاعری کی دوسری صنفیں محدود نظر آتی ہیں۔ابتداء میں مرثیے بھی بہت مختصر ہوتے تھے۔ان کے مضامین بھی محدود تھے اور ان کا حلقۂ اثر بھی محدود تھا۔وہ شکل میں زیادہ تر غزل یا قصیدے سے مشابہ ہوتے تھے اور انہیں اصناف نظم کی طرح ان میں کلام کا تسلسل بالکل نہ ہوتا تھا یا محض برائے نام ہوتا تھا۔ان غیر مربوط اشعار میں کربلا کے مختلف واقعات کی طرف اشارے ہوتے تھے۔کوئی واقعہ تفصیل وتشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا تھا، حسن تخیل اور حسن بیان کی ان میں اتنی کمی تھی کہ وہ نظم کی حد سے گزر کر شاعری کی منزل تک مشکل ہی سے پہنچ سکتے تھے۔

مرثیہ گوئی کا ارتقاء:-

ایک زمانہ کے بعد مرثیہ کا دامن کچھ وسیع ہو گیا اس میں واقعات کربلا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہونے لگے اور حسن ادا کی سحر کاریوں کو بھی جگہ ملنے لگی۔مرثیے کی اس ترقی میں مسکینؔ، سکندرؔ اور میرؔ کا خاص حصہ ہے۔جب شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو گیا تو یہاں کے حالات مرثیے کی ترقی کے لئے زیادہ سازگار تھے۔ایک طرف مرثیے کے موضوع میں وسعت ہوئی، دوسری اس کی شکل میں تبدیلی بھی ہوئی کہ وسیع اور مخمس اور مخمس سے مسدس ہو گیا۔مرثیے نے ترقی کی یہ منزل احسانؔ، افسردہؔ اور گداؔ کی رہنمائی میں طے کی۔

مرثیہ کے اس ارتقائی دور میں لکھنؤ کی سرزمین، پر چار اساتذہ فن موجود تھے۔فصیحؔ، دلگیرؔ، خلیقؔ اور ضمیرؔ ان حضرات کی کوششوں اور محنتوں سے مرثیہ کو ایک بلند صنف کا مقام ملا اور ان حضرات نے

اتنے مرثیے کہے کہ ایک ایک کے کلام سے کئی کئی جلدیں بھر جائیں۔ مرثیہ کو ان ارتقائی منزلوں کی انتہاء تک پہنچانے میں ضمیرؔ کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ ضمیر کے بعد ان ہی کے شاگرد انیسؔ ہوئے کہ لوگ ان کی وجہ سے ان کے استاد کو بھول گئے۔ انیسؔ نے مرثیہ کا پایہ اس قدر بلند کیا کہ اس کے سامنے شاعری کی دیگر صنفیں بے حقیقت نظر آنے لگیں۔

قاری صاحب اور انیسؔ :-

شاعری جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، وجدان کی تعبیر ہو یا حیات کی، تخیل کی جولان گاہ ہو یا محاکات کی، اس کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکون قلب کی تکمیل ہو یا کسی پیغام کی تبلیغ، مختصر یہ کہ شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں، اس کے جو محاسن قرار دیئے گئے ہیں، اس کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں، ان سب کے اعتبار سے انیسؔ کے مرثیوں کا شمار اعلیٰ درجہ کی شاعری میں ہوتا ہے۔

انیسؔ نے مرثیے کی زبان کو بھی بہت وسعت دی، ہزاروں لفظ، محاورے اور ترکیبیں وغیرہ جو صرف اہل زبان کی بول چال میں آتے ہیں، انہیں اس خوش سلیقگی سے برتا کہ وہ شاعری کی زبان کا جز بن گئی۔

اس طویل بحث کا مقصد اتنا ہے کہ قاری صاحب نے بھی مرثیہ گوئی کی ہے اور اگر ہم اس میں غور کریں تو ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے مرثیہ گوئی میں انیسؔ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔

قاری صاحب نے مرثیہ گوئی میں ایسے بہت سارے الفاظ، محاورے اور ترکیبوں کا صحیح استعمال کر کے زندہ جاوید بنا دیا جو علاقائی زبان میں مستعمل تھے اور عام شعراء ان کو استعمال کرنا اپنے لئے باعث شرم سمجھتے تھے۔

قاری صاحب نے دیگر اصناف کے ساتھ مرثیہ گوئی پر بھی توجہ دی ہے، بلکہ ہمارے خیال میں قاری صاحب کی شاعری کا اکثر حصہ مرثیہ گوئی پر ہی مشتمل ہے۔ ہم گذشتہ اوراق میں واضح

کر چکے ہیں کہ قاری صاحب کی شاعری، واقعاتی شاعری ہے، آپ کی شاعری، شوق شعر گوئی کے بجائے واقعات و حادثات پر ذہنی تأثر حقیقی جذبات اور تاثرات پر مبنی ہے۔ قاری صاحب نے مختلف مرثیے کہے ہیں، ان میں سب سے طویل مرثیہ "جذبات الم" ہے جو آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وفات پر لکھا ہے، اس کے کچھ اشعار ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، چند اشعار یہاں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

تیری سعادتوں نے شہادت کو پا لیا
بے تاب ورنہ رہتی شہادت ترے بغیر
سر پر تجھے اٹھایا تھا ارباب علم نے
یہ عز و افتخار کہاں تھا ترے بغیر
سینہ سے ہم لگائے ہوئے بیٹھے ہیں غم ترا
غم ہی ترا ہے تری جگہ اب ترے بغیر
حاصل تجھے ہوں برزخ و محشر کی راحتیں
بے جان زندگی ہے کہ ہم ہوں ترے بغیر

(جذبات الم ۔ص ۳۲)

اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر آپ نے "ارمغان اجلاس صد سالہ" کے نام سے ایک منظوم کتابچہ ترتیب دیا تھا جس میں تقریباً پچاس اساتذہ و مشائخ کے مرثیے کہے گئے ہیں۔

آپ کی شاعری میں مدح سرائی:-

آپ کے یہاں اکابر کی مدح سرائی بھی ہے لیکن درجہ اعتدال میں اکابر کی خدمات اور ان کی داخلی اور خارجی زندگی کے خدوخال کو اچھے انداز سے واضح کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں حضرت شیخ الہند کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔

حمید خلق محمود زمانہ
بقلم قاسمی فرد یگانہ

بشیخ الہند معروف اور مشہور
زمانہ جن کی خوشبو سے ہے مخمور

محدث اور مجدد اور مجاہد
بہ دنیائے دنی بے مثل زاہد

شراب جاہدوا فی اللہ سے مست
غنی از وہم وفکر نیست اور ہست

معلم از علوم ذات سبحاں
رشید ومرشد از انوار احساں

نمونہ قاسمی علم وعمل کا
بامدادی رشیدی رُشد کل کا

خزینہ علم اسرار نبی کا
کما ل حسن اخلاق ولی کا

تواضع سے عیاں ذوق کہی تھا
فقیری میں نہاں فر شہی تھا

تھی انگریزوں سے اس درجہ عداوت
کہ جس درجہ میں تھی دینی محبت

(ارمغان اجلاس صد سالہ۔ص:۱۷)

قاری صاحب کا نمونۂ فارسی کلام:-

قاری صاحب کا کلام اردو فارسی اور عربی تینوں زبان میں ہے لیکن کلام کی بنیادی خصوصیات ہر زبان میں یکساں نظر آتی ہیں جس سے اس حقیقت کا اندازہ بہت واضح طور پر ہوجاتا ہے کہ ان تینوں زبانوں پر آپ کو مضبوط دستگاہ حاصل ہے اور مضامین کی آمد وروانی اردو کی طرح عربی اور فارسی میں بھی حیرت انگیز طور پر یکساں ہے آپ کے مجموعہ کلام میں متعدد فارسی نظمیں اور متفرق اشعار موجود ہیں ان کی نظم ''خروش جگر'' کا پہلا بند جو درج ذیل ہے فارسی کلام کا ایک بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے، یہ نظم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی وفات پر لکھی گی ہے ملاحظہ ہو۔

سراپا سوزش عشقم ، سراپا چشم گریانم
طلاطم ہائے پایاں بیں در موج طوفانم
نہ امیدے بدل دارم بہ فیض نا امیدیہا
نہ حرماں آرزو دارم کہ خود تصویر حرمانم
زہستی صورتے دارم ہیولائش عدم باشد

زسوز برق تکوینم زبرق سوز امکانم
کجا دل چوں زدل ارمان دل از دست بیروں شد
شہہ عبد الرحیم رائے پوری بود ارمانم
نہ تنہا رفت آں جان جہاں از عالم خاکی
رواں شد ازپس او حسرت وامید وارمانم
بہ بیں دربے سروسامانی من صورت ساماں
فغاں وگریہ وسوز گداز وآہ سامانم
بمرات دلم تصویر جاناں جلوہ آراشد
ببیں اعجازِ الفت دردل آخر مسیحا شد

(عرفان عارف : ص۔۱۷۲)

دارالعلوم پر فارسی نظم:۔

''فکر حزیں'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جو دارالعلوم اور بانیان دارالعلوم دیو بند کے سلسلہ میں ہے اس کے اخیر کے دعائیہ اشعار لائق توجہ ہیں۔

خداوندا بایں مردانِ میداں
کن انجام من بر خیرواحساں
بکام ِ نفس ِ خود مشغول ہستم
زیاد و ذکر تو معزول ہستم
زمانہ شد بعیش وکامرانی
ندارم ہیچ زادِ جاودانی
نصیحت گوش کن اے نفسِ دوں کیش
حذر کن بنگر اندر رہ پس وپیش

بیابشنو کہ دنیا بے ثبات است
جہانے دیگر از بہر حیات است
بسا کس اندر یں رہ پانہادند
بآخر سر نہادہ یا نہادند
نگہ کن بر شہانی ِ آسمانی جاہ
نہ بر دند از جہالی جز حسرت وآہ

(عرفان عارف : ص۔۱۷۳)

آپ کے فارسی کلام میں نظم ''ہست ونیست'' بھی ایک شاہکار نظم ہے جس میں ہر شعر کے آخر میں ہست ونیست کو جمع کر کے جمع بین الاضداد کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے۔

عربی کلام:-

عربی کلام پر بھی آپ کو پوری قدرت حاصل تھی، آپ کے مجموعہ کلام میں عربی نظم "نونية الاحاد" ایک بہترین نظم ہے، مولانا ابوالقاسم نعمانی۔ مذکورہ نظم کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

''اتحاد امت کا یہ تذکرہ دراصل علامہ جلال الدین سیوطی کی تحریر سے ماخوذ ہے، علامہ سیوطی نے علامہ ذہبی کی ایک تحریر سے لے کر اپنی مشہور زمانہ کتاب ''تاریخ الخلفاء'' میں درج کیا ہے''۔

(مضمون مشمولہ مظلوم شخصیت ۳/۳۶۹)

ضیافت طبع کے لئے عربی نظم کے متفرق اشعار پیش کرتے ہیں جس کا عنوان '' قاسم العلوم والخیرات'' ہے وہ بھی قدیم عربی ادب کی یاد دلاتی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

نفسی الفداء لقاسم الخيرات
وبــــــمـــــــه
جنتي افدي لذي البركات

فیضـانــه بـالـعـلـم عـم بحـاره
مـاواه عـنـد الـلــه فــی الـجـنـات
اولـــیٰ الاعــــاظـم رتبة وكــرامة
اعـلــیٰ الامــاجـد قـامع البدعـات
سبـاق غـايـات المكارم فی الحياة
مــويـد ـة من رافـع الـدرجـات
شـمس الذكاطود العلى زين الهدى
كهف الــورى بــكـرامة الـدرجـات
شيــخ الامة مــقتــدى الاعـــلام
صدر الاجـلــه قبلة الـحـاجـات
سـلـطـان اصحاب الحقائق بالعلیٰ
شيخ الـمشـائـخ زبـدة الحسنـات

(مشمولہ مظلوم شخصیت۔۳/۳۷۰)

منظوم خراج عقیدت :-

علماء وادبی دنیا نے قاری صاحب کو ہمیشہ سراہا ہے اور خراج عقیدت پیش کیا ہے، میرا دل چاہتا ہے میں خراج عقیدت پیش کرنے والے حضرات کے تاثرات کے کچھ منظوم نمونے پیش کروں۔ چنانچہ شمیم دیوبندی صاحب نے اس طرح مخاطب کیا ہے کہ۔

دل شکستوں کا مسیحا نہ رہا تیرے بعد ۔۔۔ سرخرو ہوگی نہ شمشیر جفا تیرے بعد
تیری گفتار میں تھی جوہر کردار کی آب ۔۔۔ یاد آئے گا سدا تیرا کہا تیرے بعد
سنت عیسیٰ و منصور تھی زندہ تجھ سے ۔۔۔ کوئی مصلوب محبت نہ ہوا تیرے بعد

سید فگار غازی سکروڈوی کے تاثرات:-

اٹھ گیا علم وعمل کا ایک دفتر ہائے ہائے ۔۔۔ یادگار قاسم و محمود و انوار ہائے ہائے
آج وہ خورشید عالمتاب آخر چھپ گیا ۔۔۔ جس سے روشن تھے ہزاروں ماہ واختر ہائے ہائے
ایک سناٹا ہے اب حسن عمل کی راہ میں ۔۔۔ قافلہ میں اب نہیں طیب سا رہبر ہائے ہائے

ساحل دیوبندی مرحوم کے تاثرات :-

ہوگئی ہے ختم اب تو زندگانی کی بہار اشک ہیں آنکھوں میں اب ہم مسکرا سکتے نہیں
شدت غم نے ہمیں مجبور ایسا کردیا دل پہ جو گزری ہے اس کو بھی بتا سکتے نہیں

عبدالمجید انور ملتانی کے تاثرات :-

اشک فشاں ہے زمین، نوحہ کناں ہے آسماں آہ ٹوٹی جو مصیبت ہوسکتی نہیں بیاں
ظلمتیں ہی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں ہر طرف رو رہی ہیں خون کے آنسو شفق کی سرخیاں

مولانا معظم حسین قاسمی ساہیوال کے تاثرات :-

حاصل اوصاف ایسا اب کہاں پائیں گے ہم کس کی تقریروں سے اب محفل کو گرمائیں گے
حضرت نانوتوی کے فن کے شارح السلام ہے معظم کی دعاء ادخلہ فی دار السلام

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط کے تاثرات :-

فخر ملت شمع حکمت، مقتدائے ما، امام لائق مدح و ستائش صاحب حسن انتظام
جانشین شیخ انور شاہ، تلمیذ رشید حامل انوار اشرف در جہاں دُرّ فرید

مولانا نسیم غازی کے تاثرات :-

آج تاریکی میں کیوں ڈوبا ہے شہر دیوبند چھپ گیا اے دوستو! شاید کہ مہر دیوبند
چھپ گیا ہاں آج وہ خورشید تاباں چھپ گیا جس کی کرنوں سے درخشاں تھا گلستاں چھپ گیا

(مشمولہ مظلوم شخصیت۔۳/۴۲۶)

ان کے علاوہ نہ جانے کتنے معتقدین نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا، تنگی کے باعث شامل نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصۂ کلام:

خلاصہ یہ ہے کہ آخر حضرت قاری صاحب ۶ شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ہم

سے جدا ہو گئے۔ (پس مرگ زندہ۔ص:۱۷۳) آپ کی شخصیت نے تقریباً نو دہائیاں اس عالم کو منور کیا، تقریباً چھ دہائیوں تک دارالعلوم دیوبند جیسی مرکزی درسگاہ کا انتظام وانصرام دیکھا۔ آپ نے اپنے پیچھے تین صاحبزادے چھوڑے۔ (۱) مولانا سالم صاحب (۲) مولانا اسلم صاحب (۳) مولانا اعظم صاحب، اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں۔

آپ کی زندگی کا اکثر حصہ اسفار میں گزرا، تبلیغ کے لئے آپ دنیا کے تینوں بڑے برّ اعظم تشریف لے گئے، آپ اس وقت تک جدوجہد کرتے رہے جب تک صاحب فراش نہ ہو گئے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی تقسیم کا واقعہ پیش نہ آتا تو امید تھی کہ آپ کا ادبی سفر جاری رہتا۔ اسی واقعہ نے آپ کے ذہن کو بے پناہ متاثر کیا جس سے سب سے زیادہ ادبی دنیا کا نقصان ہوا۔

قاری صاحب کے شعری مجموعہ ہمارے سامنے ہیں ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

عرفانِ عارف:۔

اس مجموعہ میں ستاون نظمیں ہیں جن میں پانچ عربی، بارہ فارسی، اور چالیس اردو نظمیں شامل ہیں، جن میں بیشتر نظمیں طویل ترین نظمیں ہیں، بالخصوص ''آنکھ کی کہانی'' کے دو حصے جو سات سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہیں۔

اس مجموعے کی پہلی اشاعت ۱۹۶۷ء میں کتب خانہ قاسمی دیوبند سے ہوئی، اس مجموعہ کے مرتب اسلم رمزی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعے میں حضرت مدظلہ کے زمانہ طالب
> علمی سے لے کر اب تک تقریباً تمام واردات قلبی
> جمع کر دیئے گئے ہیں۔''

(مقدمہ عرفان عارف ص:۹)

جذباتِ الم:۔

اس مجموعہ میں کل اشعار ایک سو گیارہ ہیں یہ ان اشعار کا مجموعہ ہے جو قاری صاحب نے اپنی

اہلیہ کی وفات پر کہے ہیں اس مجموعہ کا ہر ایک شعر درد کی عکاسی کرتا ہے، اس مجموعہ کو ادبی صنف مرثیہ کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے، حتی کہ قاری بھی نم دیدہ ہو جاتا ہے، اس کی پہلی اشاعت ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔

جنونِ شباب :-

اس مجموعہ میں کل تین سو پانچ اشعار ہیں، یہ مجموعہ امریکہ کے بعض حوادث وواقعات کے سلسلے سے امریکی اقوام کی تہذیبی اور تمدنی حالات امریکہ میں اقامت گزیں مسلمانوں کی معاشرتی کیفیات اور ان کے پیش نظر اسلامی احکامات اور دعوت واصلاح کا پیغامات کا ایک منظوم مرقع ہے اس مجموعہ کی مزید حقیقت قاری صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

> ''اس تک بندی کا ابتدائی حصہ تو امریکہ کی کالی عورت اور ایک گورے مرد کی نقشہ کشی سے متعلق ہے جو اپنی نوعیت سے یقیناً انتہائی مذموم اور ناقابل ذکر تھا مگر اس نظم کا محرک ہی چونکہ یہ واقعہ بنا اس لئے اس کا ذکر کیا جانا ناگریز تھا اور آخر کا نصف سے زائد حصہ وعظ و پند دینی ہدایات شرعی اخلاق واعمال کی ترغیب، حفاظت حیا وعفت بالخصوص حجاب نسواں تعلیم دین اور دعوت وتبلیغ کی ضرورت واہمیت پر مشتمل ہے جس میں بہت سے دینی حقائق بھی آگئے ہیں''۔

(مقدمہ جنون شباب ص:۸)

اس مجموعہ کی پہلی اشاعت ۱۹۷۸ء کو کتب خانہ قاسمی سے ہوئی۔

ارمغانِ صد سالہ:۔

اس مجموعہ کے کل اشعار آٹھ سو پچاس ہیں۔ یہ مجموعہ گویا دارالعلوم اور اس کے اکابر کا منظوم تذکرہ اور مرثیہ ہے یہ اشعار قاری صاحب نے صد سالہ کے موقع پر کہے تھے۔

دعانامہ تہنیت شامہ:۔

اس میں کل ایک سو چھپن اشعار ہیں گھر میں چند بچوں کی شادی کے موقع پر یہ اشعار کہے گئے ہیں۔

اس کی اشاعت ۱۹۷۸ء کی ہے۔

اس مجموعہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خدا کی حمد حرف اولیں ہے — نبی کی نعت نقش آخریں ہے
عزیز اسلم کی شادی کا ہے چرچا — کہ شاداں ہر کہیں و ہر مہیں ہے
ہے اس شادی بہجت کچھ عمومی — کشش ہر دل میں اس کی جاگزیں ہے
زہے قسمت ہے خِطبہ رونخطبہ — نوید رشتہ شادی سے قریں ہے
رواں ہے قافلہ شادی خوشی کا — ہر اک دل جوش فرحت سے قریں ہے
نگاہ دیوبند دلی پہ ہے آج — کہ اس کے دل کی جمعیت یہیں ہے

(دعانامہ تہنیت۔ص:۳)

اس تہنیت نامہ کے آخر میں قاری صاحب نے دولہا اور دلہن کیلئے دعا کی ہے جو لائق توجہ ہے۔

رہیں دلہا دلہن باعیش دائم — یہی اپنی مراد اولیں ہے
رہیں زوجین گھل مل کر کہ یہ عقد — مثال خلط شیر و انگبین ہے
رہے ان کا ہمیشہ بول بالا — تری چوکھٹ پہ جب ان کی جبیں ہے
حیات طیبہ سے ہوں یہ سرشار — کہ جس کا نہج نہج صالحیں ہے

حنفیت انہیں دے جس کا تمغہ | نوائے لا اُحبُّ الاٰ فلیں ہے
خدا یا دے انہیں حسن معیشت | جو کارِ انبیاء و متقیں ہے
انہیں پھر ایک سے اکیس کردے | کہ تیرے یاں کی کچھ بھی نہیں ہے
حفاظت ہو تری ان سب کو شامل | کوئی خطرہ نہیں جب تو معیں ہے
رہیں یہ سب کے سب دلشاد و آباد | دعا یہ اولیں اور آخریں ہے

(دعا نامہ تہنیت۔ص:۹)

سیر کشمیر :-

یہ قلمی مسوّدہ ہے اس کی ابھی اشاعت نہیں ہوئی ، اس کا فوٹو مفتی سعید الظفر رام پوری معین المدرس دارالعلوم دیوبند کے پاس ہے ہم نے اسی سے استفادہ کیا ہے اسکے کل اشعار پانچ سو پچیس اشعار ہیں دراصل یہ کشمیر کا منظوم سفر نامہ ہے جو قاری صاحب نے اوائل جون ۱۹۷۳ء میں کیا تھا اس میں کشمیر کے تفصیلی حالات کا تذکرہ ہے ، اوران کو مستقبل کے لئے صلاح ومشورہ بھی دیئے گئے ، اس کے آخر میں قاری صاحب کے دستخط ہیں ، اور ۳/ جون ۱۹۷۳ء کی تاریخ درج ہے۔

قاری صاحب مرحوم نے کشمیر کی آب وہوا کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

آب رواں کے چشمے ہیں نہروں کے روپ میں | ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں سورج کی دھوپ میں
برفانی آب اور ہوا مشک بیز ہے | بر دو سلام کی یہ فضا لطف خیز ہے
آب و ہوا کا اس کی صحت سے ہے سازباز | آپس میں جیسے دونوں ہوں ہم زاد و ہم نژاد
ہر ایک اس ہوا سے ہے گل اور گلبدن | روئیں تنی کا نام نہیں سب ہیں سیم تن
آسودگی و عیش رواں یاں کا ہے مزاج | ہر غم کا ہر الم کا نہاں جس میں ہے علاج
ہر اک ادا نے حسن سے پایا ہے امتزاج | اک اک ادا نگہ سے طلب کرتی ہے خراج

(سیر کشمیر۔ص:۲۰)

مغلوں کا دور:-

قاری صاحب کے اس منظوم نامے کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کشمیر اور اہل کشمیر کی خصوصیات' ماحول' اخلاق اور ان کے شب وروز کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تاریخی مرجعیت کو آشکارا بھی کیا ہے۔ آپ نے مغلوں کے دور کی بھی نقشہ کشی کی ہے اور عہد برطانیہ کی ترقیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح یہ منظوم سفر نامہ کشمیر اور اہل کشمیر کے لئے بڑی اہمیت کا حامل اور تاریخی چیز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ''مغلوں کا دور'' قاری صاحب کی زبان میں:

مغلوں کو ان کے عہد میں گرویدہ کرلیا　　حسن فزوں سے عاشق نادیدہ کرلیا
کشمیر اک تو تھا ہی ازل سے گلوں کا گھر　　مغلوں نے اس کو اور ہی کچھ کردیا مگر
باغات کیا بنائے کہ زینے چڑھادیئے　　ہر تہ پہ اک قرینہ سے گلشن جمادیئے
ہر سیڑھی ایک باغ ہے ہر درجہ اک چمن　　ہر طبقۂ چمن کی نرالی ہے اک پھبن
آغاز ہے زمیں سے تو انجام تا فلک　　ہے بوئے خوش کی اس سے بھی آگے تلک مہک
چشموں کو گرد باغوں کے ایسا گھمادیا　　ہر باغ کو مثال سفینہ بنادیا

(سیر کشمیر۔ص:۱۵)

نسبت قاسمی:-

یہ بھی قلمی مسودہ ہے جن کا نمونہ فوٹو مفتی سعید الظفر صاحب کے پاس ہے اس میں کل ایک سو اٹھتر اشعار ہیں، یہ اشعار ۱۶/ جون ۱۹۷۵ء سے ۳/ جون کے درمیان بہار کے سفر کے دوران کہے گئے ہیں یہ مجموعہ مولانا قاسم نانوتوی اور دارالعلوم دیوبند اور نسبت دارالعلوم کے سلسلے میں ہے۔

قاری صاحب نے اپنی اس طویل نظم میں '' نسبت قاسمی'' کی جو وضاحت کی ہے وہ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالٰی نے خاندان قاسمی کے اس فرد میں قاسمیت کی تفہیم اور ترجمانی کی جو صلاحیت رکھی تھی وہ کسی دوسرے کے حصہ میں نہیں آئی۔ نسبت قاسمی کے سلسلہ میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نسبت قاسمی اَحْسنتَ کہ ہنگامۂ دین | از تو گرم است بدوراں چہ دفاع و چہ ہجوم
نسبت قاسمی اَکْرِمتَ کہ دین فطرت | از تو پیدا است بہر دل چہ عدول و چہ ظلوم
نسبت قاسمی اَعْدَلتَ کہ عدل اسلام | بری از فُرط و فُرط گشتہ ز تو شد معلوم
نسبت قاسمی اَبْصَرتَ کہ فکر انجام | از تو شد در دل عالم ز بصیرت مفہوم
نسبت حلم و حیا نسبت الطاف و غنا | نسبت مہر و وفا نسبت عون مظلوم
نسبت صبر و توکل زرہ صدق و عفاف | نسبت رحم و صلہ نسبت کسب معدوم
نسبت جود و سخا نسبت احسان و عطاء | نسبت داروئے حرماں پئے درد محروم
انکسار و ادب و عجز و تواضع للہ | نسبتے آنکہ مبرا ست ز کبر مذموم
آمدی نسبتِ جامع بہمہ نوع کمال | از تو قاسم و علوم از در قاسم مقسوم

(نسبت قاسمی۔ص:۱)

مناقب قاسمی:۔

نسبت قاسمی کو بیان کرنے کے بعد آپ نے مناقب قاسمی کو بیان کیا ہے اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

قاسم بزم ھدی قاسم علم و عرفاں | تاکشودہ بمفاتیح کرم قفل فُھوم
قاسم از سمّی ابن رسول اکرم | یافت میں اسم نصیبش ز حدیث معصوم
قاسم حکمت اسلام بانداز غریب | عقل و امادہ ز حیرت شدہ مبہوت مفہوم

(نسبت قاسمی:ص:۳)

نوید مسرت:۔

یہ قلمی مسوّدہ ہے جس کا فوٹو مفتی سعید الظفر صاحب کے پاس ہے اس میں کل ۵۹/اشعار ہیں، یہ ایک بچے کی پیدائش پر کہے گئے ہیں، اس پر ۲۱/دسمبر ۱۹۷۲ء کی تاریخ درج ہے۔

ابن سعید:۔

یہ ۶۳ اشعار کا مجموعہ ہے اور ایک تقریب کے اشعار ہیں اس پر ۳/ذی قعدہ ۱۳۹۳ء کی تاریخ درج ہے۔

اس طویل کا وہ حصہ ملاحظہ فرمائیں جس میں دعا دی گئی ہے۔

رحمت حق کی گھٹاؤں سے سدا آب حیات — اس پہ برسے اور برستا ہی رہے پھر بار بار
راحت تن، راحت دل، راحت روح و رواں — راحتیں ماحول کی ہر سمت ہوں بے خلفشار
علم نافع، خلق عادل اور عمل صالح بہم — دین راسخ اور تدین میں ہمیشہ پختہ کار
ذہن سامی، طبع عالی، عزم اور ہمت بلند — صحت قوۃ دوچند اور ذات ہو عالی تبار
خلق میں شامل بھی ہو اللہ سے واصل بھی ہو — رب کا ہو طاعت شعار اور خلق کا خدمت گزار
دل میں ہو دولت غناء کی اور شرح صدر ہو — ہو امیروں سے غنی اور بے کسوں کا غمگسار

(نوید مسرت۔ص:۳)

قالولا :-

اس میں کل ۳۸/اشعار ہیں جو بمبئی میں پرسنل لاء بورڈ کے قیام کے وقت کہے گئے ہیں، اس پر یکم فروری ۱۹۷۳ء درج ہے، اس کا فوٹو مفتی سعید الظفر کے پاس ہے۔

قاری صاحب نے اس مٹینگ کو جس انداز میں منظوم کیا ہے وہ اردو ادب کا بے مثال ذخیرہ ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ میٹنگ کی واقعاتی شکل کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عجب میٹنگ تھی اک بمبئی میں پرسنل لاء کی — کہ جس کا ہر قدم پر ایک ہی نعرہ تھا قالو لا
نفی چھائی رہی اثبات پر اول سے آخر تک — نعم کا ناطقہ تھا بند۔ ناطق تھا قالو لا
اس پر بندش لا تھی نعم تھا کان کا دشمن — نعم آواز طوطی اور نقارہ تھا قالو لا
عمل ہو، جوش ہو، جذبہ ہو نظم پرسنل لاء کا — سب ہی کے سر پہ تھی لٹکی ہوئی شمشیر قالو لا
عمل آئے تو قالو لا، نظام آئے تو قالو لا — زبان اٹھے تو قالو لا، جو دل ابھرے تو قالو لا

(قالولا۔ص:۱)

اہل دنیا اور اہل دین:۔

اس میں کل ۵۳/ اشعار ہیں یہ مسودہ ہے اور اس کا فوٹو مفتی سعید الظفر صاحب کے پاس ہے ، چند لوگوں کی طرف سے قاری صاحب کو تکلیف پہونچی تو یہ اشعار کہے، اس پر ۱۳۹۶ھ کہے تاریخ درج ہے۔

چند اشعار پیش خدمت ہیں:

اٹھتے جاتے ہیں اہل فضل و کمال ۔۔۔ مل نہیں پاتا جانشیں کوئی
صورتوں میں ذرا بھی فرق نہیں ۔۔۔ باحقیقت مگر نہیں کوئی
سرمگیں آنکھیں دیکھنے کو بہت ۔۔۔ پر نہیں انمیں دور بیں کوئی
اہل دنیا کی دورخی کا یہ طور ۔۔۔ جس سے خالی نہیں رہا کوئی
شر سے خائف نہ ہو کوئی خائف ۔۔۔ جو بھلائی کا ہو معین کوئی
شر ہی سے نکلتی ہے ہر خیر ۔۔۔ شر کا خوگر اگر نہیں کوئی

(اہل دنیا اور اہل دین۔ ص:۱۔۲)

☆☆☆

مالش سر اور میاں سفیان:-

یہ قلمی مسودہ ہے اس کا فوٹو مفتی سعید الظفر کے پاس، اس میں کل ۶۲ اشعار ہیں، اس کے اشعار کا مضمون اس کے نام سے ہی واضح ہے، اس پر ۱۳۹۴ھ کی تاریخ درج ہے۔

یہ طویل نظم دراصل ایک واقعہ کی تک بندی ہے۔ ایک مرتبہ رات کے وقت حضرت قاری صاحب نے اپنے چہیتے پوتے سفیان صاحب سے کہا کہ میاں سفیان! ذرا سر میں تیل لگا دو۔ سفیان صاحب سے سر میں ذرا زیادہ تیل پڑ گیا جس کی وجہ سے سر پیشانی سے بہنے لگا' سب گھر والے ایک دم دوڑے ہوئے آئے' کسی نے تولیہ لیا اور کوئی پانی تھامے ہوئے اور کوئی میاں سفیان کو برا بھلا کہہ رہا تھا' بہر حال صبح ہونے پر سفر پر تشریف لے گئے جب واپس آئے تو یہ طویل نظم کہی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خوشا وہ وقت کہ میرٹھ کا تھا سفر درپیش — اسی مہم میں تھے مصروف سب یگانہ و خویش
سفر کے سارے حوائج تھے منتشر گھر میں — اسی کا نظم بنانے میں سب تھے گرد و پیش میں
یکا یک حضرت سفیان کو خدمتوں کی لگی — کہ جس سے راحت و آرام پائے یہ درویش
کھڑے ہوئے کہ کریں سر پہ تیل کی مالش — کہ نیند آئے سہانی جو ہے دماغ کا عیش
یہ جانتے ہوئے کم رہ گیا ہے ریل میں وقت — خموش ہو گئے ہم بھی کہ نہ ہوں دلریش
جھکا دیا سرِ تسلیم سامنے ان کے — کہ سر پہ جو بھی کریں مشق حسب خاطر خویش
کھٹک ضرور تھی لیکن یہی مقدر تھا — کہ بات اونچی ہو ان کی اور آئے از بس پیش
امنڈ کے سر سے جو سیلاب تیل کا آیا — نہا گئے سر گردن۔ بہ سینہ تا دل ریش
لباس تیل کی تھا نہر' تن تھا تیل کا حوض — اور اس میں تیر رہا تھا یہ جثۂ دوں کیش
نہ ایک سر ہی رہا تیل کے تموج میں — شریک اس میں تھی آنکھیں بھی ماغم درپیش

(مالش سر اور میاں سفیان۔ ص:۱)

اہل دنیا اور اہل دین:۔

اس میں کل ۵۳/اشعار ہیں یہ مسوّدہ ہے اور اس کا فوٹو مفتی سعید الظفر صاحب کے پاس ہے ،چند لوگوں کی طرف سے قاری صاحب کو تکلیف پہونچی تو یہ اشعار کہے، اس پر ۱۳۹۶ھ کہے تاریخ درج ہے۔

چند اشعار پیش خدمت ہیں:

اٹھتے جاتے ہیں اہل فضل و کمال   مل نہیں پاتا جانشیں کوئی
صورتوں میں ذرا بھی فرق نہیں   باحقیقت مگر نہیں کوئی
سرگیں آنکھیں دیکھنے کو بہت   پر نہیں انمیں دور بیں کوئی
اہل دنیا کی دورخی کا یہ طور   جس سے خالی نہیں رہا کوئی
شر سے خائف نہ ہو کوئی خائف   جو بھلائی کا ہو معین کوئی
شر ہی سے نکلتی ہے ہر خیر   شر کا خوگر اگر نہیں کوئی

(اہل دنیا اور اہل دین۔ص:۱۔۲)

☆☆☆

کتابیات

کتابیات

مطبوعہ	تصنیف	مصنف	نمبر
دارالعلوم دیوبند۱۹۸۲ء	تاریخ دارالعلوم دیوبند	محبوب رضوی	۱
دارالعلوم دیوبند۱۹۹۸ء	مولانا محمد قاسم حیات اور کارنامے	اسیر ادروی	۲
دارالعلوم دیوبند۱۹۵۲ء	سوانح قاسمی	مناظر احسن گیلانی	۳
مفتی الٰہی بخش اکیڈیمی کاندھلہ ۲۰۰۹ء	استاذ الکل مولانا مملوک العلی	نورالحسن راشد کاندھلوی	۴
دہلی ۱۹۲۵ء	نسب نامہ صدیقیان نانوتہ	نورالحسن راشد کاندھلوی	۵
مکتبہ دارالعلوم دیوبند ۱۹۰۵ء	حالات قاسم	مولانا یعقوب نانوتوی	۶
دارالکتاب لاہور	سفرنامہ ہند	پروفیسر محمد اسلم	۷
مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۷۵ء	انوار قاسمی	انوارالحسن شیرکوٹی	۸
مکتبہ نعیمیہ دیوبند ۱۹۹۰ء	ارواح ثلثہ	امیر اللہ خان صاحب	۹
علی گڑھ ۱۹۴۵ء	آثار الصنادیر	سر سید احمد	۱۰
علی گڑھ ۱۹۳۷ء	طبقات الشعراء ہند	کریم الدین پانی پتی	۱۱
مصر ۱۹۱۵ء	نزہۃ الخواطر	مولانا عبدالحیٔ لکھنوی	۱۲
علی گڑھ	تذکرہ فرائد الدھر	کریم الدین پانی پتی	۱۳
دریاباد بستی ۲۰۰۳ء	ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں دہلی کالج کا کردار	شمس الہدیٰ دریابادی	۱۴
علی گڑھ	قدیم دلی کالج	مولوی کریم الدین پانی پتی	۱۵
تھانہ بھون	بیاض یعقوبی	حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی	۱۶
مفتی الٰہی بخش اکیڈیمی ۲۰۰۳ء	تذکرہ مظہر نانوتوی	نورالحسن راشد کاندھلوی	۱۷

۱۸	شیخ الحدیث زکریا کاندھلوی	اوجز المسالک	سہارنپور
۱۹	مولانا خلیل سہارنپوری	بذل المجھود	سہارنپور
۲۰	اصغر عباس	سرسید کی تعزیتی تحریریں	علی گڑھ
۲۱	ایوب قادری	مولانا محمد احسن نانوتوی	لاہور
۲۲	مولانا عاشق الٰہی میرٹھی	تذکرۃ الرشید	ادارہ الکتاب دیوبند
۲۳	مولانا سید محمد میاں صاحب	علماء ہند کا شاندار ماضی	دہلی
۲۴	ڈاکٹر ثریا ڈار	شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات	مکتبہ العزیز دیوبند
۲۵	مولانا منصور علی خاں	مذہب منصور	حیدر آباد
۲۶	مولانا اشرف علی نانوتوی	حسن العزیز	تھانہ بھون
۲۷	سید سلیمان ندوی	حیات شبلی	دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۸	مولانا محمد قاسم نانوتوی	رسالہ تصفیۃ العقائد	مکتبہ قاسمی دیوبند
۲۹	شیخ اکرام علی	موج کوثر	دار الکتاب دیوبند
۳۰	اکبر شاہ بخاری	ذکر طیب	دار الکتاب دیوبند
۳۱	انظر شاہ کشمیری	لالۂ و گل	سنابل دیوبند
۳۲	ذاکر بیگ نانوتوی	جغرافیہ سہارنپور	سہارنپور
۳۳	مولانا محمد قاسم نانوتوی	فیوض قاسمیہ	مکتبہ قاسمی دیوبند
۳۴	اسعد صدیقی	مظلوم شخصیت	ادارہ انور القرآن دیوبند ۲۰۰۷ء
۳۵	فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	حکیم الاسلام قاری محمد طیب	مکتبہ العزیز دیوبند ۲۰۰۳ء
۳۶	ادارہ	روداد دار العلوم دیوبند	دار العلوم دیوبند
۳۷	قاری محمد طیب صاحب	حدیث رسول کا قرآنی معیار	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۰ء
۳۸	قاری محمد طیب صاحب	آزادی ہند کا خاموش رہنما	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۵ء
۳۹	قاری محمد طیب صاحب	شہید کربلا اور یزید	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۵ء

۴۰	قاری محمد طیب صاحب	نظریہ دو قرآن پر ایک نظر	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۵ء
۴۱	قاری محمد طیب صاحب	دینی دعوت کے قرآنی اصول	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۵ء
۴۲	قاری محمد طیب صاحب	جنونِ شباب	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۵ء
۴۳	قاری محمد طیب صاحب	عرفان عارف	مکتبہ قاسمی دیوبند ۱۹۶۵ء
۴۴	قاری محمد طیب صاحب	جذبات الم	دارالعلوم دیوبند
۴۵	قاری محمد طیب صاحب	ارمغان اجلاس صد سالہ	دارالعلوم دیوبند
۴۶	حقانی القاسمی	دارالعلوم دیوبند کا ادبی شناخت نامہ	آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی۔ ۲۰۰۶
۴۷	نورالحسن راشد کاندھلوی	قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی	مکتبہ نور ۲۰۰۰ء
۴۸	کفیل الرحمٰن نشاط	شناسا	مکتبہ فیصل دیوبند ۲۰۰۴ء
۴۹	احمد بن الحسین ابوبکر البیہقی	السنن الکبری	مکتبہ شاملہ
۵۰	ابن منظور	اللسان العرب	مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۸ء
۵۱	امام مرتضیٰ نقوی	خواجہ حسن نظامی حیات اور ادبی خدمات	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء
۵۲	نثار احمد فاروقی	دید و دریافت	آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۶۴ء
۵۳	مولانا نور عالم خلیل امینی	پس مرگ زندہ	ادارہ علم و ادب دیوبند ۲۰۱۰ء
۵۴	قاری محمد طیب صاحب	دعا نامہ تہنیت شامہ	مکتبہ قاسمی دیوبند
۵۵	قاری محمد طیب صاحب	سیر کشمیر	مخطوطہ
۵۶	قاری محمد طیب صاحب	نسبتِ قاسمی	مخطوطہ
۵۷	قاری محمد طیب صاحب	نوید مسرت	مخطوطہ
۵۸	قاری محمد طیب صاحب	ابن سعید	مخطوطہ
۵۹	قاری محمد طیب صاحب	قالولا	مخطوطہ

۶۰	قاری محمد طیب صاحب	مالش سر اور میاں سفیان	مخطوطہ
۶۱	قاری محمد طیب صاحب	اہل دنیا اور اہل دین	مخطوطہ

............رسائل وجرائد............

نمبر	مصنف	تصنیف	مطبوعہ
۱	نور الحسن راشد کاندھلوی	سہ ماہی احوال وآثار جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء	مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
۲	اعجاز عرفی	سہ ماہی تدبیر نومبر تا اپریل ۲۰۰۷ء	تنظیم العلماء دہلی
۳	ازہر شاہ قیصر	ماہنامہ دار العلوم دیوبند	دار العلوم دیوبند
۴	یوسف بنوری	ماہنامہ بیانات	بنوری ٹاؤن کراچی
۵	....	سہ ماہ دیوان پٹنہ	پٹنہ
۶	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی	رسالہ النور ۱۳۴۰ھ	تھانہ بھون

تحقیقی مقالات

۱	ڈاکٹر محمد امین اللہ	امجد حیدر آبادی اور ویمنا کا تقابلی مطالعہ	ایس وی یونیورسٹی
۲	ڈاکٹر پی محی الدین باشاہ	مولانا وحید الدین خاں۔ شخصیت اور افکار	ایس وی یونیورسٹی

☆☆☆